آئین پاکستان

انحرافات اور بحالی کی جدوجہد

پروفیسر خورشید احمد

آئی پی ایس پریس، اسلام آباد

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز تحقیق کے لیے آزادانہ اظہار خیال کی حوصلہ افزائی کرتا ہے
ادارہ کی مطبوعات میں پیش کیے گئے تمام خیالات سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

© IPS Press 2021

آئین پاکستان: انحرافات اور بحالی کی جدوجہد

پروفیسر خورشید احمد

انتخاب، ترتیب و تدوین: خالد رحمٰن

معاونت: عارف جمشید، محمود فاروقی، سلمان طاہر

ISBN: 978-969-448-815-8

جملہ حقوق محفوظ ہیں: آئی پی ایس پریس، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد کی تحریری اجازت کے بغیر اس کتاب کے کسی حصے کی نقل یا ترجمہ کی اشاعت، کسی بھی شکل میں اسٹور یج جہاں سے اسے دوبارہ حاصل کیا جاسکتا ہو یا کسی بھی شکل میں ترسیل نہیں کی جاسکتی۔

۳۴۲٫۵۴۹۱۰۲۹ آئین پاکستان: انحرافات اور بحالی کی جدوجہد
خ ور خورشید احمد، پروفیسر
اسلام آباد: آئی پی ایس پریس، ۲۰۲۱ء
۲۱۴ صفحات مع اشاریہ
۱۔ پاکستان-دستوری تاریخ ۲۔ پاکستان-آئینی ترامیم ۳۔ پاکستان-سیاست و حکومت

آئی پی ایس پریس

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، نصر چیمبرز، پلاٹ-1، ایم پی سی ایچ ایس، کمرشل سینٹر، E-11/3، اسلام آباد
فون: ۰۵۱-۸۴۳۸۳۹۱ فیکس: ۰۵۱-۸۴۳۸۳۹۰
ای میل: publications@ips.net.pk
ویب سائٹ: www.ipsurdu.com, www.ips.org.pk
فیس بک: IPSPressInternational

سرورق: آصف تیموری
الفاظ و صفحہ سازی: طاہر احمد عباسی، محمد عالم
طباعت: فضلی سنز، کراچی

فہرست

- پیش لفظ V
- تعارف VII

۱) پارلیمانی نظام میں ادارتی توازن اور ہم آہنگی ۱
۵۸(۲)(بی) کے تحت صدارتی حکم ۱۹۹۳ء کے تناظر میں بحث)

۲) صدر مملکت کا پارلیمنٹ سے خطاب: آئینی وسیاسی پہلو ۲۷

۳) مارشل لاء اقدامات کے لیے آئینی جواز ۴۳
(لیگل فریم ورک آرڈر ۲۰۰۲ پر بحث کے تناظر میں)

۴) ۱۷ویں آئینی ترمیم: مارشل لاء کی مکروہ حالت سے نکلنے کا راستہ ۴۹

۵) قومی سلامتی کونسل: ضرورت، ساخت اور آئینی حیثیت ۷۳
(۱۷ویں آئینی ترمیم اور قومی سلامتی کونسل ۲۰۰۴ء کے بل کے تناظر میں بحث)

۶) فوجی سربراہ اور منصب صدارت ۹۹
(جنرل پرویز مشرف کی دوہری حیثیت پر بحث کے تناظر میں)

۷) ایمرجنسی لگانے کی دستوری دفعہ کا استعمال ۱۳۵
(۳نومبر ۲۰۰۷ء کے مشرف اقدامات کے تناظر میں)

۸) دستور میں ۱۸ویں ترمیم: پس منظر و پیش منظر ۱۴۷

۹) ججوں کی تقرری میں پارلیمنٹ کا کردار (۱۹ویں آئینی ترمیم) ۱۶۷

۱۰) آئین توڑنے پر مقدمہ ۱۷۳

۱۱) نگراں حکومت کا قیام اور الیکشن کمیشن کی نامزدگی (۲۰ویں آئینی ترمیم) ۱۷۵

۱۲) اشاریہ ۱۹۱

پیش لفظ

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو بیش بہا انعامات سے نوازا ہے۔ ایک جانب دیگر ہزاروں مخلوقات کی طرح اس کی جسمانی اور طبعی ضروریات کو پورا کرنے کا انتظام فرمایا، تو دوسری جانب اس کا رتبہ ان تمام مخلوقات سے بلند کرکے اس کی اخلاقی، تہذیبی، تمدنی اور روحانی نشوونما کو بھی اپنے ذمہ لے لیا۔ یہی وہ مقصد تھا جس کے لیے اللہ تبارک و تعالیٰ نے سوا لاکھ کے قریب انبیاء علیہم السلام دنیا کے مختلف خطوں اور مختلف اوقات میں مبعوث فرمائے، یہ سلسلہ حضرتِ آدم علیہ السلام سے شروع ہوکر حضرت محمد ﷺ پر تکمیل پذیر ہوا۔ ان انبیاء کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی علمی، اخلاقی اور فلسفیانہ ہدایت کے لیے وحی کا ایک سلسلہ شروع کیا جو قرآنِ کریم پر منتج ہوا۔ آخری پیغمبر ﷺ کی آمد کے ساتھ جہاں کارِ نبوت تکمیل کو پہنچا، وہیں قرآنِ کریم کی تکمیل کے ذریعے الہامی ہدایت کا سلسلہ مکمل ہوا۔ یوں قرآن وسنت کی صورت میں ایک ایسا نقشۂ زندگی انسانیت کو میسر آگیا جو زندگی کے ہر گوشے اور ہر دائرے میں رہنمائی فراہم کرتا ہے۔

انسانیت کے ارتقا اور علم و عمل کے نئے ذرائع کی دریافت نے انسان کو کسی حد تک آزادیٔ فکر سے نوازا تو وہ اس خام خیالی کا شکار ہوگیا کہ وہ اب الہامی ہدایت سے بے نیاز ہوگیا ہے۔ اس کا نتیجہ ظلم، عدم مساوات اور طاغوتی طاقتوں کے غلبے کی صورت میں نکلا۔ اسی خام خیالی نے دنیا کو اس استعماری نظام کے شکنجے میں لاڈالا جس کی ہر صورت افراد اور اقوام کے استحصال پر منتج ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے فی زمانہ انسانی زندگی کے تمام دائرے اور تمام شعبے اس سے براہِ راست متاثر ہیں۔ اس پر مستزاد وہ ذہنی پسماندگی اور مغلوبیت کی کیفیت ہے جس کی وجہ سے کسی متبادل کی تلاش میں انسانوں کی اکثریت سرگرداں ہونے کے باوجود محروم ہے۔

میں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ تعلیم و تحقیق، تصنیف و تالیف، اور سیاسی تحرّک میں گزارا ہے۔ اس پورے عرصے میں میری کوشش یہی رہی کہ حتمی الہامی ہدایت یعنی قرآن وسنت کی

جامع تعلیمات کی روشنی میں قومی اور بین الاقوامی مسائل کا حل تلاش کیا جائے۔ چنانچہ علمی و عملی جدوجہد کے دوران یہ مقصد میرا مرکزِ نگاہ تھا کہ اپنی صلاحیت اور دائرہ اختیار کے مطابق وطنِ عزیز پاکستان کو بالخصوص اور عالمِ انسانیت کو بالعموم استعماری گرفت سے آزاد کروا کر فلاح و ہدایت کے اس راستے پر گامزن کرنے کی جدوجہد میں اپنا حصہ شامل کیا جا سکے جو الہامی ہدایت کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے۔

اس ضمن میں نظریاتی و عملی پہلوؤں پر میں نے اللہ تبارک و تعالیٰ کی توفیق سے سینکڑوں مضامین تحریر کیے ہیں اور بے شمار مواقع پر گفتگو کی صورت میں اپنے خیالات کا ابلاغ کیا ہے۔ اس میں سے بہت کچھ گزشتہ دہائیوں میں مربوط صورت میں شائع بھی ہوا ہے لیکن ایک بہت بڑا لوازمہ ابھی ایسا موجود ہے جسے ترتیب دینے کی ضرورت باقی ہے۔ یہ فرض انجام دینے کی خواہش میں کئی برس سے اپنے اندر پاتا ہوں لیکن صحت کی صورت حال کے باعث یہ ممکن نہ ہو سکا کہ اپنے ماضی کے کام کا جائزہ لے کر اسے اشاعت کے لیے مرتب کر سکتا۔

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کے ساتھیوں نے برادرم خالد رحمٰن کی سربراہی میں اس ادھورے کام کی تکمیل کی ذمہ داری اپنے سر لی ہے۔ پہلے مرحلے میں پاکستان کی نظریاتی اساس، ملک میں آئینی جدوجہد، طرز حکمرانی کے سوال، دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پاک امریکہ تعاون، اسلام اور مغرب کے باہمی تعلق اور جاری کشمکش، اور معاشی صورت حال اور امکانات جیسے موضوعات پر سات کتب مرتب ہو چکی ہیں۔ کچھ دنوں میں تین اور کتب بھی مکمل ہونے کو ہیں، ان شاء اللہ۔ ان کتب کا حصہ بننے والے بیشتر مضامین میری سینیٹ کی تقاریر پر مبنی ہیں جبکہ دیگر مضامین مختلف مواقع پر لکھے گئے جن کو اب یکجا کر دیا گیا ہے۔

میں اللہ تبارک و تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے ساتھیوں کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے انتہائی محنت، عرق ریزی اور قابلیت کے ساتھ یہ لوازمہ ترتیب دیا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ہماری سعی کو قبول فرمائے اور ہماری کاوشوں کو اپنے لیے خالص کر لے۔

پروفیسر خورشید احمد

لیسٹر، برطانیہ

۲۸ مئی ۲۰۲۱ء

تعارف

پاکستان میں سیاسی عدم استحکام کی بڑی وجہ آئین کی حکمرانی سے انحراف ہے۔ ملکی سیاسی تاریخ پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ انحراف بلا استثناء ہر دور میں ہوتا رہا ہے۔ انحراف کی انتہائی صورت فوجی حکمرانی کے ادوار میں سامنے آتی رہی ہے جب آئین کو کلی طور پر منسوخ یا معطل کر دیا گیا۔

دوسری جانب پاکستانی سیاست کا مثبت پہلو یہ ہے کہ آئین سے انحراف کے عمل کو اجتماعی طور پر کبھی بھی پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا۔ چنانچہ انحراف کو ختم کرنے اور معطل شدہ آئین کو بحال کر کے اسے اس کی حقیقی روح کے ساتھ نافذ کرنے کے لیے جدوجہد بھی پاکستان کے سیاسی سفر کا مستقل اور روشن باب رہا ہے۔ اس جدوجہد کا ہی نتیجہ ہے کہ ۱۹۷۳ء میں متفقہ طور پر منظور کیے جانے والا آئین مارشل لاء اور فوجی حکمرانی کے دو طویل ادوار کے باوجود آج بھی موجود اور نافذ ہے۔

آئین میں ترمیم ایک معمول کا عمل ہے چنانچہ پاکستان کے آئین میں بھی ترامیم اور تبدیلیاں آتی رہی ہیں اور حسب ضرورت یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔ آئین میں ہر ترمیم اپنی جگہ اہم ہے لیکن دستور پاکستان میں کی جانے والی بعض ترامیم اس اعتبار سے بہت اہم ہیں کہ یہ ان کی بناء پر فوجی حکمرانی کے ادوار کو ختم کرنے، اس دوران پیدا ہو جانے والے آئینی و قانونی خلاء کو پر کرنے اور جمہوری عمل کو از سر نو جاری کرنے میں مددگار ثابت ہوئی ہیں۔

زیر نظر کتاب میں اس حوالہ سے کئی مضامین شامل ہیں جو بالخصوص ۱۷ویں آئینی ترمیم کی تیاری، منظوری اور اس پر عملدرآمد کے دوران ہونے والی سیاسی و پارلیمانی جدوجہد کی کہانی بیان کرتے ہیں۔ ۱۷ ویں ترمیم ہی نے وہ حالات پیدا کیے جس نے

۱۸ویں ترمیم اور بعد ازاں ۱۹ویں اور ۲۰ویں ترامیم کے لیے راہ ہموار کی۔ ان تمام ترامیم کے موقع پر سینیٹ آف پاکستان کے ممبر کی حیثیت سے پروفیسر خورشید احمد نے جو بہت بھرپور کردار ادا کیا ہے وہ پاکستانی سیاست سے واقف کسی بھی فرد سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس تناظر میں ان ترامیم کے پسِ منظر و پیش منظر کے بارے میں ان کی تقاریر اس کتاب میں شامل ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی جانب سے سینیٹ تقاریر میں اٹھائے گئے نکات محض تاریخی ریکارڈ کی ہی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ آنے والے دنوں میں پاکستان میں سیاست سے دلچسپی رکھنے والے تمام متعلقہ افراد کے لیے رہنمائی کی حیثیت کے بھی حامل ہیں۔

۱۷ویں ترمیم سے متعلق ایک اہم عنوان قومی سلامتی کونسل کی ساخت اور آئینی حیثیت کا تھا۔ کتاب میں شامل ایک تفصیلی مضمون اس نہایت اہم موضوع کا احاطہ کرتا ہے۔

ذرا پیچھے جایا جائے تو قومی اسمبلی کی بار بار تحلیل ۱۹۹۰ء کے عشرہ میں پاکستانی سیاست کا ایک اہم عنوان رہی ہے۔ کتاب کا پہلا مضمون ''پارلیمانی نظام میں ادارتی توازن اور ہم آہنگی کی ضرورت'' ایسے ہی ایک موقع سے متعلق ہے جس میں مستقل اہمیت کے بہت اہم مضامین بیان ہوئے ہیں۔ ادارتی توازن اور ہم آہنگی درحقیقت اس کتاب کے تمام ہی مضامین میں ایک مسلسل عنوان کی حیثیت رکھتا ہے۔ خواہ اس توازن اور ہم آہنگی کا تعلق سول ملٹری تعلقات سے ہو اور یا پارلیمنٹ اور عدلیہ اور دیگر اداروں سے ہو۔

یہ بات سامنے رہنی چاہیے کہ یہ تمام مضامین ان تقاریر پر مشتمل ہیں جو پروفیسر خورشید احمد نے سینیٹ میں اس موقع پر کی ہیں جب یہ وہاں زیر بحث آئے۔ یوں ہر مضمون میں سیاق وسباق کی ایک خاص جھلک موجود ہے۔ تاہم پروفیسر خورشید کی ان تقاریر کی جامعیت اور ان کا حسن ہے کہ سیاق و سباق کسی قدر پرانا ہونے کے باوجود مضامین کی معنویت اور مباحث پوری طرح تازہ اور آج کے حالات میں بھی رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔

اس بات کو بھی دہرا لینے کی ضرورت ہے کہ ان تقاریر کو ترتیب دیتے وقت ایڈیٹنگ

ضرور کی گئی ہے لیکن عمومی طور پر انداز خطابت کو بر قرار رکھا گیا ہے۔ اسی طرح مختلف مواقع پر کی گئی ان گفتگوؤں میں سے تکرار کو عمومی طور پر حذف کیا گیا ہے لیکن جہاں موقع کی مناسبت سے ضروری محسوس ہوا ہے تکرار کو نظر انداز بھی کیا گیا ہے۔

خالد رحمٰن
چیئرمین
انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد

پارلیمانی نظام میں ادارتی توازن اور ہم آہنگی

[۵۸(۲)(بی) کے تحت صدارتی حکم ۱۹۹۳ء کے تناظر میں بحث]

۱۸ اپریل ۱۹۹۳ء کو صدر غلام اسحٰق خان نے مختلف الزامات کے تحت دستور کی دفعہ ۵۸(۲)(بی) کے اختیارات استعمال کرتے ہوئے اس وقت کے وزیر اعظم محمد نواز شریف کی منتخب حکومت کو معزول اور قومی اسمبلی کو تحلیل کر دیا۔ بعد ازاں صدارتی اقدام کو سپریم کورٹ میں چیلنج کیا گیا۔ سپریم کورٹ آف پاکستان نے ایک رٹ پٹیشن کی سماعت کرتے ہوئے ۲۶ مئی ۱۹۹۳ء کو اسمبلی کو بحال کر دیا۔ اس دوران اسمبلی کی تحلیل کے صدارتی اقدام کے خلاف سینیٹ آف پاکستان میں پروفیسر خورشید احمد، خواجہ محمد آصف، راجہ محمد افضل خان، عبد الرحیم مندوخیل اور ملک محمد حیات نے تحریک استحقاق پیش کی۔

اس موقع پر وفاقی وزیر سیّد عبد اللہ شاہ نے تحریک کی مخالفت کرتے ہوئے حوالہ دیا کہ ماضی میں اسمبلی کی تحلیل کے ایسے ہی اقدام کو سینیٹ میں زیر بحث لانے کی ایک تحریک پر چیئرمین سینیٹ نے رولنگ دی ہے کہ اس اقدام کو زیر بحث نہیں لایا جاسکتا۔ اسکے علاوہ یہ اقدام اعلیٰ عدالتوں میں بھی زیر سماعت ہے، اس لیے بھی اس پر بات نہیں ہو سکتی۔ بعد ازاں پروفیسر خورشید احمد کو تحریک استحقاق کے محرک کی حیثیت سے اپنے دلائل دینے اور خیالات پیش کرنے کا موقع دیا گیا۔

دستور پاکستان میں اسمبلیوں کی تحلیل کے لیے ۸ویں ترمیم کے ذریعہ دیا جانے والا صدارتی اختیار اگرچہ اب ختم ہو چکا ہے تاہم زیر نظر تقریر اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس میں پارلیمانی نظام میں ادارتی توازن اور ہم آہنگی کے حوالہ سے مستقل نوعیت کے مضامین زیر بحث آئے ہیں۔ تقریر سے قبل تحریک استحقاق کے انگریزی متن کا اردو ترجمہ پیش کیا جارہا ہے۔

(ترجمہ):"جناب چیئرمین! میں درج ذیل تحریک استحقاق پیش کرنے کے لیے ایوان کی اجازت چاہتا ہوں۔

۱۸ اپریل ۱۹۹۳ء کو قومی اسمبلی کی تحلیل نے ملک میں جمہوری عمل کے ارتقاء کو خطرے سے دوچار کر دیا ہے۔ دستور میں درج عدم اعتماد کے ووٹ کے طریقے سے یا آرٹیکل ۹۱ کے تحت قائد ایوان کو اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے کا پابند کیا جاسکتا تھا۔ جس کے ذریعے دستور کے دائرے میں رہتے ہوئے اس بات کو معلوم کرنے کا امکان موجود تھا کہ آیا حکومت ایوان کا اعتماد کھو چکی ہے یا نہیں۔ دستوری راستہ اختیار کرنے کے بجائے قومی اسمبلی کی تحلیل نے پارلیمنٹ کے مستقبل اور ملک میں جمہوریت کے مستقبل کو خطرے سے دوچار کر دیا ہے اس اقدام نے بالواسطہ طور پر سینیٹ کو بھی متاثر کیا ہے کیونکہ قومی اسمبلی کی موجودگی کے بغیر قانون سازی ممکن نہیں۔ یوں قومی اسمبلی کی تحلیل نے سینیٹ کے استحقاق کو مجروح کیا ہے اور پارلیمنٹ (مجلس شوریٰ) کے ادارے کو پاکستان اور پوری دنیا میں بدنام کیا ہے۔

سینیٹ کے استحقاق کی اس خلاف ورزی پر میری تحریک کو زیر بحث لایا جائے اور اگر ضروری ہو تو تحریک کو استحقاق کمیٹی میں بھیج دیا جائے تاکہ وہ اس پر مناسب کارروائی کر سکے"۔

جناب چیئرمین! میں آپ کا بہت ممنون ہوں کہ اس اہم مسئلہ پر آپ نے مجھے اپنے خیالات کے اظہار کا موقع دیا۔ مجھے اس بات کا پورا احساس ہے کہ ہم اس وقت ایک بہت ہی نازک قومی لمحے میں اس موضوع پر گفتگو کر رہے ہیں۔ سینیٹ جو اس وقت فیڈریشن کا واحد جمہوری پارلیمانی ادارہ موجود ہے، یہ اس کی اخلاقی، سیاسی اور دستوری ذمہ داری ہے کہ اس وقت ملک کی رہنمائی بھی کرے اور اس مسئلے کے اوپر جو صحیح پوزیشن ہے اسے قوم کے سامنے لائے۔ اسی بنا پر میں نے یہ تحریک استحقاق پیش کی ہے۔

تحریک استحقاق پر بحث کیوں ضروری ہے؟

جناب والا! سب سے پہلے تو میں یہ عرض کروں گا کہ استحقاق کا قانون چونکہ مرتب اور مدون نہیں ہے اس لیے ہمیں استحقاق کے معاملے کو لامحالہ روایات ہی کی روشنی میں دیکھنا پڑتا ہے۔ میں آپ کی توجہ اس طرف مبذول کراؤں گا کہ جہاں ارکان پارلیمنٹ کے انفرادی حقوق اور ان کی پامالی استحقاق کی ذیل میں آتے ہیں، وہیں وہ تمام چیزیں بھی استحقاق کا حصہ ہیں جو پارلیمنٹ کی عزت و ناموس کو متاثر کرتی ہوں، اس کی کارکردگی پر حرف گیری کرتی ہوں، کسی بھی طرح اس کے کام میں رکاوٹ ڈالتی ہوں اور یوں پارلیمنٹ کی ایک قانون ساز ادارے اور جمہوریت کے گہوارے کی حیثیت کو متاثر کرتی ہوں۔

Erskine May کی کتاب Parliamentary Practice ایڈیشن ۱۹۸۹ء صفحہ نمبر ۱۲۱، ۱۲۵، ۱۵۱ میں واضح طور پر یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ:

> (ترجمہ): ''عمومی بات یہ ہے کہ کوئی بھی اقدام یا بھول چوک جو پارلیمنٹ کے کسی بھی ایوان کے فرائض کی ادائیگی کی راہ میں رکاوٹ ڈالے یا کسی رکن پارلیمنٹ یا افسر کے کاموں میں براہ راست یا بالواسطہ روڑے اٹکائے ایسے اقدامات کو پارلیمنٹ کی توہین سمجھا جائے گا چاہے قبل ازیں ایسے اقدامات کی مثال موجود نہ ہو''۔

اسی طرح Shiri M.N. Kaul اور Shiri S.L. Shakdher کی کتاب Practice and Procedure of Parliament میٹروپولیٹن ایڈیشن ۱۹۸۶ء صفحہ نمبر ۲۰۹ پر وہی چیز موجود ہے جو May نے کہی ہے۔ حال ہی میں ایک بڑی اہم کتاب آئی ہے Constitutional Law of India۔ ہندوستانی سپریم کورٹ کے سابقہ چیف جسٹس ہدایت اللہ نے اسے ایڈٹ کیا ہے۔ اس میں بھی اس مسئلے کو ایوان کی توہین کے طور پر لیا گیا ہے۔ (حوالہ صفحہ نمبر ۸۳۷)۔ مرکزی نکتہ ان تمام کا یہ ہے کہ جو چیز قانون ساز ادارے یا جمہوریت کے اعلیٰ ترین ادارے کی حیثیت سے پارلیمنٹ کے لیے بدنامی لائے، اور اس کی

عزت اور وقار گرائے یہ ادارہ کی توہین ہے۔ دوسری بات یہ کہ ہر وہ چیز ایوان کی توہین ہے جس سے کہ پارلیمانی ادارے اپنے فرائض منصبی ادا نہ کر سکیں۔ میری نگاہ میں جو اقدام کیا گیا ہے یہ اقدام ملک میں اور بیرون ملک، جسے میں ثابت کروں گا، جمہوریت، دستوری اداروں اور خصوصاً پارلیمنٹ کو بدنام کر رہا ہے اس پر شدید ترین حرف گیری کی گئی ہے اس کی عزت اور وقار کو مجروح کیا گیا ہے اور پارلیمنٹ کا ادارہ بحیثیت ادارے کے اندرون ملک، اور ملک کے باہر لوگوں کی نگاہ میں گرایا گیا ہے یہ ایوان کی توہین ہے۔

دوسری بات یہ کہ اس ملک میں دستور کے تحت قانون سازی اس وقت ممکن ہے جب قانون بیک وقت دونوں ایوانوں سے منظور کرایا جائے اور اگر دونوں ایوان منظور نہ کر سکیں تو پھر مشترکہ اجلاس ہو۔ یہ ہے قانونی پوزیشن۔ اگر کسی وقت صرف ایک ایوان موجود ہے دوسرا موجود نہیں ہے تو یہ صرف قومی اسمبلی کا نہ ہونا ہی نہیں ہے بلکہ قانون سازی کے سارے کام کے لیے سینیٹ بھی غیر مؤثر ہو جاتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس سے پہلے سینیٹ جو قوانین پاس کر کے قومی اسمبلی کو بھیج چکا ہے، اگر وہ ابھی تک قومی اسمبلی میں زیر غور نہیں آئے ہیں اور قومی اسمبلی تحلیل کر دی گئی ہے اور غیر قانونی طور پر تحلیل کر دی گئی ہے تو وہ کام جسے ہونا چاہیے تھا وہ رک جاتا ہے۔ تو اس بنا پر گویا کہ یہ قانون سازی میں رکاوٹ ہے۔ ان دونوں بنیادوں پر میں سمجھتا ہوں کہ اس تحریک استحقاق کا جواز موجود ہے۔

اس کے بعد آپ یہ سوال اٹھا سکتے ہیں کہ اس سے پہلے ایک مرتبہ جب مئی ۱۹۸۸ء میں اسمبلی توڑی گئی تھی اور اس وقت تحریک استحقاق ہی کی بنیاد پر اس پر بحث ہوئی تھی۔ میں خود ان میں سے تھا جنھوں نے تحریک استحقاق پیش کی تھی۔ اور اگر مجھے صحیح یاد ہے تو طارق چوہدری اور جاوید جبار بھی اس میں شریک تھے۔ اس ایوان نے مفصل بحث کی تھی۔ وہ پہلا واقعہ تھا کہ جب اسمبلی ٹوٹی تھی۔ ہم نے اس وقت بھی اسے چیلنج کیا تھا۔ اگرچہ اس وقت صورت حال قدرے مختلف تھی کیونکہ ابھی ملک مارشل لاء سے جمہوریت کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ۱۹۸۵ء میں

غیر جماعتی بنیادوں پر انتخابات ہوئے تھے۔ پھر وہی غیر جماعتی بنیادوں پر بننے والی اسمبلی تھی جو اس وقت (۱۹۸۸ء) میں توڑی گئی تھی۔ ان مخصوص حالات کے اندر چیئرمین نے ایک خاص رولنگ دی[1]۔ لیکن اس کے بعد ۱۹۹۰ء میں (جب بے نظیر بھٹو وزیر اعظم تھیں) اسمبلی توڑی گئی تو پھر تحریک استحقاق پر بات نہیں ہوئی بلکہ قاعدہ ۱۹۴ کے تحت گفتگو ہوئی تھی۔ اس وقت بھی میں (پروفیسر خورشید احمد) تحریک استحقاق لایا تھا۔

لیکن جناب والا! میں آپ کی توجہ قانون کے ایک اصول کی طرف مبذول کراؤں گا کہ اگر بیرونی حالات بدل گئے ہوں تو ایک اقدام بار بار کیے جانے سے اس کی نوعیت بھی بدل جاتی ہے۔ بلاشبہ ہمارے یہاں جمہوریت کو ایک مستقل خطرہ ہے اور میں ابھی آپ کے سامنے پیش کروں گا کہ اس ملک میں مسئلہ ہی ایک رہا ہے کہ یہاں دستور، قانون ساز اداروں اور پارلیمنٹ کو کام کرنے کا موقع ہی نہیں دیا جاتا۔ ملک کے بننے سے آج تک یہی کہانی ہے جو بار بار دہرائی گئی ہے اس کے باجود حالات تبدیل ہونے کی بناء پر یہ دراصل ایک نیا واقعہ ہے۔ اس بنا پر اس بات کی ضرورت ہے کہ خود تحریک استحقاق کی بنیاد پر از سر نو غور ہو۔ چنانچہ میں اسمبلی کی تحلیل کو محض ۱۹۸۸ء کا ایک ری پلے نہیں سمجھتا بلکہ یہ صفاتی تبدیلیاں ہیں جو ایوان کی تخلیقی ساخت کے اندر، جو ملک کے جمہوری عمل کے آگے بڑھنے میں اور تاریخی پس منظر میں، جو خطرات جمہوری عمل کو ہیں اس کی بنا پر ایک نئی صورتحال کی عکاس ہیں۔ اس لیے یہاں ۱۹۸۸ء والی چیئرمین سینیٹ کی رولنگ لاگو نہیں ہوتی اور ضروری ہے کہ یہ ایوان اس کا جائزہ لے۔

---

[1] ۱۹۸۵ء کے انتخابات کے نتیجے میں غیر جماعتی بنیادوں پر بننے والی قومی اسمبلی کو صدر نے تحلیل کر دیا تھا۔ پروفیسر خورشید احمد کی تحریک استحقاق پر سینیٹ میں صدر کے اس اقدام پر تفصیلی بحث ہوئی۔ اس دوران صدر ضیاء الحق ہوائی حادثے میں شہید ہو گئے، انتخابات کا علان کر دیا گیا۔ ان خاص حالات میں اس وقت کے چیئرمین سینیٹ نے رولنگ دی کہ صدر کے اس اقدام پر بحث نہیں ہو سکتی۔ ۶ اگست ۱۹۹۰ء کو بے نظیر بھٹو کی حکومت کو صدر پاکستان نے ۵۸(۲)(بی) کے تحت برطرف کر دیا جس پر سینیٹ میں اسی رولنگ کی بناء پر تحریک استحقاق پر بحث نہ ہو سکی تھی۔ البتہ اس موقع پر قاعدہ ۱۹۴ کے تحت اراکین سینیٹ نے اس مسئلے پر اظہار خیال کیا۔

زیرِ سماعت مقدمات پر پارلیمنٹ کے اختیارات

دوسری بات جناب والا! یہ کہی جارہی ہے کہ صدر کا اقدام عدالت میں زیر سماعت ہے۔ بلاشبہ ۱۹۸۸ء میں اور اس وقت یہ ایک فرق ہے۔ ۱۹۸۸ء میں جب سینیٹ نے اس مسئلے پہ غور کیا تھا اس وقت تک میرے علم کی حد تک کیس عدالت میں نہیں گیا تھا جب کہ اس وقت ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ دونوں میں یہ مسئلہ زیر غور ہے اور بلاشبہ یہ بڑا نازک مسئلہ ہے۔ لیکن جناب والا! میں یہ چاہتا ہوں کہ قانونی و اخلاقی دونوں اعتبار سے میں اپنا نقطۂ نظر آپ کے سامنے رکھوں اور آپ اس پر غور فرمائیں۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ دنیا بھر میں، کسی بھی جمہوری ملک میں پارلیمنٹ ہی ایک ایسا ادارہ ہوتا ہے جو یہ اختیار رکھتا ہے کہ عدالت میں اگر کوئی مسئلہ زیر غور ہو اور پارلیمنٹ یہ سمجھتی ہے کہ وہ مسئلہ ایسا ہے جس کے اوپر اسے غور کرنا چاہیے تو وہ اس پر غور کر سکتی ہے۔ یوں پارلیمنٹ عدالت کے دائرہ کار سے باہر ہے۔ پارلیمنٹ کو اس بات کا اختیار ہے کہ وہ کسی بھی مسئلہ پر قومی مفاد میں غور کرے اور اس کے بارے میں رائے قائم کرے۔ حتّٰی کہ پارلیمنٹ کو تو اس بات کا بھی اختیار ہے کہ وہ قومی مفاد میں ایسی قانون سازی کرے جس کے نتیجے کے طور پر عدالت کے اختیارات بدل جائیں، کم ہو جائیں یا عدالت اس مسئلے کے اوپر اس نئے قانون سے قبل جو رائے قائم کر سکتی تھی اس سے مختلف رائے قائم ہو۔ یہ اختیار صرف پارلیمنٹ کو حاصل ہے، کسی دوسرے ادارے کو حاصل نہیں ہے۔ اور اس اعتبار سے پارلیمنٹ کا دائرہ کار سپریم ہے، عدالت کا سپریم نہیں ہے۔

دوسری جانب اگر آپ روایات کو دیکھیں تو پچھلے ہی سال اسی ایوان میں کم از کم دو مواقع ایسے آئے ہیں جب بینکنگ قوانین کے بارے میں زیر سماعت مقدمات کی موجودگی میں آرڈیننس کے ذریعے سے قانون میں تبدیلی کی گئی اور اس تبدیلی کے نتیجہ میں عدالت کو اپنی پوزیشن بدلنا پڑی۔ اس بات کے نظائر بھی موجود ہیں کہ جب ایک مسئلہ عدالت میں

زیر غور ہو تو اس وقت بھی پارلیمنٹ اس کے بارے میں نئی قانون سازی کر سکتی ہے۔

تیسری بات ہمارے اپنے رولز آف بزنس سے متعلق ہے۔ یہ بھی اہم رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔ اس ضمن میں رولز آف بزنس میں تحریک استحقاق اور تحریک التوا کے بارے میں موازنہ کرنا مفید ہو گا تحریک التوا کے سلسلے میں رول ۷۵ (ایل) یہ کہتا ہے کہ:

(ترجمہ):"اس کو کسی بھی ایسے معاملے سے متعلق نہیں ہونا چاہیے جو کسی بھی عدالت یا مقتدرہ کے سامنے زیرِ سماعت ہو"۔

لیکن ساتھ ہی اس میں آپ کو یہ شق ملے گی کہ:

(ترجمہ):" جو معاملات، طریقہ کار یا کسی موضوع سے متعلق ہیں یا تفتیش کے مرحلے میں ہیں اور اگر چیئرمین سینیٹ مطمئن ہے کہ ان کو سینیٹ میں زیر بحث لانے سے متعلقہ عدالت یا حکام کے زیر غور معاملات میں دخل اندازی نہیں ہو رہی ہے تو وہ اپنی صوابدید پر اس طرح کے معاملات سینیٹ میں اٹھانے کی اجازت دے سکتا ہے"۔

تو معلوم ہوا تحریک التوا کے سلسلے میں اگرچہ ایک پابندی موجود ہے لیکن اس میں بھی پارلیمنٹ کے لیے استثناء ہے۔ لیکن اگر آپ تحریک استحقاق کے بارے میں قاعدہ دیکھیں تو رول ۶۲ کے اندر ایسی کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں جو چار شرائط دی گئی ہیں وہ یہ ہیں کہ ایک سوال آپ اٹھائیں، مخصوص معاملہ ہو، سینیٹ کی مداخلت کا متقاضی ہو اور یہ صدر مملکت کے کسی ذاتی رویے سے ہر گز متعلق نہ ہو۔

دوسرے الفاظ میں یہ بات واضح ہو گئی کہ ایسے معاملات بھی، جو عدالت میں زیرِ سماعت ہوں تحریک استحقاق کے ذریعے سے، سینیٹ میں زیر غور لائے جا سکتے ہیں اور اصولاً یہ لایا جانا چاہیے۔

صدر اور وزیر اعظم کے درمیان تعلقات کار

جناب والا! اس بارے میں جس رائے کا اظہار میں کر رہا ہوں وہ بڑے دکھ اور درد کے ساتھ اور بہت تکلیف اور دل سوزی کے ساتھ پیش کر رہا ہوں۔ یہ کوئی خوشی کا موقع نہیں ہے، یہ ایک المناک لمحہ ہے اور اس لیے میں نہ کسی ایک پارٹی کی تائید کر رہا ہوں، نہ اس کی تردید کرتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ سابق وزیر اعظم جس طرح ملک کے نظام کو چلا رہے تھے وہ نہایت غیر تسلی بخش تھا۔ جس مینڈیٹ اور اسلامی جمہوری اتحاد (آئی جے آئی) کے جس منشور پر عوام سے وعدہ کر کے وہ برسر اقتدار آئے تھے اس کا احترام نہیں کیا گیا۔ نہ ہی آئی جے آئی کو ایک سیاسی اور فیصلہ ساز ادارے کے اعتبار سے مؤثر انداز سے کام کرنے کا موقع دیا گیا۔ دوسری جانب ہم سب جانتے ہیں کہ پارلیمانی نظام اپنے اندر مختلف تحدیدات و توازن رکھتا ہے۔ اس کے دستوری تقاضے بھی ہیں اور مخصوص روایات بھی۔ ان روایات کا تقاضا ہے کہ فیصلہ کرنے کے لیے پارلیمنٹ کو بار بار اعتماد میں لیا جائے۔ ایوان کے سامنے وزیر اعظم کا آنا اور اس کا سامنا کرنا ان روایات کا بڑا اور لازمی حصہ ہے۔ لیکن بد قسمتی سے ہمارے ملک میں وزرائے اعظم یہ سمجھتے ہیں کہ اقتدر میں آنے کے بعد پارلیمنٹ کے سامنے جواب دہی ان کے لیے ضروری نہیں ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ۲۸ مہینوں میں ہمارے وزیر اعظم غالباً صرف دوبار سینیٹ میں تشریف لائے ہیں۔ میری نگاہ میں یہ طرز عمل پارلیمانی روایات اور ان کی دستوری ذمہ داری سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اس طریقے سے پارلیمنٹ کا احتساب اور فیصلہ سازی کے بارے میں جو کردار ہے، میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے اس کا احترام نہیں کیا۔

اسی طرح وزیر اعظم کی دستوری ذمہ داری تھی کہ وہ صدر کو معاملات سے مطلع رکھتے اور ان سے ایک اچھی ہم آہنگی قائم کرتے۔ ہمارے دستور میں یہ بات کہی گئی ہے۔ یہ وزیر اعظم کی دستوری ذمہ داری ہے کہ وہ فیصلوں سے صدر کو آگاہ رکھے۔ دوسری جانب صدر کی ذمہ داری یہ ہے کہ وزیر اعظم سے اختلاف ہو تو وہ دستور کے تحت معاملات کو منظم

کرنے کے لیے اسے متوجہ کرے۔ اس طرح تعلقات کار کے بارے میں دستور نے یہ کام دونوں کو سونپا ہے اور یہی دنیا کی روایت ہے۔ برطانوی وزیر اعظم ہفتے میں ایک بار، ملکہ یا بادشاہ، جو بھی ہو اس سے ملتا ہے اور اس کو تمام معاملات کے بارے میں بریف کرتا ہے۔ اسی روایت پر ہندوستان میں عمل ہو رہا ہے۔ ہمارے ہاں ان چیزوں کا احترام نہیں کیا گیا۔ اس اعتبار سے میں جہاں اس اقدام کو صدر کے لیے قابل تنقید، قابل گرفت اور قابل مذمت پاتا ہوں وہیں میں سابق وزیر اعظم کی غلطیوں، بے اعتدالیوں یا دستوری اور جمہوری روایات کے بارے میں عدم احترام کو معاف نہیں کرتا۔ بلا شبہ ان کی یہ تمام غلطیاں ہیں، ان پر احتساب ہونا چاہیے۔ وہ قوم کے سامنے جوابدہ ہیں اور قوم ان سے جواب لے گی۔ لیکن اس بات کے کہنے کے ساتھ ساتھ میرا فرض ہے کہ میں یہ بات بھی کہوں کہ اس وقت صدر محترم نے جو اقدام کیا، یہ اقدام دستوری، قانونی، سیاسی اور اخلاقی ہر اعتبار سے میری نگاہ میں غلط اور قابل گرفت ہے۔

صدر محترم کی ذات کے بارے میں کوئی بات کہنا میں مناسب نہیں سمجھتا۔ بحیثیت مجموعی میں نے ہمیشہ ان کی عزت کی ہے اور انہوں نے بھی بڑے پر وقار انداز میں اپنی ذمہ داریوں کو ادا کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس موقع پر ان سے ایک بڑی غلطی ہوئی ہے اور اگر اس غلطی پر یہ قوم ان کا احتساب نہ کرے تو یہ اپنی ذمہ داری پوری نہیں کرے گی۔ اسی لیے ان کے ذاتی احترام کے ساتھ ساتھ میں سمجھتا ہوں کہ ہماری جو دستوری اور اخلاقی ذمہ داری ہے اسے ہم پوری جرأت اور دیانتداری کے ساتھ ادا کریں۔ اور اسی بنا پر میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ ان کا یہ اقدام اخلاقی، دستوری اور قانونی، کسی اعتبار سے بھی صحیح نہیں ہے۔

صدارتی حکم کی حیثیت

آگے بڑھتے ہوئے میں اپنی گزارشات کو دو حصوں میں تقسیم کروں گا۔ پہلی چیز یہ

ہے کہ صدارتی حکم اس آئینی و قانونی ڈھانچے کے خلاف ہے جو اس ملک میں اس وقت جاری و ساری ہے۔ دوسرے الفاظ میں، میری نگاہ میں صدر مملکت کا یہ اقدام غیر آئینی اور غیر قانونی ہے۔ قانون کی زبان میں اس کا کوئی قانونی جواز نہیں ہے، اس لیے میں صدارتی حکم کو چیلنج کرتا ہوں اور دوسری چیز اس کی معنویت و مناسبت ہے، یعنی سیاسی اور اخلاقی اعتبار سے اس کا مناسب، بروقت اور معقول ہونا۔ یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ ہمارے ملک میں جو نظام اس وقت ہے وہ پارلیمانی نظام کی ایک شکل ہے۔ یہ کہنا درست نہیں ہے کہ ہمارے دستور کا جو ڈھانچہ ہے وہ پارلیمانی نظام کے علاوہ کسی اور نظام کا نقشہ پیش کر رہا ہے۔ بلاشبہ، پارلیمانی نظام کی مختلف شکلیں دنیا میں رائج ہیں۔ پارلیمانی نظام محض برطانیہ کا ویسٹ منسٹر ماڈل نہیں ہے۔ اس طرح یہ محض انڈین ماڈل بھی نہیں ہے۔ پارلیمانی نظام میں آپ کو فرانس کا نظام بھی ملتا ہے۔ جہاں صدر، پارلیمنٹ اور دستوری کونسل کے درمیان ایک خاص طریقے سے تعلق قائم کیا گیا ہے۔ اس طریقے سے دنیا میں دوسرے ممالک میں بھی پارلیمانی نظام کی مختلف شکلیں ملتی ہیں اس بنا پر میرا خیال ہے کہ ہمیں سب سے پہلے یہ سمجھنا چاہیے کہ ہمارا دستور کس منصب کو کیا مقام دیتا ہے۔

صدر کا اختیار: ایک بڑا بنیادی نکتہ جو ہمارے دستور میں آیا ہے وہ یہ ہے کہ صدر اور دونوں ایوان یعنی قومی اسمبلی اور سینیٹ مل کر پارلیمنٹ کی تشکیل کرتے ہیں۔ صدر سربراہ مملکت بھی ہے اور فیڈریشن کی وحدت کی علامت بھی ہے۔ نظام حکومت صدر کے نام پر چلے گا لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی دستور میں واضح طور پر موجود ہے کہ قانون سازی کا اختیار پارلیمنٹ کو ہے۔ تاہم پالیسی سازی کا اختیار کابینہ کو ہے اور وہ پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ ہے۔ صدر کا حق ہے کہ اسے مطلع رکھا جائے اور صدر کا اختیار ہے کہ وہ کابینہ کو از سر نو پالیسی لانے کے لیے کہے۔ لیکن اس کے بعد جو پالیسی کابینہ طے کرے گی وہی پالیسی جاری رہے گی۔ صدر اس کو ویٹو نہیں کر سکتا۔ صدر کو اختیار ہے کہ پارلیمنٹ جس قانون کو بنائے اسے پارلیمنٹ میں از سر نو غور کرنے کے لیے بھیج دے لیکن اس کے بعد جس چیز کو

پارلیمنٹ طے کرے گی۔ صدر کے لیے لازمی ہے کہ وہ اس کو منظور کرے۔ صدر کی حیثیت بالعموم یہ ہے کہ کابینہ کے مشورے پر کام کرے۔ اس کے صرف دو استثناء ہیں۔ ایک معمولی استثناء یہ رکھا گیا ہے کہ صدر وزیر اعظم کے مشورے سے فیصلہ کرے گا۔ میری نگاہ میں اس کی تعبیر بھی یہ ہے کہ صدر وزیر اعظم کے مشورے کو ویٹو نہیں کر سکتا۔ لیکن ان دونوں کا اتفاق ضروری ہے۔

اس کے بعد چند مقامات ایسے ہیں، جہاں صدر کو صوابدید حاصل ہے اور وہاں صدر، وزیر اعظم کی سفارش، کابینہ کی سفارش حتّٰی کہ پارلیمنٹ کی سفارش کو نظر انداز کر کے اپنی صوابدید میں کام کر سکتا ہے۔ ان میں کسی غیر معمولی مسئلہ پر ریفرنڈم کروانا، نگران حکومت بنانا یا چند ایک تقرریاں کرنا شامل ہیں۔ میری نگاہ میں، پارلیمنٹ کو تحلیل کرنا صدر کی مطلق صوابدید نہیں ہے۔

عدالتی نظائر: درحقیقت اس معاملے میں اب تو عدالت کے فیصلے بھی موجود ہیں۔ یہاں میں یہ بات بھی کہنا چاہتا ہوں کہ مئی ۱۹۸۸ء میں جو بحث ہماری تحریک استحقاق پر ہوئی اور اس پر رولنگ اس وقت کے چیئرمین نے دی تھی، اس وقت کوئی عدالتی فیصلے موجود نہ تھے۔ اس کے بعد اعلیٰ عدالتوں کے کئی فیصلے موجود ہیں جن میں پنجاب ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے ۱۹۸۸ء کے فیصلے اور ۱۹۹۰ء کے بلوچستان اور پشاور ہائی کورٹ کے فیصلوں کے علاوہ ۱۹۹۰ء کا سپریم کورٹ کا فیصلہ جو ۱۹۹۲ء میں گزٹ ہوا ہے شامل ہیں۔

۱۹۸۸ء میں دی گئی رولنگ عدالتی نظائر کے حوالہ سے خلاء میں دی گئی تھی۔ جبکہ آج ہم ان سارے فیصلوں کی روشنی میں غور کر رہے ہیں۔ یہ بات اب متعین ہو گئی ہے کہ ۵۸(۲)(بی) کے تحت صدر کا اختیار مطلق اختیار نہیں ہے۔ وہ بڑا مشروط اختیار ہے اور اسی لیے اس پر عدالت سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔ اور ظاہر ہے عدالت صرف ہوا میں فیصلے مرتب نہیں کرتی بلکہ وہ اصول مرتب کرتی ہے جن کا احترام ضروری ہے۔ ان اصولوں میں بنیادی چیز یہ ہے کہ صدر محض اپنی رائے کی بنیاد پر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ بلکہ صدر کو حقائق کی

بنیاد پر فیصلہ کرنا ہو گا۔ اس میں یہ بھی طے کیا گیا کہ صدر کی ذاتی پسند اور ناپسند غیر متعلق ہے۔ اسے حق ہے کہ وہ کسی وزیر اعظم یا کسی کابینہ کو ناپسند کرے لیکن محض ناپسندیدگی کی بنیاد پر وہ کابینہ یا پارلیمنٹ کو تحلیل نہیں کر سکتا۔

میں آپ کو یاد دلاؤں کہ جمہوری روایت کا یہ ایک اہم حصہ ہے کہ بہت سے مواقع پر صدر اور وزیر اعظم دو مختلف پارٹیوں سے ہوتے ہیں، مختلف مزاج، اور مختلف نظریات کے حامل ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ مل کر چلتے ہیں۔ کیا میں آپ کو یاد دلاؤں کہ فرانس میں صدر فرانکوئس متراں (Francois Mitterrand) تھا اور وزیر اعظم یاک شیراک (Jacques Chirac) (۱۹۸۸-۱۹۸۶ء) اور دونوں مختلف جماعتوں کی نمائندگی کر رہے تھے۔ اب اس وقت پھر یہی پوزیشن ہے کہ صدر فرانکوئس متران اور وزیر اعظم ایڈورڈ بالاڈر (Edouard Balladur) (۱۹۹۳-۱۹۹۵ء) دو مختلف پروگراموں پر چل رہے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ گزارہ کرتے ہیں۔ تو محض ذاتی پسند یا نظریات کی پسند ناپسند غیر متعلق ہے اور یہ بات تمام دنیا میں تسلیم کی جاتی ہے۔

پھر عدالتی فیصلوں میں یہ بھی آ گیا ہے کہ محض یہ بات کہ صدر یہ سمجھے کہ حکومت کام کرنے کے قابل نہیں، حکومت کو ختم کرنے کے لیے کافی نہیں ہے تمام فیصلوں اور خاص طور پر حاجی سیف اللہ والے فیصلے میں یہ بات شامل کر دی گئی ہے (PLD 1989 SC 166) کہ محض اختلاف نہیں، محض مشکلات نہیں، محض مرکز اور صوبوں کے درمیان کچھ پریشانیاں اور دقتیں نہیں، محض امن و امان نہیں، بلکہ دیکھنا یہ ہو گا کہ آیا یہ آئینی حکومت ٹوٹ پھوٹ گئی ہے یا نہیں۔ یہ ساری چیزیں اس موقع پر موجود نہیں تھیں جب اس وقت کے چیئرمین سینیٹ نے ان پر اپنی رولنگ دی ہے۔ آج یہ سب چیزیں موجود ہیں اور ہم جب غور کر رہے ہیں تو ہم ان تمام عدالتی فیصلوں کے پسِ منظر میں غور کر رہے ہیں۔

ان تمام فیصلوں میں یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ قومی اسمبلی کی تحلیل کا فیصلہ محض ایک قانونی مسئلہ نہیں بلکہ یہ ایک سیاسی مسئلہ ہے۔ اس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ فیصلہ خلا

میں نہیں ہو سکتا۔ ان فیصلوں میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ خود عدالتوں کو بھی ملک کی سیاسی فضا کو زیر غور لانا ہو گا۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ محض تاریخی نظائر کی روشنی میں آپ اسے طے نہیں کر سکتے۔ ہر صورتحال کا اپنا میرٹ ہے جسے سامنے رکھنا ہو گا۔ اسی لیے اس وقت جب کہ ہم غور کر رہے ہیں ہمیں آج کے سیاسی حالات کے تناظر میں دیکھنا ہو گا۔

میں یہ بات بھی کہنا چاہتا ہوں کہ صدر کا یہ اختیار ایک محدود اختیار ہے، لامحدود نہیں ہے۔ میرے پاس اس سلسلے میں دنیا کے مختلف ملکوں کی رولنگز موجود ہیں۔ درحقیقت جن ممالک میں صدر کو یہ اختیار دیا بھی گیا ہے وہاں بھی اس پر کچھ پابندیاں ہیں۔ اسی طرح ہمارے ملک میں بھی کچھ پابندیاں ہیں اور میں آپ کے سامنے کھل کر یہ بات رکھنا چاہتا ہوں کہ یہاں ان پابندیوں اور حدود کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ جو ہم آہنگی اور توازن، صدر اور وزیراعظم کے درمیان دستور پاکستان نے قائم کیا تھا اس کا احترام نہ وزیراعظم نے کیا ہے اور نہ ہی صدر مملکت نے۔ صدر اس دستور کے اندر ایک آپریشنل صدر نہیں۔ وہ اس دستور کے اندر، سیاست میں براہ راست مداخلت کرنے والا صدر نہیں۔ اس کی یہ حیثیت دستور نے نہیں بنائی۔ دستور نے اس کی صرف یہ حیثیت بنائی ہے کہ وہ ایک علامت ہو گا اور غیر جانبدار ہو گا اور یوں اس حیثیت کو برقرار رکھے گا۔ اور یوں اس پورے نظام اور طریقہ کار کی مدد کرے گا۔ جناب والا! اگر آپ چاہیں تو میں اس سلسلے میں سپریم کورٹ کے فیصلے سے، خاص طور پر جو طارق رحیم والا فیصلہ ہے (P L D 1992 SC 646)، چند ایک حوالے پڑھ کر سناؤں گا۔ آپ کی توجہ میں خاص طور پر مبذول کراؤں گا جسٹس عبدالشکور سلام کے فیصلے میں پیراگراف ۱۰ کی طرف ایک سویلین صدر کی جانب سے اسمبلی کی تحلیل کے حوالے سے وہ اپنے فیصلے میں کہتے ہیں:

(ترجمہ): ”اگر انتخابات کے نتیجے میں وہی اسمبلی دوبارہ منتخب ہو جاتی ہے تو ان (صدر مملکت) کے لیے کس قدر شرمندگی کی بات ہو گی۔ پھر اگر اسمبلی صدر کا مواخذہ کرتی ہے تو کتنی خوفناک صورتحال ہو گی اور ان کی صدارت کا خاتمہ ہو

جائے گا۔ صدر مملکت کے لیے اس طرح خطرناک راستہ نہیں بنایا گیا ہے یہ خطرہ مرحوم صدر (ضیاء الحق) لے سکتے تھے۔ جو چیف آف آرمی اسٹاف کا عہدہ بھی رکھتے تھے کہ اگر انتخابات میں ان کی مرضی کے نتائج نہ آتے تو وہ دوبارہ مارشل لاء نافذ کر سکتے تھے۔ سویلین صدر کے لیے آئین کے اندر رہتے ہوئے یہ ممکن نہیں ہے۔ اس لیے میرا نقطہ نظر واضح ہے کہ آرٹیکل ۵۸(۲)(بی) کے تحت جو اختیارات ہیں وہ مرحوم صدر [جنرل ضیاء الحق] کے لیے تھے انہیں مزید طول نہ دیا جائے"۔

کہا گیا کہ عدالتی فیصلہ میں یہ ایک اقلیتی نقطہ نظر ہے۔ چاہے اقلیتی نقطہ نظر ہی کیوں نہ ہو، اس میں ایک بہت بڑا اور اہم قانونی پہلو ہے جس کو یہ ایوان نظر انداز نہیں کر سکتا۔ آپ اگر دیکھیں تو اس فیصلے میں یہ بات بہت واضح کہی گئی ہے کہ صرف دو وجوہ متعلقہ ہیں۔ ایک اس وقت کے صدر کا چیف آف آرمی اسٹاف ہونا کہ اگر انتخابات کے نتائج ان کی مرضی کے نہ ہوں تو وہ مارشل لاء نافذ کر سکیں۔ دوسرے سویلین صدر کے لیے خطرہ کہ جس پارٹی کی حکومت کو برطرف کیا اسی کے نمائندے الیکشن میں جیت گئے تو شرمندگی اور مواخذے کا خطرہ ہے۔ یعنی، باقی سارے کے سارے جو وجوہ دیے ہیں اس میں انہوں نے کہا ہے کہ وہ متعلقہ نہیں ہیں۔

تحلیل اسمبلی کا حکم اور وجوہات

ارکان اسمبلی کے استعفٰے: میرے پاس اسمبلی کی تحلیل کا صدارتی حکم نامہ موجود ہے، اس میں کہا گیا ہے کہ:

(ترجمہ): "حزب اختلاف کے اراکین نے بڑی تعداد میں اور سرکاری بنچوں کی بھی ایک مناسب تعداد نے استعفے دیئے"۔

پہلی بات یہ ہے کہ اس کے اندر کوئی تعداد نہیں ہے۔ آج عدالت میں یہ بات آئی

ہے کہ غالباً ۹۰، ۹۱ یا ۹۵ ارکان نے استعفیٰ دیا تھا لیکن اصل حکمنامہ کے اندر کوئی تعداد نہیں دی گئی۔

دوسری جانب ہم جانتے ہیں کہ دستور کے تحت استعفیٰ اسپیکر کو دیا جاتا ہے۔ صدر کو نہیں دیا جاتا۔ نہ صدر کو ارکان پارلیمنٹ سے استعفیٰ وصول کرنے کا حق ہے، نہ کسی ممبر کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ صدر کو استعفیٰ دے۔ استعفیٰ اسپیکر کو جانا چاہیے۔ اسپیکر کی دستوری ذمہ داری ہے کہ وہ اسے الیکشن کمیشن کو بھیج دیں۔ لیکن یہاں اس کا احترام نہیں کیا گیا۔

تیسری چیز بڑی دلچسپ ہے جو سندھ کے وزیر اعلیٰ سیّد مظفر حسین شاہ نے فرمائی ہے اور میں چاہوں گا کہ آپ کی خدمت میں اسے ضرور پیش کر دوں وہ کہتے ہیں:

> (ترجمہ):"جب ان (وزیر اعلیٰ) سے ان کی حکومت کے اخلاقی جواز کے بارے میں دریافت کیا گیا، کیونکہ پیپلز پارٹی پہلے ہی صوبائی اسمبلی کے اپنے اراکین کے استعفےٰ صدر مملکت کو پیش کر چکی ہے تو وزیر اعلیٰ نے جواب دیا کہ اسمبلی حزب اختلاف کے دباؤ یا اراکین کے استعفوں کے سبب تحلیل کی جا سکتی ہے۔ اگر صوبائی اسمبلی کی ۲۴ نشستوں کے لیے ضمنی انتخابات ہو سکتے ہیں تو ۳۲، ۳۳ دیگر نشستوں کے لیے بھی ہو سکتے ہیں"۔

ان نکات کی روشنی میں، میں کہنا چاہتا ہوں کہ ممبر ۹۱ ہوں یا ۹۵، ۲۱۷ کے ایوان میں یہ اکثریت نہیں بنتی اور اگر اتنے بھی استعفے، فرض کیجیے آئے تھے تو ان کا ضمنی انتخاب ہو سکتا تھا۔ اس کو ایک وجہ بنانا میری نگاہ میں کوئی جواز نہیں بنتا۔

اندرونی و بیرونی مسائل: پھر کہا گیا ہے کہ اندرونی و بیرونی مسائل کا قوم و ملک کو سامنا تھا۔ بلاشبہ یہ مسائل ہیں اور یہ ہمیشہ رہیں گے لیکن اسمبلی کی تحلیل اس بنیاد پر نہیں ہوتی کہ اس وقت جرائم یا امن و امان کے کیا مسائل ہیں۔ اگر اس کو آپ بنیاد بنالیں تو پھر دنیا میں کوئی بھی ملک ایسا نہیں کہ جہاں محض امن و امان یا جرائم کی بنیاد پر فیصلہ کیا جائے تو کوئی اسمبلی برقرار

رہ سکے۔ مثال کے طور پر میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ امریکہ کی اس وقت پوزیشن کیا ہے: ''عصمت دری کے واقعات میں اضافہ کی صورت یہ ہے کہ ہر پانچ منٹ میں ایک واقعہ ہوتا ہے ہر ۲۰ منٹ میں قتل کا ایک واقعہ ہوتا ہے اور ہر ۱۹ سیکنڈ میں ایک گاڑی چوری ہو جاتی ہے۔'' بحوالہ: (www.disastercenter.com.crime/vs)

درحقیقت اگر جرائم یا امن و امان کی بنیاد پر اسمبلی کو توڑا جا سکتا ہو تو پھر دنیا میں کہیں پر بھی کوئی اسمبلی نہیں رہ سکتی۔ جرائم یا امن و امان کی بنیاد پر اسمبلی توڑنے کی یہ بات خود دستور کی دفعہ ۵۸(۲)(بی) کے اندر بھی کہیں لکھی ہوئی نہیں۔ جن وجوہات کو پیش کیا گیا ہے کہ یہ جرائم ہوئے ہیں، یہ لاقانونیت ہے وہ اسمبلی کو تحلیل کرنے کا جواز نہیں بنتیں۔ پھر یہ بات بھی قابل بحث ہے کہ یہ لاقانونیت کتنی ہے اور یہی نقطہ نظر ججوں نے بھی ہر موقع پر لیا ہے۔ اور صاف صاف کہا کہ ہم اس دلیل کو نہیں تسلیم کرتے۔ وہاں انہوں نے صرف اس چیز کو مانا ہے کہ اسمبلی کے اندر ہارس ٹریڈنگ ہوئی ہے۔

ایک اور بات یہ کہی گئی ہے کہ فیڈریشن اور صوبوں کے درمیان کھینچا تانی تھی اور وہ ایسی تھی جو فیڈریشن کے معاملات کے چلنے میں حارج ہو رہی تھی۔ میں نے بار بار اس آرڈر کو پڑھا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ، صدر محترم کی صوابدید کا بڑا قائل ہوں۔ لیکن مجھے تعجب ہے کہ اس پوری چارج شیٹ کے اندر وزیر اعظم کے خلاف تو بہت کچھ موجود ہے، صحیح ہو یا غلط، یہ الگ بات ہے۔ لیکن اسمبلی کے خلاف کچھ ایسی بات نہیں جس سے یہ کہا جا سکے کہ اس کے وجود کو اب گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح میں نے صدر مملکت کی تقریر کا بھی بغور مطالعہ کیا ہے۔ اس تقریر کے اندر کوئی ایک دلیل بھی نہیں دی گئی جو اسمبلی کی تحلیل کی بنیاد قرار دی جا سکے۔ سارا غصہ اور تنقید وزیر اعظم پر اور ان کے انداز حکومت پر ہے اور بلاشبہ اس میں سے بہت سی چیزیں صحیح ہیں۔ لیکن میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ان کے صحیح ہونے کے باوجود آئین اس بات کا حق صدر کو نہیں دیتا کہ وہ اسمبلی کو تحلیل کر دے۔

جناب والا! صدر محترم غلام اسحٰق خان کے ساتھ مجھے مختلف حیثیتوں سے کام کرنے کا

موقع ملا ہے اور ان سے شدید ترین اختلاف کے باوجود ان کی بصیرت کا میں قائل ہوں۔ لیکن مجھے دکھ ہوا کہ صدر محترم نے اپنی تقریر میں چیف آف آرمی سٹاف کے تقرر کے مسئلے کو اٹھایا۔ اس بارے میں دستور یہ کہتا ہے کہ کابینہ، صدر کو جو مشورہ دے گی اسے نہ کسی عدالت میں پیش کیا جائے گا، نہ اس پر کسی کو طلب کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہاں برملا اس کے برعکس اظہار کیا جاتا ہے۔ میری نگاہ میں یہ آئین، آئینی اسپرٹ اور جمہوریت سے بہت بڑا انحراف ہے۔

جناب والا! سابق چیف آف آرمی اسٹاف جنرل آصف نواز جنجوعہ کی اہلیہ نے، ایک ایسے کیس کے بارے میں جو صدر اور وزیر اعظم دونوں کی مرضی سے سپریم کورٹ کے ایک جج پر مشتمل کمیشن کی صورت میں عدالتی تحقیقات سے گزر رہا ہے، جو بات کی ہے، صدارتی نوٹیفکیشن میں اس کا حوالہ بھی دیا گیا، میں سمجھتا ہوں کہ صدر مملکت نے یہ بہت بڑی جسارت کی ہے جو نہیں کرنی چاہیے تھی۔ اس کے ساتھ ہی مخالفت کے جوش میں نجکاری کے حوالہ سے ایک بات انہوں نے ایسی بھی کہہ دی ہے جو ان کے علم، مہارت اور تجربہ کی روشنی میں ناقابل فہم ہے۔ ایک ایسا شخص جسے ملک کی اور عالمی معیشت و مالیات کا ذاتی علم رہا ہے، جس نے وزیر خزانہ کی حیثیت سے اس ملک میں مدتوں کام کیا ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ نجکاری کے ذوق میں یہاں کے لوگ حد سے آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔ اس حد تک تو بات قابل فہم ہے بلاشبہ میں نے بھی نجکاری کے بہت سے پہلوؤں پر تنقید کی لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ فرماتے ہیں کہ دنیا میں نجکاری کے مقابلے میں پبلک سیکٹر کو بحال کیا جا رہا ہے اور یہ کہ اس معاملے میں کلنٹن (Bill Clinton) کی گورنمنٹ اور امریکہ میں بھی یہ بات کہی جا رہی ہے۔ یہ حقائق کے خلاف بات ہے۔ مجھے بڑا دکھ ہوا کہ ہمارے صدر مملکت کی جانب سے ایسا جملہ کہا گیا جس سے ساری دنیا میں پاکستان کی بدنامی ہوئی۔ اس لیے کہ پبلک سیکٹر اور پبلک سروس دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ امریکہ میں انتخابی مہم اور کلنٹن حکمت عملی کے حوالہ سے بحث پبلک سروسز سے متعلق ہے پبلک سیکٹر کے بارے میں نہیں جبکہ ہمارے صدر کی تقریر کے

اندر نجکاری کے مقابلے میں پبلک سیکٹر کو بیان کیا گیا ہے جو کہ ایک ہمالیائی غلطی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ تقریر بھی، گزٹ بھی اور یہ نوٹیفکیشن بھی کوئی جواز فراہم نہیں کرتا۔

مرکز اور صوبوں کے تعلقات کا تنازعہ: اسی طرح فیڈریشن اور صدر اور صوبوں کے درمیان معاملات ہیں۔ بلاشبہ ۱۹۸۹ء اور ۱۹۹۰ء میں ہم خود بھی اس پر توجہ دلاتے رہے ہیں۔ یہ ایوان گواہ ہے اس بات کا کہ مشترکہ مفادات کونسل کے بارے میں ہم نے تین بار قرارداد منظور کی، پیپلز ورکس پروگرام جو پیپلز پارٹی کا تھا اس کو ہم نے صوبوں کے خلاف پایا، زکوۃ آرڈیننس بھی انہوں نے تبدیل کیا، اس کو ہم نے صوبائی حکومت کے خلاف پایا۔ ہم نے ان تمام چیزوں کا نوٹس لیا۔ لیکن جناب والا! میں یہ بات پوچھتا ہوں کہ اگر یہاں وفاق اور صوبوں کے درمیان کشمکش کا ذکر کیا گیا ہے تو کیا کوئی شہادت ہے اس بات کی کہ کسی صوبے نے مشترکہ مفادات کونسل کی میٹنگ طلب کرنے کے لیے کہا اور وہ طلب نہیں کی گئی۔ کیا کوئی شہادت اس بات کی موجود ہے کہ انہوں نے قومی اقتصادی کونسل کو بلانے کا مطالبہ کیا اور اس کو نہیں بلایا گیا۔ میرے علم کی حد تک تو بظاہر جو حکومت ان تمام مقامات پر مرکز اور صوبوں میں رہی ہے وہ اسی پارٹی کی حکومت تھی۔ مسلم لیگ غالب شراکت دار تھی مرکز میں بھی اور صوبوں میں بھی۔ آپس میں یہ لوگ برابر تعاون کر رہے تھے۔ اگر کسی معاملے میں اختلاف یا شکوے شکایات تھیں تو وہ شکایات ہمیشہ ہوتی ہیں ایسی تمام شکایات مرکز اور صوبوں کے درمیان متعلقہ اداروں میں حل کی جاتی ہیں۔ اس وقت تک اس مسئلہ نے ایسی کوئی صورت اختیار نہیں کی تھی کہ کہا جاسکے حکومت کا چلنا ممکن نہیں رہا۔

ہارس ٹریڈنگ کا الزام اور حقیقت: سپریم کورٹ نے دو وجوہ کو ۱۹۹۰ء میں بے نظیر حکومت کی برطرفی کے جواز کے طور پر قبول کیا تھا۔ ان میں ایک مرکز اور صوبوں کے درمیان اختلاف اور اس کا اس حالت کو پہنچ جانا کہ جو حکومت کے چلنے کے لیے مزاحم ہوا تھا۔ اور دوسرا اسمبلی میں ہارس ٹریڈنگ کے واقعات۔ موجودہ اسمبلی میں کسی ہارس ٹریڈنگ کا کوئی ثبوت ہمارے سامنے نہیں۔ بلکہ یہ صاف معلوم ہو رہا ہے کہ صدر مملکت یہ سمجھتے تھے کہ اگر

وہ اپنا دستوری حق استعمال کر کے وزیر اعظم سے مطالبہ کریں کہ وہ از سر نو اعتماد کا ووٹ لیں تو وہ وزیر اعظم کو نہیں ہٹا سکیں گے۔ اس بنا پر اسمبلی پر یہ الزام میری نگاہ میں بے بنیاد ہے۔ اس کے برعکس ہمیں ہارس ٹریڈنگ اگر نظر آتی ہے تو پنجاب اسمبلی میں نظر آتی ہے، جہاں چوبیس گھنٹے کے اندر انقلاب آگیا۔ جس طریقے سے اس موقع پر جہاز میں بھر کر کے لوگوں کو اسلام آباد لایا گیا اور یہاں آکر انہوں نے صدر محترم اور نگران وزیر اعظم صاحب کے پاس حاضری دی۔ وہ ہارس ٹریڈنگ کی واضح صورت ہے۔ تو اس بنا پر سپریم کورٹ نے اسمبلی کی تحلیل کے لیے ماضی میں جن دو وجوہ کو جائز وجوہ قرار دیا تھا وہ دونوں یہاں پر موجود نہیں۔ چنانچہ میں سمجھتا ہوں کہ سپریم کورٹ نے جو قاعدہ مقرر کیا ہے اور جو قانون تشکیل دیا ہے، صدر محترم نے اس قانون سے انحراف کیا ہے اور اس بنا پر انہوں نے غیر آئینی، غیر قانونی اور بلا جواز یہ اقدام کیا ہے۔

وزیر اعظم کے لیے پارلیمنٹ کا اعتماد ضروری ہے: میں یہ بات بھی کہنا چاہتا ہوں کہ دستور میں ایک بڑا ہی نازک اصول ہمارے سامنے آتا ہے۔ دستور کی دفعہ ۹۱(۵) یہ ہے:

> ”وزیر اعظم صدر کی خوشنودی کے دوران عہدے پر فائز رہے گا لیکن صدر اس شق کے تحت اپنے اختیارات استعمال نہیں کرے گا تاوقتیکہ اسے یہ اطمینان نہ ہو کہ وزیر اعظم کو قومی اسمبلی کے ارکان کی اکثریت کا اعتماد حاصل نہیں ہے، جس صورت میں وہ قومی اسمبلی کو طلب کرے گا اور وزیر اعظم کو اسمبلی سے اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے کا حکم دے گا“۔

میری نگاہ میں یہ بہت ہی پیچیدہ شق ہے اور اسمبلی کی تحلیل کے زیر بحث اقدام کا پورا فیصلہ اس شق کے تجزیہ پر ہونا چاہیے۔ آپ پارلیمانی روایات سے واقف اور ان کی تاریخ سے واقف ہیں تو جانتے ہیں کہ دو الگ الگ اصول بیان ہوئے ہیں۔ جمہوریت کی چار سو سال کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ماضی میں دراصل اسی بنیاد کے اوپر لڑائی ہوتی رہی ہے کہ پہلے جن افراد پر انتظامیہ مشتمل ہوتی تھی ان کا تقرر ہوتا تھا اور وہ سربراہ مملکت کی خوشنودی تک اپنے

عہدے پر بر قرار رہتے تھے۔ پھر دوسرا اصول یہ آیا کہ منتظم اعلیٰ ذمہ دار ہے پارلیمنٹ کے سامنے۔ اس کا بننا اور بگڑنا پارلیمنٹ کی جوابدہی کے اوپر منحصر ہے، کسی دوسرے کی خوشنودی پر نہیں۔ ہمارے دستور نے اس بات کو واضح کر دیا۔ صدر کی خوشنودی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ صدر کا ذاتی اطمینان یا ان کی صوابدید، بلکہ اس کے معنی ہیں پارلیمنٹ کے آگے جوابدہی۔ اگر پارلیمنٹ ایک وزیر اعظم پر اعتماد کا اظہار کرتی ہے تو چاہے وہ صدر کو ناپسند ہو، اور صدر اس کی پالیسیوں کو نامنظور کرتا ہو وہ اسے نہیں ہٹا سکتا۔ اس سلسلے میں میں چاہوں گا کہ جسٹس ہدایت اللہ سابق چیف جسٹس سپریم کورٹ آف انڈیا، جن کی کتاب Constitutional Law of India کا میں نے حوالہ دیا ہے اس کو خصوصیت سے آپ ملاحظہ فرمائیں۔ اس میں اس موضوع پر بڑی سیر حاصل بحث ہے۔ میں صفحہ ۱۵۷ سے آپ کو ایک جملہ پڑھ کر سنا رہا ہوں اور وہ یہ ہے:

> (ترجمہ): ''صدر کے منصب کی صحیح پوزیشن کا تعین کرنے کے لیے یہ سمجھنا ہو گا کہ ایک ذمہ دار حکومت میں انتظامی اختیارات کا اصل منبع صرف پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ فرد یا ادارہ ہو سکتا ہے۔ ہندوستانی آئین کے آرٹیکل ۷۵(۳) کے مطابق جو پارلیمانی جمہوریت کی روح کو واضح کرتا ہے، وزراء کی مجلس لوک سبھا کو جوابدہ ہو گی۔ لہٰذا صدر جو پارلیمنٹ کو جوابدہ نہیں ہوتا وہ کبھی بھی حقیقی انتظامی اختیارات کا منبع نہیں بن سکتا ہے''۔

میں نے ہندوستان اور پاکستان کے دساتیر کا بہت گہری نظر سے موازنہ کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ جہاں تک پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہی کا سوال ہے اس میں کوئی نمایاں فرق نہیں۔ ہمیں ان کو الجھانا نہیں چاہیے۔ جہاں تک منتظمین اعلیٰ کے تقرر کا تعلق ہے چاہے وہ چیف آف آرمی سٹاف کا تقرر ہو، چاہے پبلک سروس کمیشن یا الیکشن کمیشن کا ہو اور یا چیئرمین جوائنٹ چیفس آف اسٹاف کمیٹی کا ہو یہی اس کے اختیارات ہیں۔ یہ تقرری ایک بالکل مختلف چیز ہے۔ پارلیمنٹ کے بارے میں اس میں کوئی ابہام نہیں ہے۔ حکومت

پارلیمنٹ کو جوابدہ ہے اور پارلیمنٹ ہی اس کا محاسبہ کر سکتی ہے۔ صدر کا جو اختیار ۵۸(۲)(بی) کے تحت ہے، وہ صرف اس وقت ہے جب آئینی بگاڑ واقع ہو جائے۔ وہ اسے اس بنا پر استعمال نہیں کر سکتا کہ اسے کسی پالیسی سے اختلاف ہے یا وہ وزیر اعظم کو یا اس کے طرز حکوت کو ناپسند کرتا ہے۔ اس بنیاد پر وہ اسے نہیں ہٹا سکتا زیادہ سے زیادہ جو وہ کر سکتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ اندازہ کرے آیا پارلیمنٹ وزیر اعظم کے ساتھ ہے یا نہیں۔ وہ ایک بار نہیں چھ بار مطالبہ کر سکتا ہے کہ پارلیمنٹ سے اعتماد کا ووٹ لو اگر وزیر اعظم اعتماد کا ووٹ نہیں لے سکتا تو وہ اقتدار کھو دے گا۔ صدر اس میں مداخلت نہیں کر سکتا۔ صدر کی خوشنودی پارلیمنٹ کے اعتماد سے مشروط ہے۔ اس کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس معاملہ میں ہندوستان کے دستور اور ہمارے دستور میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مخصوص اختیارات وہیں تک محدود ہیں ان کو آگے نہیں بڑھایا جا سکتا۔ لہذا جو بھی وجوہات یہاں دی گئی ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی وجہ ایسی نہیں ہے جسے قانونی، اخلاقی یا دستوری لحاظ سے صحیح اور قابل اعتبار کہا جا سکے۔ وہ صریحاً غیر متعلقہ ہے۔

اندرونِ وبیرونِ ملک رد عمل

اعتماد کا فقدان: بد قسمتی سے ہوا یہ ہے اور یہ بڑا افسوسناک واقعہ ہے کہ صدر اور وزیر اعظم کے درمیان اعتماد باقی نہیں رہا۔ انہوں نے ایک دوسرے سے تعاون نہیں کیا جس طرح کرنا چاہیے تھا۔ ایک نے دوسرے کو تنگ کرنے کی کوشش کی اور دوسرے نے پہلے کو نکالنے کی۔ میں یہ کہنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتا کہ میں نے خود دس پندرہ دن صرف کر کے فریقین سے بات کی ہے۔ اور یہ صرف قومی مفاد کی خاطر کیا۔ اس میں ہمارا کوئی مفاد نہیں تھا حالانکہ میں اپوزیشن میں تھا اور ہوں لیکن کوشش اس لیے کی کہ تصادم نہ ہو اور ملک کے اندر بدامنی پیدا نہ ہو لیکن بد قسمتی سے یہ صرف ذاتی انا، مزاج اور اپنی اپنی پوزیشن کا مسئلہ بن گیا۔ اس میں فریقین نے پورے ملک اور قوم کو داؤ پر لگا دیا اور یہ بڑی خطرناک صورتحال ہے۔ درحقیقت یہ وہ چیز ہے جس کی بناء پر میری نگاہ میں پاکستان کا وقار، جمہوریت کا مستقبل، پارلیمنٹ کا کردار اور دستور کا تقدس تمام کے تمام ہی مجروح اور پائمال ہوئے ہیں۔

رائے عامہ: یہ ایک حقیقت ہے اور اس سے انکار ممکن نہیں کہ بحیثیت مجموعی وسیع تر حلقوں میں صدر کا بڑا احترام پایا جاتا ہے لیکن رائے عامہ کے جتنے سروے اس وقت تک ہوئے ہیں وہ تمام سروے یہ بتاتے ہیں کہ بحیثیت مجموعی پوری قوم نے اس اقدام کو ناپسند کیا ہے۔ ''Newsline'' میں سروے میں آیا ہے۔ گیلپ کا سروے ہے۔ اسی طرح دوسرے اخباروں نے سروے کیے ہیں، ان میں کوئی سروے ایسا نہیں ہے جس میں ساٹھ فیصد سے ستر فیصد تک لوگوں نے اس اقدام کو ناپسند نہ کیا ہو۔ تقریباً تیس فیصد یا اس سے کچھ زیادہ نے اسے قبول کیا ہے۔ بازار میں آپ چلے جایئے، دوسرے کسی مقام پر کسی سے بات کریں ہر سطح پر لوگوں میں شدید اضطراب اور بے چینی نظر آتی ہے۔

۲۱ویں اسلامی وزراء خارجہ کانفرنس ابھی (۲۵۔ اپریل ۱۹۹۳ء) کو ہوئی تھی، پانچ روز، اس میں مجھے وقت گزارنے کا موقع ملا۔ اکثر وفود نے مجھے کہا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ ہم تو پاکستان سے جمہوریت کی توقع رکھتے تھے اس سے ہی تو پاکستان کا مستقبل یقینی ہونا تھا۔ ملکی پریس کی رائے سے تو ہم سب ہی واقف ہیں۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ پوری دنیا میں اس وقت پاکستان کے بارے میں کیا کہا جا رہا ہے۔ اور اس واقعہ سے ہماری عزت اور وقار کے اوپر کیا فرق پڑا ہے۔ ڈیلی ٹیلی گراف لندن ۲۱۔ اپریل ۱۹۹۳ء میں لکھتا ہے:

> (ترجمہ): ''پہلے موقع پر صدارتی مداخلت کی معقول بنیادیں تھیں۔ پارلیمنٹ میں پاکستان حکومت کی اقلیتی حیثیت نے قانون سازی کے عمل کو محدود کر کے تقریباً روک دیا تھا لیکن اس بار نواز شریف کو وزیر اعظم کی حیثیت سے برطرف کرنے اور قومی اسمبلی تحلیل کرنے کی جو وجوہات دی گئی ہیں وہ مشکوک ہیں۔ صدر غلام اسحٰق نے ایک ایسی حکومت کو ہٹا دیا ہے جس کی بھرپور اکثریت نے معیشت میں آسانیاں پیدا کر کے ایک متاثر کن پروگرام کے ذریعے آگے بڑھنے کا موقع دیا تھا۔ انہوں (وزیر اعظم نواز شریف) نے فوج کو مارشل لاء لگانے سے روک دیا تھا۔ (حکومت بچانے کی) اس جدوجہد میں نواز شریف بہر حال قومی مفاد سے

زیادہ ذاتی مفاد کا تحفظ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ نواز شریف آئین میں ترمیم کرنا چاہتے تھے تاکہ صدر سے وزیر اعظم کی سبکدوشی اور اسمبلی کی تحلیل کے اختیارات واپس لے سکیں۔ جناب غلام اسحٰق خان نے جمہوریت سے پاکستان کی وابستگی پر سوال کھڑے کر دیئے ہیں۔ حکومت کی قسمت کا فیصلہ صدارتی حکم کے ذریعہ نہیں بلکہ اسمبلی میں اعتماد کے ووٹ سے ہونا چاہیے تھا۔ صدر کے من مانے اقدام سے پاکستان کی معیشت کو نقصان پہنچے گا چونکہ اس وقت جب سرد جنگ کے خاتمے سے پاکستان مغرب سے اپنی اسٹریٹجک قیمت سے محروم ہو چکا ہے، بیرونی دنیا کے لیے فوجی بغاوت کے ذریعے کسی منتخب حکومت کا تختہ الٹنے یا ماضی کی طرح کسی سویلین صدر کے ذریعے حکومت برخاست کرنے میں بہت کم فرق ہے۔ دونوں صورتوں میں بیرونی سرمایہ کاروں کا اعتماد ختم ہو گا"۔

اس کے بعد میں ذکر کرنا چاہوں گا Guardian ۲۹ اپریل کا۔ اس میں Gerald Brook لکھتا ہے:

(ترجمہ): "پاکستانی یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے سیاستدانوں کی بدلتی وفاداریوں اور موقع پرستی کے سبب انتشار پیدا ہو گا"۔

آمرانہ اقدام: میرا ایک بنیادی نکتہ یہ ہے کہ اس واقعہ کی وجہ سے ملک اور ملک سے باہر پارلیمنٹ کا وقار اور اس کی عزت پامال ہوئی ہے اور اس آمرانہ اقدام نے پوری دنیا میں ہمیں شرمندہ کیا ہے۔ اس مسئلہ کو اسی لیے استحقاق کے ضمن میں لایا گیا ہے پھر جس طریقے سے نگران حکومت بنی ہے اس کو کیسے نظر انداز کیا جائے؟ دو مہینے سے کچھ افراد کسی سے مل کر آتے ہیں پھر یہ لوگ ایک خاص طرح کا ذو معنی بیان دیتے ہیں جس کی کوئی وضاحت نہیں ہوتی۔ پھر اس کے اثرات شروع ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اسمبلی توڑ دی جاتی ہے۔ نگران حکومت بنتی ہے اور پھر انہی خاص افراد کو کابینہ میں لے لیا جاتا ہے۔ عدالتیں اسے بدنیتی پر مبنی عمل قرار دیتی ہیں۔ نگران حکومت کا کام نہ کسی شعبہ میں نئی پالیسی بنانا ہوتا ہے، نہ کوئی

اور لمبا چوڑا حساب کتاب کرنا ہوتا ہے۔ اس کا کام صرف الیکشن کرانا ہوتا ہے۔ لیکن یہ درمیانی مدت کی حکومت اپنے آپ کو قومی حکومت اور کبھی متفقہ حکومت کہتی ہے۔ حالانکہ ان میں سے کوئی بھی اس کی حیثیت نہیں۔ اس کی حیثیت دستور کے اعتبار سے صرف نگران حکومت کی ہے اور اسے متعین طور پر نوے دنوں کے اندر الیکشن کرانا چاہیے۔

میری نگاہ میں جہاں وزیر اعظم نے بے پناہ غلطیاں کیں اور صحیح طرح نظام حکومت نہیں چلایا وہاں صدر مملکت بھی اپنے عہدے کے وقار کو اس مقام پر برقرار نہ رکھ سکے جس کی انہوں نے ماضی میں بڑی پاسداری کی تھی۔ انہوں نے اس معاملے میں دستور، قانون، سیاسی اور اخلاقی اصولوں کا پورا پورا پاس بھی نہیں رکھا ہے۔ اس وقت چونکہ یہ معاملہ عدالت میں ہے اس لیے ہم یہ توقع رکھتے ہیں اور توقع رکھنا ہمارا حق ہے کہ جلد از جلد اس کا فیصلہ ہوگا اور عدالت جو فیصلہ کرے اسے قبول کیا جائے گا۔ لیکن ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اگر عدالت اسمبلی اور حکومت بحال کرتی ہے تو اسے بحال ہونا چاہیے اگر بحال نہیں کرتی ہے تو مقررہ وقت کے اندر اس کا انتخاب ہونا چاہیے۔

نگراں حکومت کا کردار

اس دوران ہماری درخواست ہے کہ نگران حکومت کو اپنے آپ کو سیاست میں ملوث نہیں کرنا چاہیے۔ نگران حکومت کی حیثیت سے اسے صرف الیکشن پر ساری توجہ مبذول کرنی چاہیے۔ بہتر یہ ہے کہ نگران حکومت ایسے لوگوں پر مشتمل ہو جو الیکشن میں حصہ نہ لے رہے ہوں۔ جو ٹیکنوکریٹس ہوں، ریٹائرڈ لوگ ہوں یا وہ سیاست دان ہوں جو کہیں کہ ہم قوم کی خدمت کریں گے لیکن الیکشن میں حصہ نہیں لیں گے۔ اور ہم اس امر کو یقینی بنائیں گے کہ اس ملک میں عام انتخابات ہوں۔ اس کے ساتھ اس بات کی پوری کوشش ہو کہ محاذ آرائی، تصادم اور منافرت کا ماحول نہ بنایا جائے۔ اس سلسلہ میں میری اپیل حکومت سے بھی ہے اور نواز شریف صاحب سے بھی یہ ہے کہ سیاسی مہم چلایئے۔ یہ آپ کا حق ہے لیکن اس کو ایسے

انداز میں نہ چلایئے کہ جس سے باہم نفرتیں بڑھیں اور تصادم پیدا ہو۔

اس وقت ہمیں اس ملک کو بچانا ہے اور جمہوری اداروں اور جمہوری عمل کو بحال کرنا ہے۔ اس میں ہر ایک کی ذمہ داری ہے کہ وہ مثبت طور پر اپنا کردار ادا کرے۔ میں نگران وزیراعظم سے بھی یہ توقع رکھتا ہوں کہ تصادم کو اس مقام تک نہ لے جائیں جہاں خود جمہوریت خطرے میں پڑ جائے۔ اس تناظر میں ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ وقت ہوشمندی اور سمجھداری کے ساتھ گزارا جائے۔ سینیٹ اس معاملے میں ایک بڑا مثبت کردار ادا کر سکتی ہے۔ وہ پوری قوم کو رہنمائی دے سکتی ہے کہ یہ ایک نازک سیاسی لمحہ ہے۔ اس میں اگر غلطیاں ہوئی بھی ہیں اور لازماً ہوئی ہیں تو ان غلطیوں کی بنیاد پر مزید غلطیاں نہ کی جائیں، مزید بگاڑ پیدا نہ کیا جائے۔ بلکہ وہ راستہ اختیار کیا جائے جس سے جمہوریت کی گاڑی دوبارہ پٹڑی پر آجائے اور ہم آگے بڑھ سکیں۔ ورنہ لمحہ موجود بڑا پریشان کن ہے اس وقت جو اندرونی و بیرونی خطرات لاحق ہیں انہیں نظر انداز کرنا تباہی کا سبب بنے گا۔ یہ ہم سب کو شعور ہونا چاہیے، تمام سیاسی پارٹیوں کو شعور ہونا چاہیے۔ ہمارے ایوان کو اس بارے میں کردار ادا کرنا چاہیے اور میں امید کرتا ہوں کہ سینیٹ اس سلسلے میں اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرے گی۔

(۴ مئی ۱۹۹۳ء)

صدر مملکت کا پارلیمنٹ سے خطاب: آئینی و سیاسی پہلو

آئین پاکستان کے آرٹیکل ۵۶ کے تحت صدر مملکت پارلیمنٹ سے سالانہ خطاب کرتے ہیں۔ اس خطاب جس میں حکومت وقت کی گزشتہ برس کی کارکردگی پر تبصرہ کے ساتھ ساتھ آئندہ اقدامات اور منصوبوں کا ذکر ہوتا ہے۔ آئین کے تقاضے کے تحت صدر مملکت کے خطاب کی تکمیل اراکین پارلیمنٹ کے اظہار تشکر اور اس میں اراکین کی جانب سے ترامیم (تبصروں) کی شمولیت سے ہوتی ہے۔ ۱۹۹۳ء میں نواز شریف حکومت کی برطرفی کے بعد انتخابات کے نتیجے میں قائم ہونے والی بے نظیر حکومت کے ایک برس کی تکمیل پر صدر مملکت نے پارلیمنٹ سے خطاب کیا جس پر اراکین پارلیمنٹ نے تبصرے کیے۔

اراکین پارلیمنٹ کے تبصروں میں دلچسپ موضوع صدر کی حیثیت سے متعلق ہے کہ آیا صدر اپنی رائے کے مطابق حکومت پر تنقید و تبصرہ کر سکتا ہے یا نہیں۔ ۱۹۷۳ء کے آئین کے پس منظر میں یقیناً صدر پارلیمانی حکومت کے مشوروں کا پابند تھا کیونکہ وہ پارلیمنٹ کا حصہ نہیں تھا لیکن آٹھویں ترمیم کے بعد صدر مملکت پارلیمنٹ کا حصہ بن گئے اس سبب حکومتی معاملات میں ان کے اختیارات میں کسی حد تک اضافہ ہوا۔ اگرچہ بعد میں دستور میں کی جانے والی ترامیم سے صدر کے اختیارات میں کمی ہو چکی ہے تاہم صدر کا پارلیمنٹ سے سالانہ خطاب اب بھی آئینی تقاضا ہے۔ اس مجموعی تناظر میں پاکستان کے عمومی مسائل کے ساتھ ساتھ یہ گفتگو صدر کے خطاب کے آئینی و سیاسی پہلوؤں پر ایک اہم تبصرہ ہے۔

صدر اور اس کے خطاب کی دستوری حیثیت

جناب چیئرمین! صدر کے خطاب پر تبصرہ سے پہلے میں سمجھتا ہوں کہ سینیٹر یحییٰ بختیار (پی پی پی) اور سینیٹر مسعود کوثر (پی پی پی) نے اور بہت سے دوسرے حضرات نے صدر کے

خطاب کی دستوری حیثیت کے بارے میں جو سوال اٹھایا ہے اس پر بات کرنے کی ضرورت ہے۔ میری ناچیز رائے میں انہوں نے پوری بات ایوان کے سامنے نہیں رکھی۔ ریکارڈ درست کرنے کے لیے میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ صدر کی تقریر کے جو ماڈل ہیں وہ ایک نہیں بلکہ مختلف ممالک میں مختلف ہیں۔ درحقیقت خود پارلیمانی نظام کا بھی دنیا کے مختلف ملکوں میں کوئی ایک یکساں ڈھانچہ نہیں ہے۔ مغربی دنیا کے مختلف ملکوں مثلاً فرانس اور جرمنی میں بھی اس کے ماڈل مختلف ہیں، بھارت کا ماڈل بھی مختلف ہے۔ پاکستان کے ۱۹۷۳ء کے دستور میں، جس کے بارے میں ہمارے یہ بھائی بہت باتیں کرتے رہتے ہیں، اس میں جو صدر کا مقام ہے، وہ بالکل دوسرا ہے۔ جس آٹھویں ترمیم پر وہ برستے رہتے ہیں، اس کی وجہ سے آج کے دستور میں، جس کا انہوں نے حلف اٹھایا، صدر کا جو مقام ہے، وہ ماضی سے بہت مختلف ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۷۳ء کے دستور میں صدر پارلیمنٹ کا حصہ نہیں ہے۔ میں آپ کو اس کا متعلقہ حصہ بتاتا ہوں۔ اس میں صاف الفاظ میں لکھا ہوا ہے، یہ آرٹیکل ۵۰ ہے۔

> پاکستان کی ایک پارلیمنٹ ہوگی جو دو ایوانوں یعنی قومی اسمبلی اور سینیٹ پر مشتمل ہوگی۔

جب کہ آٹھویں ترمیم کے بعد ہمارے دستور کے مطابق اس وقت صدر، سینیٹ اور قومی اسمبلی سے مل کر پارلیمنٹ تشکیل پاتی ہے۔ صدر محترم نے اس کا خصوصیت سے سہارا لیا ہے اور یہ فرمایا ہے کہ ”پاکستانی عوام کے اجتماعی حق چناؤ کے ذریعہ منتخب شوریٰ جس میں صدر، سینیٹ اور قومی اسمبلی شامل ہیں“۔ اسی طرح ۱۹۷۳ء کے آئین کا جو آرٹیکل ۵۶ ہے اس کا یہ حصہ آج سے بالکل مختلف ہے، اس وقت صدارتی خطاب کی وہ حیثیت نہیں تھی جو آج دستور کے اندر ہے۔ وہاں یہ تھا کہ:

> ”صدر مملکت کسی ایک ایوان یا یکجا دونوں ایوانوں سے خطاب کر سکے گا۔ اس مقصد کے لیے اراکین کو حاضری کا حکم دے سکے گا“۔

اس کے مقابلے میں اگر آپ موجودہ دستور کو لیں تو اس میں صدر کا خطاب لازمی ہے۔ اس کے مطابق:

> ہر عام انتخابات کے بعد قومی اسمبلی کے پہلے اجلاس کے انعقاد اور ہر سال کے پہلے اجلاس کے انعقاد پر صدر مملکت دونوں ایوانوں سے خطاب کرے گا اور مجلس شوریٰ کو اجلاس کی طلبی کی وجوہات بتائے گا۔

یہ بڑا اہم جملہ ہے 'مجلس شوریٰ کو اجلاس کی طلبی کی وجوہات بتائے گا' جو اس بات کو واضح کرتا ہے کہ فی الحقیقت صدر کی ذمہ داری کیا ہے اور اس دستور کے تحت صدر کا جو مقام ہے، اس کی روشنی میں کس طرح صدر کو اپنی بات ایوان کے سامنے رکھنا ہے۔ اگر آپ برطانوی پارلیمنٹ کی روایات دیکھیں تو ملکہ کے خطاب میں قانون سازی کے پروگرام کو واضح کیا جاتا ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ اس سیشن میں پارلیمنٹ فلاں فلاں موضوعات پر قانون سازی کرے گی، پالیسی سازی کرے گی لیکن ہمارے ہاں روایت اس سے مختلف ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے دستور کے تحت صدر کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اسباب بتائے۔ اب وہ صدر محض ۱۹۷۳ء والا صدر نہیں ہے۔ ۱۹۷۳ء کے دستور کے تحت صدر کی کیا حیثیت تھی اس سلسلے میں ضمناً یہ بھی عرض کر دوں اور یہ بڑی دلچسپ چیز ہے کہ جب ۱۹۷۳ء کا دستور نافذ ہوا تو اس کے تحت حلف لینے کے بعد اس وقت کے صدر محترم چوہدری فضل الٰہی نے کسی سیاسی مسئلہ پر اپنی رائے کا اظہار کر دیا۔ اس اظہار رائے پر ۲۹ اگست ۱۹۷۳ء کو اس وقت کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو صدر کو لکھتے ہیں کہ:

> (ترجمہ): "میرے پیارے صدر، میں نے آج ایوان صدر سے جاری کیے گئے بیان کو دلچسپی سے پڑھا ہے جس میں آپ کے حالیہ اعلان کے بارے میں بعض حلقوں کی تنقید کا جواب دیا گیا ہے۔ اگرچہ میں آپ کے بیان میں دیئے گئے نقطہ نظر کو سراہتا ہوں، لیکن اپنے عوام میں صحت مند روایات کے فروغ، آئین کے احترام اور پارلیمانی جمہوریہ کے اصولوں اور طریقوں سے عوام میں آگاہی پیدا

کرنے کے لیے، ریاست کے سربراہ کو مشورہ یہ ہے کہ وہ داخلی مسائل یا بیرونی تعلقات کے تناظر میں سیاسی کردار پر مبنی بیان نہ دیں"۔

اور صدر صاحب نے ۷ ستمبر کو جوابی خط لکھا کہ حضور آپ نے صحیح کہا:

(ترجمہ):"سربراہ مملکت کے سیاسی نوعیت کے بیان کے حوالے سے ۲۹ اگست ۱۹۷۳ء کے آپ کے خط کے لیے میں بہت مشکور ہوں۔ مجھے خود اس سلسلے میں فکر تھی اور میں آپ سے اس کے مضمرات کے حوالے سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن بد قسمتی سے سیلاب کی تباہ کن صورتحال کے سبب آپ کی مصروفیت کے باعث یہ ممکن نہیں ہوا۔ میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ میں اس حوالے سے آپ کے نقطہ نظر سے پوری طرح اتفاق کرتا ہوں اور اپنے آئندہ تمام بیانات میں ان کی پابندی کرنے کا ارادہ کرتا ہوں"۔

یہ تھا صدر کا مقام ۱۹۷۳ء کے دستور میں۔ اور آٹھویں ترمیم، جس پر آپ صلواتیں سناتے ہیں، اس نے آپ کے صدر کو عزت کا وہ مقام دیا۔ انہیں یہ خطاب کرنے کا موقع دیا جس میں انہوں نے اس عزت کا دعویٰ کیا ہے کہ ہاں! میں پارلیمنٹ کا ایک حصہ ہوں۔ جناب والا! آٹھویں ترمیم کو آپ جو چاہے کہہ لیں لیکن محسوس ہوتا ہے کہ جناب صدر نے جزوی طور پر آٹھویں ترمیم کی پوزیشن کو قبول کیا ہے جو ظاہر ہے کہ ۱۹۷۳ء کے اصل دستور سے باہر نکلنا ہے۔ آٹھویں ترمیم والے پاکستانی آئین پر اگر میں یہ بات کہوں۔ ؎

تجاہل ، تغافل ، تبسم ، تکلم
یہاں تک تو پہنچے وہ مجبور ہو کر

جناب والا! ہمارے محترم دوستوں نے Shiri M.N. Kaul کی کتاب Practice and Procedure of Parliament کا حوالہ دیا ہے کہ صدر کے خطاب کے موقع پر کوئی پوائنٹ آف آرڈر نہیں ہونا چاہیے۔ کوئی احتجاج نہیں ہونا چاہیے۔ اصولاً مجھے اس بات سے

پورا اتفاق ہے۔ بلاشبہ صدر کا ایک وقار اور پارلیمنٹ میں اس کے خطاب کا ایک مقام ہے۔ ہمیں اس کا احترام کرنا چاہیے لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اس سلسلے میں پہل کس نے کی۔ یہ آپ ہی تھے جنہوں نے اس وقت جب آپ اپوزیشن میں تھے پارلیمنٹ میں 'گو بابا گو' کا نعرہ لگایا اور اس کے نتیجے کے طور پر وہ روایات منہدم ہوئیں۔ اکبر الٰہ آبادی نے ایسے ہی موقع کے لیے کہا ہے ؎

سکھایا تھا تم ہی نے قوم کو یہ شوشہ سارا
جو اس کی انتہا یہ ہے تو اس کی ابتداء تم ہو!

جناب والا! Kaul کا ایک اور حوالہ بھی جناب مسعود کوثر نے دیا ہے لیکن مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے صفحہ ۱۸۰ اور ۱۸۱ تو پڑھ لیا اور اس کا حوالہ دے کر انہوں نے بتا دیا کہ صدر کے خطاب کا وقار ہونا چاہیے لیکن ذرا آگے بڑھ کر انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ اس سلسلے کی پارلیمانی روایات اور کیا ہیں۔ میں ان کو بتانا چاہتا ہوں کہ خود برطانوی پارلیمانی نظام اور بھارتی آئین کے تحت بھی صدر کے خطاب کے بارے میں صرف Vote of thanks ہی نہیں ہوتا Amendment to vote of thanks بھی ہوتا ہے اور Amendment to vote of thanks کے معنی یہ ہیں کہ صدر کے خطاب پر احتساب ہو اور یہ بتایا جائے کہ اس میں کیا بات کہاں آنی چاہیے تھی جو نہیں آئی ہے اور اگر آئی ہے اور قابل گرفت ہے تو اس پر گرفت کی جائے۔ یہ اس کا لازمی حصہ ہے Kaul کا صفحہ ۸۹ پر ایک جملہ پڑھ کر سنا دیتا ہوں:

(ترجمہ): ''سربراہ مملکت کے خطاب پر شکریہ ادا کرنے کی تحریک میں اراکین کی جانب سے خطاب میں زیر بحث معاملات کے حوالے سے اور جن معاملات کا خطاب میں تذکرہ نہیں کیا گیا ترمیم کے نوٹسز پیش کیے جاتے ہیں''۔

تو ایسا نہیں ہے کہ اگر اپوزیشن کی طرف سے لوگوں نے تنقید کی ہے تو انہوں نے

محض ہوائی اڑائی ہے۔ ہم بھی جانتے ہیں کہ دستوری روایات کیا ہیں۔ ہمارا دستوری ماڈل کیا ہے اور کیا ہماری حدود ہیں ۔ قبل اس کے کہ میں صدر کے خطاب کے حوالے سے حرف تنقید پر آؤں، ایک اور چیز آپ کے علم میں لانا چاہتا ہوں کہ مشہور دانش ور اور کالم نگار جناب الطاف گوہر نے نوائے وقت کی ۱۱ نومبر ۱۹۹۵ء کی اشاعت میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ صدر صاحب کی جو طبع شدہ تقریر آئی ہے اور جو تقریر انہوں نے کی، اس میں ایک جملہ ایسا ہے جو انہوں نے نہیں پڑھا حالانکہ مطبوعہ تقریر میں وہ موجود ہے۔ اگر ایسا ہے تو اس کی تحقیق ہونی چاہیے۔ یہ پارلیمانی روایات کے خلاف ہے۔ اگر صدر نے کسی جملے کو ادا نہیں کیا تو اسے مسودہ سے لازماً حذف کیا جاتا ہے اور جو اس کی املا کردہ کاپی ہوتی ہے، وہ وہ ہوتی ہے جو صدر نے خطاب کیا ہے۔ وہ نہیں ہوتی ہے جو اس کو ڈرافٹ دیا گیا ہے اگر الطاف گوہر صاحب کی نشاندہی درست ہے۔ تو اس کی بھی فکر کرنی چاہیے۔

صدر کے خطاب پر تبصرہ

جناب والا! میری نگاہ میں صدر محترم نے ایک اہم قدم اٹھایا ہے۔ آٹھویں ترمیم میں صدر کو جو حیثیت دی گئی ہے اسے اپنانے کا۔ چنانچہ یہ تقریر محض حکومت کی پالیسی کا ایک چربہ اور ایک بیان نہیں ہے۔ بلکہ حکومت کی پالیسی کا بیان اور اس پر تبصرہ بھی ہے اور ان معاملات کی نشاندہی بھی ہے جو حکومت نہیں کر رہی۔ یہ میری نگاہ میں ایک نوعیت کا احتساب اور تنقید ہے۔ اس سلسلے میں وہ کراچی کا مسئلہ، افراط زر، قانون نافذ کرنے والے اداروں کا کردار، معیشت کی ملی جلی حالت، تعلیم اور خصوصیت سے میڈیا کے اسلامی کردار کو زیر بحث لائے ہیں۔

حکومت اور ایم کیو ایم دونوں کے درمیان مذاکرات میں تعطل آرہا ہے جبکہ کراچی میں آگ لگ رہی ہے۔ روزانہ لاشیں اٹھائی جارہی ہیں۔ پورا ملک اس کی وجہ سے نقصان اٹھا رہا ہے۔ اس بنا پر کہ انہیں ہم کس نام سے پکاریں۔ لیکن صدر محترم نے اپنی تقریر میں جہاں

ایم کیو ایم کا ذکر کیا ہے بطور ایم کیو ایم کیا ہے، الطاف گروپ نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ چیزیں ان کی تقریر کی ایسی ہیں جن کی ہمیں تعریف کرنا چاہیے۔ اور میں اس کو ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد جناب والا! جو چیزیں میری نگاہ میں قابل گرفت ہیں، اس میں صدر محترم کی تقریر اور حکومت کی کارکردگی، دونوں کو سامنے رکھ کر میں انتہائی اختصار سے اپنی بات پیش کرتا ہوں۔

اسلام اور اسلامی تعلیمات: سب سے پہلی چیز اسلام ہے۔ اس لیے کہ صدر محترم نے قرآن کے حوالے سے تقریر کی۔ جگہ جگہ قرآن کی آیات کے حوالے دیئے ہیں۔ انہوں نے اس بات کا بھی ذکر کیا ہے کہ تعلیم اور میڈیا اسلامی کردار کا ہونا چاہیے۔ تو آیئے سب سے پہلے اسلام کی بات کو لیں۔ جو اس ملک کی بنیاد اور اساس ہے۔

جناب والا! اس حکومت نے اسلام کو بھی ترقی پسند، قدامت پسند اور بنیاد پرستی کے تصورات پر مبنی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسلام کے ساتھ اس سے زیادہ بدسلوکی اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ آج مغرب اپنے مخصوص ایجنڈے کے پیش نظر اسلام پر بنیاد پرستی کی پھبتی کس رہا ہے انتہا پسندی کا طعنہ دے رہا ہے۔ لیکن جب مسلمان قائد، اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کی وزیر اعظم کھڑی ہو کر یہ کہیں کہ میں پروگریسو اسلام اور لبرل اسلام کی حامی ہوں۔ اور پاکستان کو اسلامی بنیاد پرستی اور انتہا پسندی کے مقابلے میں ایک فرنٹ لائن اسٹیٹ بنانا چاہتی ہوں تو یہ کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ یہ امریکی حکومت کی آواز ہے۔ یہ کسی مسلمان کی آواز نہیں ہے۔ اسلام ایک ہے۔ یہ قرآن و سنت پر مبنی تعلیمات کا نام ہے۔ جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان رکھتا ہے۔ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے فیصلے کو آخری مانتا ہے۔ اگر اس سے بغاوت کرتا ہے تو اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر آپ کو اسلام پسند نہیں ہے تو جو راستہ چاہے اختیار کر لیجیے۔ لیکن خدا کے لیے اسلام میں یہ تخصیص نہ کریں کہ یہ لبرل اور پروگریسو اسلام ہے اور دوسری جانب کوئی بنیاد پرست اسلام ہے۔ یہ ناقابل قبول ہے۔ یہ ہمارے دشمنوں کا کھیل ہے۔

اس ضمن میں، میں آپ کی توجہ ان انٹرویوز کی جانب دلانا چاہتا ہوں جو ہماری وزیر اعظم صاحبہ نے لندن ٹائمز، لندن کے اخبار انڈیپینڈنٹ، اور بی بی سی کو دیے۔ جو چہرہ وہاں انہوں نے پیش کیا۔ وہ یہ ہے کہ اسلام تمہیں کھا جائے گا۔ میں ہوں پروگریسو، مجھے تھام لو، مجھے سپورٹ دو، تب تم بچ سکتے ہو۔ اور لندن ٹائمز نے ان کے اس انٹرویو کے بعد جو کچھ لکھا ہے اس کا آخری جملہ یہی ہے کہ اگر ہم لبرل ازم کو اس دور میں مسلمان ممالک میں فروغ دینا چاہتے ہیں تو وزیر اعظم بھٹو جیسوں کو سپورٹ کرنا چاہیے۔ اگر ہم نے ان کو سپورٹ نہ کیا تو اسلامی بنیاد پرستی انہیں کھا جائے گی۔ جناب والا! یہ ہے جو اسلام کے ساتھ کیا جارہا ہے۔

میں اس سے بھی زیادہ توہین آمیز بات آپ کے سامنے لانا چاہتا ہوں جو محترمہ وزیر اعظم صاحبہ نے فرانس جا کر، فرانس کی مسلمان بچیوں اور خواتین سے کہی ہے۔ یہ بچیاں اور خواتین جو اپنا سر ڈھانپنے کا حق غیر مسلم حکومت سے حاصل کرنے کے لیے قربانیاں دے رہی ہیں، ان سے وزیر اعظم نے کہا کہ سر ڈھانپنے کا اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ تم جہاں ہو وہاں کے طریقے پر چلو۔ یہ افسوسناک بات ہے جو عوامی سطح پر جا کر وہاں کہی گئی ہے۔ آپ ہفت روزہ "Pulse" دیکھ لیجیے ڈاکٹر شیریں مزاری جیسی خاتون بھی لکھ رہی ہیں کہ دوسرے ملک میں جا کر کے ایک طرف آپ اسلام کی نمائندہ بنتی ہیں اور دوسری طرف مسلمان خواتین کو جو اپنا حق حاصل کرنے کی جدوجہد کر رہی ہیں کہ 'سر ڈھانپنا ہمارے بنیادی حق میں سے ہے' ایک مسلمان ملک کی وزیر اعظم ہونے کے باوجود کہتی ہیں کہ نہیں یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے اور تمہیں فرانس میں ویسے ہی رہنا چاہیے جیسے فرنچ رہتے ہیں۔ یہ وہ رویہ ہے جو آپ نے اس وقت اسلام کے بارے میں اختیار کیا ہے۔

جناب والا! اقوام متحدہ کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی قاہرہ (۱۹۹۴ء) اور بیجنگ (۱۹۹۵ء) کی کانفرنسوں کا ذکر کرنا بھی میں ضروری سمجھتا ہوں۔ اس لیے کہ یہ مغرب کے ایک عالمی ایجنڈے کا حصہ ہے۔ جس کے تحت وہ مغربی استعماریت، مغربی تمدن، وہاں کی

اخلاق باختہ تہذیب، مسلمانوں پر مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ ہم آنکھیں بند کر کے ان کے آلہ کار بن رہے ہیں۔ یہاں معاشی ترقی کے حصول کی حکمت عملی کے حوالہ سے فیملی پلاننگ کی باتیں کی گئی ہیں۔ میں بھی معاشیات کا طالب علم ہوں۔ میں نے بھی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ جدید تاریخ میں یورپ کا کوئی ایک ملک بھی ایسا نہیں ہے کہ جس کی ترقی کے دور میں آبادی کو کنٹرول کیا گیا ہو۔ آبادی بڑھی ہے اور اس بڑھتی ہوئی آبادی نے ملکی ترقی میں منافع بخش حصہ ڈالا ہے۔ اس سلسلے میں شہادتیں موجود ہیں۔ ایک نہیں بیسیوں کتابیں موجود ہیں جن میں ان موضوعات پر اس حوالہ سے بات کی گئی ہے۔ آپ کو سمجھ لینا چاہیے کہ اس طرح آپ لوگوں کی آنکھوں میں دھول نہیں جھونک سکتے۔ درحقیقت جو کچھ یہاں خاندانی منصوبہ بندی کے نام پر کیا جارہا ہے اس کا کوئی تعلق آبادی کی حقیقی تنظیم سے نہیں ہے۔ یہ محض مغرب کی نقالی ہے۔ جسے یہاں فحاشی اور عریانی کو پھیلانے کے لیے کیا جارہا ہے۔ یہ ہماری عورت کے ساتھ، ہماری تہذیب کے ساتھ ایک سازش اور ایک حملہ ہے اس معاملے میں آج NGOs کے ذریعہ مغرب اپنے استعمار کو اور اپنے ثقافتی استعمار کو ہم پر مسلط کر رہا ہے اور یہ ان کے آلہ کار بن رہے ہیں۔

جناب والا! حدود قوانین کے بارے میں خود وزیر اعظم صاحبہ نے ملک میں اور ملک سے باہر کہا ہے کہ یہ بربریت ہیں۔ بربریت جیسے الفاظ اسلام کے قوانین کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔ ایسا کوئی بھی فرد اپنے آپ کو کیسے مسلمان کہہ سکتا ہے۔ کل سینیٹ میں جو بل لایا گیا ہے، میں وزیر قانون کی توجہ اس کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ بل کے عنوان اور متن میں فرق ہے ایک جگہ لکھا گیا ہے کہ اس کا مقصد ہے ''کوڑوں کے استعمال کو محدود کرنا(Restrict)''۔ جبکہ دوسری جگہ ''محدود کی بجائے ختم کرنے (Abolish) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے''۔ ان لفظوں میں بڑا فرق ہے۔ آپ کا ذہن صاف طور پر سامنے آرہا ہے کہ آپ خاتمہ ہی چاہتے ہیں۔ لیکن چونکہ آپ میں ہمت نہیں ہے کہ آپ حدود کے بارے میں اس سے آگے کہہ سکیں تو اس میں آپ ابہام رکھ رہے ہیں۔

جناب والا! ہم جانتے ہیں کہ اپنی شرائط منوانے کے لیے ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف نے پاکستان کی معاشی امداد بند کر دی ہے لیکن آپ نے سنا ہو گا کہ ورلڈ بینک نے اس کے باوجود عدل کے نظام کو جدید بنانے کے لیے ۵۰۰ ملین ڈالرز قرضہ دینے کی پیشکش کی ہے۔ ہمارے نظام عدل کی اصلاح ان کے پیش نظر نہیں ہے۔ ان کا مشن یہ ہے کہ جو چیزیں دراصل ہمارے قانون کی نگاہ میں شریعت ہیں وہ اسے ہدف بنائیں۔ وہ ۵۰۰ ملین ڈالرز اس کام کے لیے آپ کو دینا چاہتے ہیں اور افسوس کی بات یہ ہے کہ ہم اس پر بغلیں بجا رہے ہیں۔

ٹیلی ویژن کی پالیسی کے بارے میں بھی میں کہنا چاہتا ہوں کہ یہ غلط ہے۔ حسین شاہ راشدی صاحب نے اس کی حمایت کی ہے جس پر مجھے بڑا دکھ ہے۔ راشدی صاحب ہماری مشرقی تہذیب کی علامت ہیں۔ وہ مغربی تہذیب کی علامت نہیں ہیں۔ لیکن آج ہمارا ٹی وی مغربی تہذیب ، مغربی اقدار ، مغربی گانوں اور مغربی سٹائل کو پروان چڑھا رہا ہے۔ میں آپ سے دعوے سے یہ بات کہتا ہوں اور مجھے یہ بات مسلمان بچوں اور مسلمان بچیوں نے اور مسلمان خواتین نے بتائی ہے کہ ہم یہ ڈرامے اور یہ ناچ نہیں دیکھ سکتے۔ ہمارے لیے یہ راستہ انہوں نے بند کر دیا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ ڈش انٹینا آ رہا ہے اس کی بنیاد پر سب کچھ دستیاب ہے۔ اس کا جواب کیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ متبادل اسلامی خطوط کے اوپر صحیح تفریح اور صحیح معلومات لائیں۔ ہم نے کب کہا ہے کہ آپ اس کا دروازہ بند کیجیے۔ لیکن اگر آپ ڈش انٹینا کے ذریعہ آنے والی لغویات کی نقالی میں پاکستان ٹی وی پر وہی کچھ دکھائیں گے تو یہ ہماری منزل نہیں ہے۔

جناب والا! میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹیں آہ و بکا کر رہی ہیں۔ ۴۲ رپورٹیں ایوان میں پیش ہو چکی ہیں۔ لیکن آج تک ان پر کوئی گفتگو، ان کی روشنی میں قانون سازی اور پالیسی سازی یا معاملات کی اصلاح نہیں ہوئی ہے۔ شریعت کورٹ کے فیصلوں پر عمل درآمد نہیں ہو رہا ہے۔ سپریم کورٹ کے شریعت اپیلٹ بنچ کے ہر اہم فیصلے میں اپیل کرنے کا حق دیا گیا ہے۔ حتّٰی کہ سود کا مسئلہ جو بنیادی مسئلہ ہے اسے التوا میں

ڈال دیا گیا ہے۔ جناب والا! عالمی نظریاتی کشمکش تو ایک حقیقت ہے۔ ہمیں سمجھنا چاہیے کہ اس میں ہمارا مقام بھی ہے۔ ہم مسلمان ہیں اور یہ ملک اسلام کی بنیاد پر قائم ہوا ہے۔ ہمارے نظریہ اور عقیدہ کے مطابق اللہ کے علاوہ کوئی سپر پاور نہیں ہے۔ جو لوگ خود کو سپر پاور سمجھتے ہیں وہ اپنی تاریخ کو دیکھیں۔ کہ تاریخ سپر پاورز کا قبرستان ہے۔ انسانی تاریخ کا مطالعہ کیجیے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ ماضی میں کم از کم ۳۶ سپر پاور گزر چکی ہیں۔ ہم نے اپنی زندگیوں میں پہلے برطانیہ اور پھر روس کو گرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اور اب امریکہ ڈگمگا رہا ہے۔ صرف ایک پاور سپریم ہے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ ہم نے اس کا دامن تھاما ہے۔ اور اگر ہم اس کے راستے پر چلیں گے تو ہم سپر پاور بنیں گے، ہمیں کسی کا خطرہ نہیں۔ لیکن اس کے لیے ایمان اور اس کی روشنی میں جدوجہد کی ضرورت ہے۔

جناب والا! ہمیں یقین رکھنا چاہیے کہ پاکستان صرف اسلام کی بنیاد پر باقی رہ سکتا ہے۔ پاکستان دنیا کا وہ ملک ہے جو صرف اسلام کی بنیاد پر وجود میں آیا ہے ورنہ اس سے پہلے اس نام کا کوئی ملک موجود نہیں تھا۔ اگر آپ نے اس بنیاد کو ہلا دیا تو مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ پھر یہاں پر مختلف قومیتیں اور مختلف تعصبات ہوں گے۔ آپ اس ملک کو باقی نہیں رکھ سکیں گے۔ اس لیے اسلام کے معاملے میں جو پالیسی آپ نے اختیار کی ہے، خدارا اسے بدلیے اس کے بغیر ہم زندگی اور ترقی کے راستے پر نہیں جا سکتے۔ اسلام ہی ہماری ترقی کی ضمانت ہے۔

پارلیمنٹ کی موجودگی میں آرڈیننسوں کا اجراء: جناب والا! اس حکومت کی نگاہ میں پارلیمنٹ کی عزت اور وقار کی جو حقیقت ہے وہ یہ ہے کہ اس زمانے میں ۱۹۰ آرڈیننس جاری کیے گئے ہیں۔ ان میں کم از کم ۲۳ آرڈیننس ایسے ہیں جو تین اور چار بار جاری کیے گئے ہیں جبکہ سپریم کورٹ کے معزز چیف جسٹس صاحبان جسٹس سجاد اور جسٹس اجمل میاں دونوں اس پر اپنی رائے دے چکے ہیں اور یہ سپریم کورٹ کا فیصلہ ہے۔

(ترجمہ):"میرا مؤقف یہ ہے کہ قومی اسمبلی تحلیل نہیں ہوئی کیونکہ صدر مملکت آئین کے آرٹیکل ۸۹ کے تحت آرڈیننس کو قومی اسمبلی میں (منظوری کے لیے) پیش کیے بغیر اسی آرڈیننس کو دوبارہ استعمال کر کے قومی اسمبلی کے قانون سازی کے اختیارات غصب نہیں کر سکتے"۔

مذکورہ ۲۳ آرڈیننس کے علاوہ جن کو تین تین اور چار چار بار جاری کیا گیا ہے، کم از کم تین آرڈیننس ایسے ہیں جو اس حکومت نے اس وقت جاری کیے ہیں جبکہ قومی اسمبلی کا اجلاس جاری تھا۔ ۶ اپریل ۱۹۹۴ء کو قومی اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا جبکہ ۸ اپریل کو پاکستان براڈکاسٹنگ کارپوریشن کا ترمیمی آرڈیننس ۱۹۹۴ء پاکستان بینکنگ ٹریبونل آرڈیننس ۱۹۹۴ء اور عوامی نمائندگی کے ایکٹ مجریہ ۱۹۷۶ء کے متعلق ترمیمی آرڈیننس مجریہ ۱۹۹۴ء لائے گئے۔ جس کے معنی یہ ہیں جس وقت اسمبلی کا اجلاس جاری تھا اس وقت بھی انہوں نے آرڈیننس جاری کیے۔ اور جب اس بارے میں دریافت کیا گیا تو جواب میں کہا گیا کہ یہ آرڈیننس رات کے وقت جاری کیے گئے تھے اس وقت اسمبلی موجود نہیں تھی۔ جناب والا! یہ ہے وہ مذاق جو یہ پارلیمنٹ کے ساتھ کر رہے ہیں۔

بھارت کے ساتھ تعلقات: جناب والا! اس وقت ملک کے جو اہم ترین مسائل ہیں مثلاً کشمیر کا مسئلہ، ایٹمی پالیسی، دفاع، کرپشن کا مسئلہ، انصاف کی فراہمی یا اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات، ان میں سے کوئی بھی مسئلہ قومی اسمبلی یا سینیٹ میں پالیسی سازی یا بحث کے لیے پیش نہیں کیا گیا۔ مصر، جس کے ساتھ ہمارا کوئی معاملہ نہیں تھا اور ہمارے کوئی قیدی وہاں نہیں ہیں، انہوں نے ان کے ساتھ ایک معاہدہ کیا ہے۔ لیکن پارلیمنٹ سے اس معاہدے کی توثیق نہیں کروائی گئی۔ درحقیقت اس کو پارلیمنٹ کے علم میں بھی نہیں لایا گیا۔

جناب والا! میں ایک اور خطرناک چیز سے بھی آپ کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ اس دوران سارک ممالک نے خاموشی سے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہر ملک ایک دوسرے سے پسندیدہ ترین قوم کا سلوک کرے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان ممالک کے لیے تجارت کے دروازے

نہ صرف کھولے جائیں گے بلکہ ان سے پسندیدہ ترین قوم کا سلوک بھی کیا جائے گا۔ بنگلہ دیش نے ابھی تک اس معاہدے کی توثیق نہیں کی۔ جب کہ ہماری موجودہ حکومت نے خاموشی سے پچھلے مہینے پارلیمنٹ کو اعتماد میں لیے بغیر سارک ممالک کی طرف سے تجارتی اور معاشی معاملات میں بھارت کے پسندیدہ ترین ملک قرار پانے والے معاہدے کی توثیق کر دی۔ اس سے آگے بڑھیے آج ہی کے اخبارات میں خبر شائع ہوئی ہے کہ اب بھارت اس سے اگلا قدم اٹھانا چاہ رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ کسٹم یونین ٹائپ کی جو چیز ان ملکوں کے درمیان اب تک موجود نہیں ہے اپریل تک سارک ممالک اس طرف آگے بڑھیں۔ ایک طرف کشمیر کی صورتحال پیش نظر رکھی جائے اور یہ دیکھا جائے کہ بھارت پاکستان کے ساتھ کیا سلوک کر رہا ہے اور دوسری طرف ہماری حکومت کا عالم یہ ہے کہ یہ خاموشی سے اور اس پارلیمنٹ کو اعتماد میں لیے بغیر دوررس مضمرات کے حامل ان معاملات پر کام کر رہے ہیں۔

جناب والا! ایسی ہی بہت سی اور مثالیں ہیں، حتّٰی کہ مثلاً کرنسی کی قدر میں کمی کی پالیسی، وزیر اعظم نے اس کا اعلان نہیں کیا، جو نصف وزیر ہیں مالیات کے انہوں نے بھی اس کا اعلان نہیں کیا، پارلیمنٹ میں بھی اس کا اعلان نہیں کیا گیا، ایک بیوروکریٹ اس نہایت اہم موضوع پر پالیسی کا اعلان کرتا ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ ۲۹ کو صدر کا خطاب ہونا ہے اور ۲۸ تاریخ کو یہ اعلان کیا جاتا ہے۔ پبلک اکاؤنٹس کمیٹی ڈیڑھ سال تک نہیں بنائی جاتی، جو کمیٹیاں قائم ہیں ان کی رپورٹوں پر کوئی عمل نہیں ہوتا۔ ہمارے سینیٹ کی کمیٹی جو رپورٹیں بھیجتی ہے، حکومت کا کوئی ردعمل ان پر نہیں آتا ہے، حکومت کی یقین دہانی کی کمیٹی سے پوچھیے کیا حال ہے کہ وہ چیخ چیخ کر تھک جاتے ہیں لیکن حکومت سینیٹ کو اہمیت نہیں دے رہی ہے۔

خطرناک معاشی صورتحال: جناب والا! حقیقت یہ ہے کہ ملک کی معاشی صورتحال اس وقت نہایت خطرناک ہو چکی ہے لیکن حکومت ہے کہ وہ سب ٹھیک ہے کا راگ الاپ رہی ہے، جناب والا! میں یاد دلاؤں گا کہ محترمہ وزیر اعظم صاحبہ نے برسر اقتدار آ کر یہ اعلان کیا تھا کہ

ہمیں ایک تباہ شدہ معیشت ملی ہے "ہم ۱۸ ۔ مہینے میں حالات کو درست کر دیں گے"۔ جناب والا! اس کے برعکس آج ۲۴ مہینوں کے بعد، اگر آپ حقائق کو خود اسٹیٹ بینک کی رپورٹ کی روشنی میں دیکھیں تو بیروزگاری اس وقت پاکستان کی تاریخ میں سب سے زیادہ ہے، سرکاری اعداد و شمار یہ ہیں کہ ساڑھے سات فیصد بیروزگاری ہے۔ افراط زر کے بارے میں دعویٰ تھا کہ ۵ ۔ فیصد کر دیا جائے گا سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اس وقت اشیائے صرف کی قیمتوں میں یہ ۱۴ ۔ فیصد ہے۔ ہول سیل قیمتوں کا انڈیکس ۱۶ ۔ فیصد ہے اور حقیقی افراط زر ۲۰ سے ۲۵ فیصد کے درمیان ہے۔

کراچی اسٹاک ایکسچینج حکومت کے پہلے ۸ مہینے میں ۲۵۰۰ تھا، آج وہ ۱۵۰۰ پر آگیا ہے۔ ۱۰۰۰ پوائنٹ ان ۱۸ مہینوں میں نیچے گیا ہے۔ زرمبادلہ کے ذخائر تین بلین تھے اس وقت ایک بلین پر آگئے ہیں، آپ نے تو اس کا موازنہ کیا ہے فرانس سے اور سویڈن سے اور جرمنی سے۔ جناب والا! میرے پاس ایشیائی ترقیاتی بینک اور آئی ایم ایف کی تازہ ترین رپورٹس ہیں، جنہوں نے ہمارا موازنہ کیا ہے سری لنکا سے، تھائی لینڈ سے اور بنگلہ دیش سے۔ اور ان سب ممالک میں افراط زر کم ہے، پیداوار کی شرح زیادہ ہے۔

ملک میں عدم مساوات بڑھ رہی ہے، یہ حکومت کہتی ہے کہ ہم سماجی انصاف کے قائل ہیں لیکن جناب والا! جو تازہ ترین اعداد و شمار آئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۹۰ء میں ملک کی آبادی کے ۷ فیصد کے پاس ملک کی کل دولت کا ۶۲ فیصد تھا، ۱۹۹۵ء میں یہ پوزیشن ہے کہ اس وقت صرف ۵ء۷ فیصد آبادی کے پاس ۷۱ فیصد وسائل ہیں، یہاں دولت کی عدم مساوات پیدا ہو رہی ہے۔ درحقیقت دنیا میں جہاں نجکاری بغیر صحیح پالیسی کے ہوئی، وہاں یہی ہوا ہے کہ ایک طرف مال و دولت کے انبار لگے ہیں اور دوسری طرف غربت بڑھی ہے، یہی ہمارے یہاں ہو رہا ہے اور آپ آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں۔

اپوزیشن کی بات چھوڑ دیجیے، میں کہتا ہوں کہ ارشاد احمد حقانی صاحب تو آپ کے

لیے ہمیشہ تعریفی کلمات کہتے ہیں، پچھلے دو مہینے میں انہوں نے دو بار یہ لکھا ہے کہ آپ کی حکومت بری طرح ناکام رہی ہے اور کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس میں کہ عوام کی ضروریات اور عوام کی ناخواندگی کسی درجہ میں بھی بہتر ہوئی ہو۔

جناب والا! مجھے صرف اجازت دیں کہ میں انہیں کے اپنے یعنی عقل و فہم سے مسلح دانشور کے یہ جملے آج ان کو سنادوں، وہ کہتے ہیں کہ: عام آدمی کی حالت کسی بھی حوالے سے پہلے سے بہتر نہیں ہوئی، کیا اشرافیہ کے تعلیمی اداروں پر تعلیمی بجٹ کا بڑا حصہ صرف ہونا بند ہو گیا ہے؟ کیا خود وزیر اعظم اور صدر مملکت نے ملک کی اشرافیہ کے بعض بہت بڑے تعلیمی اداروں کو کروڑوں کی گرانٹ نہیں دی۔ کیا وہاں ۹۰ فیصد پاکستانیوں کے بچے پڑھتے ہیں، کیا پورے ملک میں یکساں تعلیمی نظام رائج کیا گیا ہے۔ پاکستان کا ایک عام شہری جو اس ملک کی آبادی کے تین چوتھائی سے زیادہ پر مشتمل ہے، اپنے آپ کو حکومت کے اس دعوے سے متفق نہیں پاتا کیونکہ اعداد و شمار کی تمام تر جادو گری کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پچھلے دو سال میں گرانی کی شرح میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے، جس نے پہلے سے دبے ہوئے، پسے ہوئے عوام کو اور زیادہ دبا دیا ہے اور ان کے لیے جسم اور روح کا رشتہ باقی رکھنا مشکل ہو رہا ہے۔

(۲۱ نومبر ۱۹۹۵ء)

مارشل لاء اقدامات کے لیے آئینی جواز

(لیگل فریم ورک آرڈر ۲۰۰۲ء پر بحث کے تناظر میں)

۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو چیف آف آرمی اسٹاف جنرل پرویز مشرف کے حکم کے تحت عوام کی منتخب قومی اسمبلی کو توڑ دیا گیا۔ سینیٹ آف پاکستان اور آئین پاکستان کو معطل کر دیا گیا اس وقت کی منتخب حکومت کو برطرف کر کے جنرل پرویز مشرف نے ملک کے چیف ایگزیکٹو کا عہدہ سنبھال لیا اور وزیر اعظم سمیت چند سیاستدانوں کو فوج نے اپنی تحویل میں لے لیا۔

تقریباً چار برس بعد جنرل پرویز مشرف نے اپنے ہی ایک حکم کے ذریعے سینیٹ آف پاکستان کو بحال کیا۔ سینیٹ کی بحالی کے بعد سینیٹ کے ایک اجلاس میں لیگل فریم ورک آرڈر کے حوالے سے ہونے والی بحث میں سینیٹر پروفیسر خورشید احمد نے مختلف تقاریر اور بحث میں ضمنی تبصرے کیے جو ذیل میں پیش کیے جا رہے ہیں۔ یہ تبصرے ۱۷ویں آئینی ترمیم کے حوالہ سے اگلے باب کے لیے ایک ابتدائیہ کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔

جناب چیئرمین! جنرل پرویز مشرف نے جب اسمبلی کو توڑا اور اس کے ساتھ انہوں نے سینیٹ کو بھی معطل کیا، یہ سینیٹ کے ساتھ پہلا جرم، بلکہ قتل تھا جو انہوں نے کیا جب کہ دستور کی رو سے سینیٹ کو توڑا نہیں جا سکتا۔ سینیٹ میرے خیال میں، قانون کی نگاہ میں اس پورے عرصے میں باقی رہی ہے۔ پرویز مشرف کا دور غیر آئینی ہے۔ سینیٹ کو اس طریقے سے ختم کرنا ان کا پہلا جرم اور زیادتی ہے۔

دوسری بات ان کا ریفرنڈم (اپریل ۲۰۰۲ء) ہے، جو ایک فراڈ تھا اور جسے کوئی قانونی و آئینی جواز حاصل نہیں ہے بلکہ ان کی عزت دنیا میں اور ملک میں اس کے بعد سے

برابر نیچے گر رہی ہے۔

تیسرا جرم انہوں نے یہ کیا کہ سپریم کورٹ کا سہارا لے کر دستور میں ترمیم کی، جبکہ سپریم کورٹ نے ظفر علی شاہ کیس (PLD 2000 SC 869) میں یہ بات بالکل واضح کر دی تھی کہ صرف مشکلات کو دور کرنے کے لیے صدر دستور میں ترمیم کر سکتا ہے لیکن اس کے ڈھانچے کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ تین سال تک وہ (جنرل پرویز مشرف) بیٹھے رہے اور آخری وقت میں انہوں نے دستور کا حلیہ بگاڑ دیا۔ میں صاف کہنا چاہتا ہوں کہ لیگل فریم ورک آرڈر کا کوئی جواز نہیں ہے۔ وہ ایک عبوری اقدام تھا لیکن پارلیمنٹ کے وجود میں آنے کے بعد اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ ۱۹۷۳ء کا آئین جیسا کہ وہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو تھا، آج اس سینیٹ کی بحالی کے بعد خود بخود بحال ہو گیا ہے اور دستور میں جو بھی ترمیم آئے وہ اس ایوان کے ذریعے آسکتی ہے کسی فرد واحد کے ذریعے نہیں آسکتی۔ سپریم کورٹ کو یہ اختیار نہ تھا اور نہ ہے کہ وہ دستور میں ترمیم کرے نہ جنرل مشرف کو ہے اور نہ کسی اور شخص کو ہے۔ اس لیے ہم یہ بات کہنا چاہتے ہیں کہ وہ ترمیم غیر قانونی ہے اور ہم جو حلف لیں گے وہ ۱۹۷۳ء کے آئین کے تحت لیں گے۔ (۱۲ مارچ ۲۰۰۳ء)

لیگل فریم ورک آرڈر (ایل ایف او)

دستوری ترمیم کا اختیار: جناب چیئرمین! میں اپوزیشن، قوم اور خاص طور پر وکیل برادری، بار کونسلز اور تمام بار ایسوسی ایشنز کے اس مؤقف کا اعادہ کرنا چاہتا ہوں کہ ایل ایف او دستور کا حصہ نہیں ہے اور نہ ہی دستور کا حصہ بن سکتا ہے جب تک کہ پارلیمنٹ کے دونوں ایوان اس پر غور کر کے اس میں جن چیزوں کو قابل قبول سمجھتے ہوں اختیار کر لیں اور باقی کو رد کر دیں۔ اس وقت دستوری اعتبار سے قوم اور پارلیمنٹ کے سامنے دو بنیادی سوال ہیں۔ پہلا اصولی سوال یہ ہے کہ کیا کسی فرد واحد کو (وہ کوئی بھی سہارا لے رہا ہو خواہ وہ ہنگامی حالت کا ہو یا عبوری آئینی حکم کا ہو یا عدالتی فیصلے کا ہو) یہ اختیار ہے کہ وہ عبوری مرحلے میں یا دستوری

انحراف کے دور میں دستور میں ترمیم کر دے۔ بلاشبہ صاحب اقتدار کچھ اقدام کر سکتے ہیں اور کرتے رہے ہیں لیکن فیڈرل کورٹ (جو اس وقت اعلیٰ ترین عدالت تھی) یوسف پٹیل کیس میں (۱۹۵۵ء میں) یہ اصول طے کر چکی ہے، اور یہ اصول ساری دنیا میں مسلمہ ہے کہ جسے خود قانون سازی کا اختیار نہ ہو، وہ کسی کو قانون سازی کا اختیار نہیں دے سکتا۔ صرف مقننہ اور دستور ساز اسمبلی ہی وہ ادارے ہیں جو قانون یا دستور بنا سکتے ہیں۔ دستوری انحراف کے دور کو صرف ایک دستور ساز اسمبلی یا مقننہ باقاعدہ دستوری جواز دے سکتی ہے۔ یہ بنیادی اصول ہے۔ اس پر ہم ہرگز مصالحت نہیں کرنا چاہتے۔ اگر اس پر ہم نے یا اس پارلیمنٹ نے یا اس قوم نے صحیح فیصلہ نہ کیا تو اس کے تاریخ پر بڑے دور رس اثرات مرتب ہونگے۔

دوسری بات، جہاں تک ایل ایف او کا تعلق ہے، اس میں کچھ چیزیں ایسی ہیں جو قابل قبول ہیں۔ ہم ضد نہیں کرنا چاہتے، ہم بات چیت کرنا چاہتے ہیں اور جو چیزیں قابل قبول ہیں یا جن پر عمل بھی ہو چکا ہے انہیں قبول کیا جائے، جو نا قابل قبول ہیں ان کو رد کیا جائے، جو اصلاح طلب ہیں ان کی اصلاح کی جائے۔ یہی وہ راستہ ہے۔ جس کے بعد پھر ماضی کے جس دور (مارشل لاء اکتوبر ۱۹۹۹ء تا مارچ ۲۰۰۳ء) سے ہم نکلے ہیں اس کو دستوری جواز دیا جائے۔ اس کے لئے گفتگو کا آغاز بھی ہوا ہے۔ اس لیے ہم یہ بات کہنا چاہتے ہیں کہ ہم اپنے مؤقف پر قائم ہیں، قائم رہیں گے۔ (۲۷ مارچ ۲۰۰۳ء)

قانونی و آئینی جواز ضروری ہے

جناب چیئرمین! میں اپنے دو محترم ساتھیوں، مولانا شاہ احمد نورانی اور میاں رضا ربانی کے نکات سے مکمل اتفاق کرتا ہوں اور میرے عزیز ساتھی وسیم سجاد نے جس منتشر الخیالی کا مظاہرہ کیا ہے، میرے خیال سے وہ دستوری اور قانونی زبان میں زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ یہ ایوان اور قومی اسمبلی، عوام کے منتخب کردہ ہیں اور عوام نے انہیں یہ ذمہ داری سونپی ہے کہ ملک کے دستور کو بحال کریں، جمہوریت کو آگے بڑھائیں۔ قانون

سازی کریں۔ عوام کے مسائل کے حل کی کوشش کریں، کیونکہ عوام کے مصائب و مشکلات میں ان ساڑھے تین سالوں میں اضافہ ہی ہوا ہے کمی نہیں ہوئی ہے۔

جناب والا! قانون کی حکمرانی جس چیز کا نام ہے اس کی روح ہے قانونی جواز۔ اگر کسی ایوان کو یا کسی قانون اور بجٹ کو یا اسی طرح کسی تدبیر کو قانونی جواز حاصل نہیں تو وہ کبھی بھی آئینی و قانونی نقطۂ نظر سے کوئی خدمت انجام نہیں دے سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں ظلم ہوئے ہیں، دستور توڑے گئے ہیں، قانون کی خلاف ورزیاں ہوئی ہیں، لیکن اس کے باوجود یہ سب کچھ کرنے والوں کو کسی نہ کسی طرح جواز حاصل کرنے کی کوشش کرنا پڑی۔

اس ملک میں گورنر جنرل غلام محمد نے سب سے پہلے (۲۴۔ اکتوبر ۱۹۵۴ء) کو دستور ساز اسمبلی کو توڑا لیکن وہ بھی مجبور ہوئے کہ وہ وقت کی فیڈرل کورٹ کے پاس جائیں اور سند جواز حاصل کرنے کی کوشش کریں اور فیڈرل کورٹ نے اپنے فیصلے میں، جس میں ساتوں جج الگ الگ فیصلے لکھتے ہیں، ایک ہی بات کہی کہ کسی ایک فرد کو یہ اختیار نہیں کہ وہ قانون سازی کرے یا دستور بنائے۔ اس لیے آپ کو نئی مقننہ تشکیل دینا پڑے گی وہ دستور بنائے گی اور جن قوانین کو آپ نے رد کر دیا ہے وہ خارج از اختیار رہیں گے۔

ایوب خان نے دستور کے خلاف اقدام کیا لیکن اس کے بعد انہیں بھی قانونی سند حاصل کرنا پڑی۔ یحییٰ کے زمانے میں بھی یہی ہوا۔ ۱۹۷۳ء کا دستور اٹھا کر دیکھ لیجیے، آرٹیکل ۲۶۹، ۲۷۰ اور ۲۷۰ (اے) کے ذریعے ایوب کے زمانے سے لے کر آج تک (اقتدار پر قبضہ کرنے والے حکمران اسمبلیوں سے) قانونی جواز لینے کی کوشش کرتے رہے۔ جب ۱۲۔ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو دستور معطل اور غیر مؤثر کیا گیا اس کے بعد بھی جنرل مشرف کی حکومت کو جواز حاصل نہیں تھا تاوقتیکہ سپریم کورٹ نے سند جواز مہیا کیا اور اس کی توثیق کے ساتھ وہ سارا نظام چلاتے رہے، تو جناب والا! کسی فرد کو یہ اختیار نہیں کہ وہ محض اپنی ذاتی مرضی سے دستور میں کوئی ترمیم کرے۔ ضروری ہے کہ وہ پارلیمنٹ سے دستور میں جو طریقہ لکھا ہوا

ہے اس کے مطابق سند جواز حاصل کرے۔ تو اصل مسئلہ قانونی جواز کا ہے۔ امریکہ نے سلامتی کونسل کی اجازت کے بغیر عراق پر حملہ کیا، ٹھیک ہے قوت تھی، اس کے بل پر کر لیا لیکن اس کو دوبارہ سلامتی کونسل میں آنا پڑا اور سلامتی کونسل سے بات کر کے، چاہے وہ عیب ڈھانکنے کی کوشش ہی سہی لیکن اس نے سلامتی کونسل سے سند جواز حاصل کی۔ آئینی جواز حاصل کرنا ضروری ہے اور جب تک کہ ایل ایف او کو پارلیمنٹ منظور نہیں کرتی اسے سند جواز حاصل نہیں ہو گا۔ ہمارے لیے یہ یوں بھی اہم ہے کہ جہاں تک قومی اسمبلی کا تعلق ہے ۱۹۷۳ء کے دستور کے تحت وہاں بجٹ پیش کیا جانا جائز تھا لیکن سینیٹ میں یہ پہلی مرتبہ آرہا ہے اور صرف اس ترمیم کی بنا پر آرہا ہے جو آرٹیکل ۷۳ میں کی گئی ہے جو ہماری نگاہ میں دستور کا حصہ نہیں، اس لیے کہ جب تک قومی اسمبلی اور سینیٹ دو تہائی اکثریت سے اس کو منظور نہیں کرتی اس وقت تک یہ سارے کا سارا معاملہ بے دلیل، بلا جواز ہے اور قانون کے خلاف ہے۔ ہم اس کو قبول نہیں کرتے۔

تو جناب والا! اس بنا پر ہم احتجاج کر رہے ہیں، دلائل اور حقائق کی بنیاد پر کر رہے ہیں، جذباتی انداز میں نہیں کر رہے اور ہم توقع رکھتے ہیں کہ اس مسئلے پر حزب اقتدار، حزبی یا سرکاری مفادات سے بالاتر ہو کر اپنے اور اس ایوان کے تمام ارکان، پوری کی پوری پارلیمنٹ کی عزت، اس کی خود مختاری اور دستور کی بحالی کے لیے حزب اختلاف کے ساتھ مل کر کام کریں گے۔ تاخیری حربوں کے ذریعے وقت ضائع کرنے سے بد بختی بھی پیدا ہوتی ہے اور مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں اس لیے یہ کام مسلسل کیجیے، مل کر کیجیے، ہم تعاون کر رہے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ جب تک ان تبدیلیوں کو پارلیمنٹ اپنی آزاد مرضی سے، ضروری ترامیم کے ساتھ، تبدیلیوں کے ساتھ قبول نہیں کرتی یہ بلا جواز اور خارج از اختیار ہے، اس کی کوئی حیثیت نہیں اور ہم اس کے خلاف ہر معقول شکل میں احتجاج جاری رکھیں گے۔

(۷ جون ۲۰۰۳ء)

۱۷ویں آئینی ترمیم

مارشل لاء کی مکروہ حالت سے نکلنے کا راستہ

۲۰۰۲ء میں پارلیمانی انتخابات کے بعد سے ملکی سیاست کا ایک اہم عنوان فوجی حکمرانی کا خاتمہ تھا۔ اس ضمن میں ۲۰۰۳ء کے اواخر میں متحدہ مجلس عمل اور حکمراں جماعت مسلم لیگ (ق) کے درمیان مفاہمت ہوئی۔ مفاہمت میں طے پایا کہ جنرل پرویز مشرف کے بطور سپہ سالار حکومت پر قبضہ کرنے سے جو آئینی انحراف پیدا ہوا ہے، اس کو پارلیمنٹ ایک دستوری ترمیم کے ذریعے قانونی جواز مہیا کرے گی اور جواباً جنرل پرویز مشرف ۳۱ دسمبر ۲۰۰۴ء تک صدر اور چیف آف آرمی اسٹاف میں سے کوئی ایک عہدہ چھوڑ دیں گے۔ پارلیمنٹ نے اس معاہدے کے تحت ۱۷ویں آئینی ترمیم منظور کی۔ منظوری کے موقع پر متحدہ مجلس عمل کے اراکین اجلاس میں موجود تھے لیکن انہوں نے معاہدے کے اندر رہتے ہوئے ووٹنگ میں حصہ نہیں لیا۔ اس موقع پر حزب اختلاف کے بعض اراکین نے اپنی قیادت اور مجلس عمل پر اعتراضات اٹھائے کہ وہ جمہوری راستہ چھوڑ کر ملک کو آئین کی پٹڑی سے اتارنے والے ڈکٹیٹر کے اقدامات کی کیوں توثیق کر رہے ہیں۔ بعد ازاں جنرل مشرف اپنے وعدے سے پھر گئے اور ۳ نومبر ۲۰۰۴ء کو ایک بار پھر آئین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ایمرجنسی نافذ کر دی۔ پروفیسر خورشید احمد نے اس صورت حال کے مختلف پہلوؤں پر پارلیمنٹ میں ایک سے زائد بار اظہار خیال کیا۔

جناب چیئرمین! میں متحدہ مجلس عمل کی طرف سے اپنے بنیادی مؤقف کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں اور ساتھ ہی میں آپ سے اور اپنے ساتھیوں سے بھی یہ توقع رکھتا ہوں کہ میری رائے سے اختلاف ضرور کریں لیکن مجھے اپنی بات کہنے کا موقع دیں گے۔ گزشتہ روز سے جو بحث ہم کر رہے ہیں، یہ ایک بڑی مبارک اور خوش آئند چیز ہے۔ میں نے سینیٹ میں اپنے سارے ساتھیوں کی بات بہت توجہ سے سنی ہے۔ اس بحث میں موضوع کے بہت سے

اہم پہلو ہمارے سامنے آئے ہیں اور خود میرے لیے اس میں ایسی کئی چیزیں تھیں جن پر میں برابر غور کر رہا ہوں۔ ہمیں آنکھیں بند کر کے نہ کسی چیز کی تائید کرنا ہے، نہ مخالفت۔ ایک موضوع پر ایک سے زیادہ آراء اخلاص اور دیانت کے ساتھ ہو سکتی ہیں۔ ہم میں یہ حوصلہ ہونا چاہیے کہ پورے یقین سے اپنی بات پیش کریں لیکن اس کے ساتھ ساتھ دوسرے کی بات کو بھی سمجھیں کیونکہ وہ بھی یقین سے اپنا مؤقف پیش کر رہا ہے اور اس میں بھی حق و صداقت کا اتنا ہی امکان ہے جتنا آپ کی رائے میں ہے۔ اختلاف کے باوجود میں آپ کی رائے کا احترام کرتا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ میری بات کو بھی آپ اسی جذبے سے لیں۔

دوسری بات جناب والا! بلاشبہ بحث میں کافی وقت لگ رہا ہے اور وقت کے حوالہ سے آپ کی مجبوریاں بھی ہوتی ہیں لیکن لوگوں کو اپنی بات کہنے کا موقع دیا جائے۔ اس میں خیر ہے اور اس سے پارلیمنٹ کی عزت بڑھتی ہے کم نہیں ہوتی۔ اگر تھوڑا سا زیادہ وقت لگ جاتا ہے تو کوئی نقصان نہیں ہے لیکن ہر شخص کو اپنی بات کہنے کا ضرور موقع ملنا چاہیے۔

جہاں تک اس بل (۱۷ویں آئینی ترمیم کا تعلق) ہے، شاید بہت سے لوگوں کے لیے میری یہ بات غیر متوقع ہے کہ میری نگاہ میں بھی یہ کوئی مثالی بل نہیں ہے اور نہ ہی جس نوعیت کے بل کی آج ضرورت تھی اس کو یہ پورا کر رہا ہے۔ لیکن اتنی بات میں ضرور کہوں گا کہ جو ڈیڈ لاک (جمہوری و پارلیمانی عمل پر پابندی) ملک میں تھا اس سے باہر آنے کا ایک راستہ نکالا گیا ہے۔ معیشت میں دو صورتحال ہوا کرتی ہیں، ایک حل اور ایک دوسرا بہتر حل، یہ بہتر حل نہیں ہے، لیکن موجودہ حالات سے نکلنے کے لیے ایک راستہ ہم نے بنایا ہے۔ بلاشبہ اس میں ہم نے بھی کچھ قربانی دی ہے سرکاری بنچوں نے بھی اپنے مؤقف سے انحراف کیا ہے۔ بہت سے دعوے جو جنرل مشرف کر رہے تھے، ان سے وہ ہٹے ہیں، اس طرح اس معاملے میں ہر طرف سے کچھ نہ کچھ لین دین ہوا ہے۔ یہ کوئی حتمی چیز نہیں ہے۔ دستوری مسئلے کے حل اور پچھلے تین چار سال میں جو کچھ (مارشل لاء کے تحت آئین سے ماورا) اقدامات ہوئے ہیں اس کی اصلاح کے سلسلے میں یہ صرف ایک قدم ہے۔ جنرل مشرف نے یہ بات کہی کہ یہ

کسی کی شکست نہیں ہے، کسی کی فتح نہیں ہے۔ میں اس سے اتفاق کرتا ہوں لیکن میں ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہوں کہ ابھی یہ جمہوریت کی فتح نہیں ہے البتہ جمہوریت کی طرف ایک قدم ہے اور ہمیں قدم اور آگے بڑھانے ہیں۔ میں اس بل کو صرف جمہوریت کی طرف ایک قدم ہی کی حیثیت سے لے رہا ہوں کہ اس طرح در اصل ملک کے اندر جو ڈیڈ لاک تھا، اس کو ختم کرنے کا راستہ نکالا گیا ہے۔

حکومت کے نمائندے اپنی ترجیح بیان کریں گے لیکن میں جس بنا پر سمجھتا ہوں کہ یہ بل (۱۷ویں ترمیم) فوری اہم ہے، وہ یہ ہے کہ اکتوبر ۱۹۹۹ء سے یہ ملک ایک سیاسی تعطل میں مبتلا تھا۔ اس دوران حزب اختلاف نے بڑا مثبت کردار ادا کیا اور اس کی جدوجہد کا نتیجہ ہے کہ ایک چھوٹا سا دروازہ کھلا ہے۔ میری نگاہ میں حکومت نے اس معاملے میں غفلت برتی ہے اور چیزوں کو تاخیر کا شکار کیا ہے۔ سب سے پہلے اہمیت اس مسئلے کو دینی چاہیے تھی جو اس نے نہیں دی۔ لیکن اب کم از کم اس مقام تک وہ آئے ہیں کہ ہم اس کشمکش سے نکل سکیں۔ اب پارلیمنٹ بھی اور اس میں موجود اپوزیشن بھی اپنا کردار ادا کر سکے گی۔ ملک میں اقتصادی صورتحال یہ ہے کہ آپ سرمایہ کاری کے لیے ترغیبات دے رہے ہیں لیکن پیسہ نہیں آرہا، کیوں؟ اس لیے کہ (جمہوری عمل نہ ہونے کے سبب) سیاسی استحکام نہیں ہے۔ آپ کو غور کرنا چاہیے کہ کیا وجہ ہے کہ دولت مشترکہ اور یورپی یونین آپ کو تسلیم نہیں کر رہے؟ تو ہم یہ چاہ رہے ہیں کہ کم از کم ایک دروازہ کھلے، ہم آگے بڑھیں۔ یہ صرف پہلا قدم ہے، یہ آخری قدم نہیں ہے۔ ہمیں مل کر آئندہ بھی بہت کچھ کرنا ہے۔

آئینی ترمیم کے لیے حکومت سے تعاون کیوں؟

اپوزیشن کے اپنے ساتھیوں سے میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ ہم آپ کے جذبات اور آپ کے نقطۂ نظر کا احترام کرتے ہیں۔ آپ یہ اطمینان رکھیے کہ ایم ایم اے نے پورے یقین کے ساتھ اور اپنے اصولوں سے وفاداری کے ساتھ، لیکن ملکی حالات کو سامنے رکھتے

ہوئے اور خود آپ کی اور اپنی مشکلات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ اقدام کیا ہے۔ گزشتہ اجلاسوں میں آپ نے ایک دوسرے کے اوپر تنقید کی اور اس میں نامناسب زبان یہاں پر استعمال کی گئی، میں بھی ذاتی وضاحت کے نکتہ پر جواب دے سکتا تھا لیکن میں نے صبر کیا۔ میں نے کہا ٹھیک ہے جو آپ کہنا چاہتے ہیں کہہ لیں لیکن میری نگاہ میں یہ طریقہ صحیح نہیں ہے۔ ہمیں آئندہ بھی مل کر چلنا ہے اور حالات کو مزید درست کرنا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہ بات بھی ایم ایم اے[1] کے پیکج کا حصہ ہے کہ جہاں ہم اس وقت اس بل کو منظور کرنے میں ساتھ دے رہے ہیں وہیں حکومت سے اس کی خارجہ پالیسی، اس کی معاشی پالیسی، اس کی لاء اینڈ آرڈر کی پالیسی، فوج کی مداخلت اور جو ناانصافیاں ہو رہی ہیں، صوبائی معاملات میں جو اس کی زیادتیاں ہیں، ہم اس پر اسی طریقے سے تنقید کر رہے ہیں جس طرح آپ کر رہے ہیں۔ ہم اس پر (حکومت سے) ہرگز تعاون نہیں کریں گے۔ اس چیز کا ثبوت یہ ہے کہ ہم نے کہا ہے کہ ہم آپ (جنرل مشرف) کو اعتماد کا ووٹ نہیں دیں گے۔

بلاشبہ یہ ایک سمجھوتہ ہے، اس میں مصالحت ہے لیکن یہ سیاست میں پہلی مرتبہ نہیں ہو رہا۔ میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ اس وقت دستور کی ۲۷۰۔اے (اے)[2] کے بارے میں آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں مجھے اس سے اصولی طور پر اختلاف نہیں، میں نے خود یہی باتیں کہی ہیں۔ میرے ایک دوست نے میرا حوالہ دیا کہ ۲۷۰۔اے (اے) کے موقع پر میں نے کہا تھا کہ یہ قانون سازی کا کراہیت آمیز جزو لازم ہے، میں آج بھی کہتا ہوں۔ لیکن میں اس کے ساتھ یہ بھی کہتا ہوں کہ آرٹیکل ۲۷۰ اور آرٹیکل ۲۶۹ جو ۷۳ کے دستور کا حصہ ہیں، وہ بھی اسی طرح قانون سازی کا کراہیت آمیز حصہ ہیں۔ اس وقت ہم جو (۱۷ویں

---

[1] ایم ایم اے اور حکمراں جماعت کے درمیان معاہدہ اس تحریر کے اختتام پر دیا گیا ہے۔

[2] پارلیمنٹ نے آئین کی دفعہ ۲۷۰۔ اے (اے) کے ذریعے جنرل پرویز مشرف کے ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء تا ۲۰۰۲ء ماورائے آئین احکامات اور اقدامات کو معافی دے کر سند جواز عطا کر کے آئینی انحراف کو دور کیا تاکہ اس عرصے میں جو امور مملکت نمٹائے گئے ان کو تحفظ مل سکے۔

ترمیم کی منظوری میں تعاون) کر رہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم مارشل لاء کی وجہ سے مجبوری کی حالت میں ہیں اور اس مکروہ حالت سے نکلنے کے لیے ہمیں کوئی راستہ اختیار کرنا ہے۔ اسی لیے ہم نے جہاں یہ راستہ اختیار کیا ہے وہاں ساتھ ہی یہ بھی کیا کہ ایک مسلسل عمل کے طور پر پارلیمانی کمیٹی بنے گی جو دستور اور ان تمام ۳۰۰ آرڈیننسوں کا جن میں سے بیشتر سے ہمیں بھی اختلاف ہے، جائزہ لے گی اور کوشش کرے گی کہ ان کی اصلاح کی جائے۔ یہ سارا کام ایک ہلے میں نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے مرحلہ وار ہونا ہے اس لیے ہم نے یہ راستہ اختیار کیا ہے۔

بحران کی غیر معمولی نوعیت

آئین کے جن حصوں کا میں نے ذکر کیا ہے، ان پر آپ ضرور نگاہ ڈالیں۔ یہ اس ملک کی بدقسمتی ہے کہ بار بار ہمیں آئینی بحران اور آئینی انحراف سے سابقہ پڑتا ہے، پھر ہمیں اس سے نکلنے کے لیے کوئی غیر معمولی راستہ نکالنا پڑتا ہے۔ یہ عام حالات نہیں ہیں، میری نگاہ میں اس وقت بھی پارلیمنٹ کے قائم ہو جانے کے باجود اور اس ۱۷ویں ترمیم کے قبول کرنے کے باوجود بھی ۳۱ دسمبر ۲۰۰۴ء (جنرل مشرف کے چیف آف آرمی اسٹاف کے عہدہ چھوڑنے) تک ہم عبوری مرحلے میں ہی رہیں گے۔ ہم قدم بہ قدم اس طرف جا رہے ہیں۔ در حقیقت یہ وہ حکمت عملی ہے جس کی بنیاد پر خود آپ حضرات نے بھی الیکشن میں حصہ لیا۔ ورنہ آپ سے سوال کیا جا سکتا ہے کہ ایل ایف او کے باوجود آپ نے انتخابات میں کیوں حصہ لیا ہے؟ ایل ایف او عملاً موجود تھا۔ ایل ایف او کے باوجود اسی اعتبار سے ہم نے بھی الیکشن میں حصہ لیا۔ لیکن ہم نے اس کو کبھی دستوری نہیں مانا اور آج بھی جب تک کہ ۱۷ویں آئینی ترمیم پاس نہیں ہو جاتی اور اس کے نتیجہ میں ایل ایف او دستور کا حصہ نہیں بنتا ہے یہ آئینی نہیں ہو گا۔

میری نگاہ میں زیادہ اچھا طریقہ یہ تھا کہ پورے کا پورا لیگل فریم ورک آرڈر (ایل ایف او) یہاں لایا جاتا۔ اس نقطۂ نظر سے ایم ایم اے نے قانون کا مسودہ بنا کر

وزیر اعظم ظفر اللہ جمالی اور چوہدری شجاعت حسین صاحب کو بھیجا تھا۔ اس مسودہ میں پورے ایل ایف او کو ہم لا رہے تھے لیکن انہوں نے یہ راستہ چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کیا۔

قانون کے ایک طالب علم کی حیثیت سے، محض قانونی موشگافی نہیں بلکہ ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے لیے آپ کے سامنے یہ بات رکھوں گا کہ اگر ایل ایف او دستور کا حصہ ہوتا تو ۱۷ویں آئینی ترمیم میں ۲۷۰۔اے (اے) کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن اب ۲۷۰۔ اے (اے) کو ۱۷ویں آئینی ترمیم میں لانے کے معنی یہ ہیں کہ اس کے منظور ہونے کے وقت ایل ایف او ان ترامیم کے ساتھ جو اب اس میں کی جا رہی ہیں، دستور کا حصہ بنے گا۔ اس وقت تک وہ دستور کا حقیقت میں حصہ نہیں بنتا اور یہی جواز ہے کہ ۲۷۰۔ اے (اے) کو اس کے اندر لایا گیا ہے۔ ورنہ تو ایل ایف او کے تحت الیکشن ہو گیا تھا لیکن ہم نے اسے نہیں مانا، اسے ہم نے اس کے اندر شامل کروایا ہے۔ مجھے پتہ ہے اس ترمیم کے الفاظ ایسے رکھے گئے ہیں جس کے بارے میں بہت سی باتیں کہی جاسکتی ہیں لیکن ۲۷۰۔اے (اے) کا ۱۷ویں ترمیم میں آنا ہی وہ ذریعہ ہے، جس کے ذریعے سے ایل ایف او فی الحقیقت دستور کا حصہ بنے گا اور یہی طریقہ اس سے پہلے ماضی میں آٹھویں ترمیم کے موقع پر بھی اختیار کیا گیا ہے۔

میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں، میں کسی پر اعتراض کے لیے نہیں کہہ رہا ہوں، ذرا ۱۹۷۲ء کو یاد کیجیے۔ کیا اس وقت یہی طریقہ کار اختیار نہیں کیا گیا تھا۔ اس وقت کیا صورتحال تھی؟ ایک ایل ایف او کے تحت الیکشن ہوا تھا، اسمبلی بنی تھی، اس اسمبلی کی اکثریت (سقوط کے بعد) مشرقی پاکستان میں رہ گئی۔ اس کے باوجود اس اسمبلی نے دستور سازی کا کام شروع کیا اور دستور سازی سے بھی پہلے جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کو (پاکستانی مقتدرہ نے) صدر بنا دیا، کیا اس کی کوئی آئینی بنیاد تھی؟ پھر وہ عبوری دستور لائے اور یہ بڑا اہم موقع ہے، ۱۴۔ اپریل ۱۹۷۲ء کو عبوری دستور لایا جاتا ہے اور ۱۷۔ اپریل ۱۹۷۲ء کو اسے منظور کروالیا جاتا ہے۔ تین دن کے اندر پورے کا پورا عبوری دستور منظور کروالیا جاتا ہے اور صرف ان

بنیادوں کے اوپر کہ مارشل لاء ہٹانے کے لیے یہ شرط بتائی گئی تھی کہ یہ صرف اس وقت اٹھائیں گے جب یہ عبوری دستور منظور ہو گا۔ یوں صدارتی نظام لایا جاتا ہے۔

آج اعتماد کے ووٹ پر میرے دوست اعتراض کر رہے ہیں اور حقیقت میں میرے لیے بھی یہ بہت ہی ناخوشگوار طریقہ ہے اس لیے کہ اصولی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ صدارتی انتخابات کا صحیح طریقہ وہی ہے جو دستور میں لکھا ہوا ہے لیکن جیسا میں نے کہا، دستوری انحراف اور عبوری مدت کے زمانے میں کچھ غیر معمولی راستے نکالنے پڑتے ہیں۔

میں سینیٹر رضا ربانی کے الفاظ آپ کو پڑھ کر سناتا ہوں وہ کہتے ہیں کہ:

"(سقوط مشرقی پاکستان کے بعد مغربی پاکستان میں باقی رہ جانے والے اراکین اسمبلی میں) اکثریتی پارٹی کے رہنما ہونے کی حیثیت سے شہید بھٹو سے ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو صدر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا منصب سنبھالنے کے لیے کہا گیا۔ قومی اسمبلی نے ایک اجلاس میں انہیں اعتماد کا ووٹ دیا۔ قومی اسمبلی نے ۱۷ اپریل ۱۹۷۲ء کو ایک عبوری دستور منظور کیا"۔

یہ اعتماد کا ووٹ تھا جس نے ان کو صدر بنایا حالانکہ الیکشن کا طریقہ اس دستور میں لکھا ہوا تھا لیکن وہ طریقہ اختیار نہ ہوا۔ ہمیں تسلیم کرنا ہو گا کہ غیر معمولی حالات کے اندر غیر معمولی راستے اختیار کرنے پڑ جاتے ہیں۔ اس بات کی ضرورت پڑتی ہے کہ کسی طریقے سے ہم بحرانی صورتحال سے نکلیں۔ انسان کو مخصوص حالات میں حلال و حرام کے حوالہ سے بھی متعین حدود میں اختیار دیا گیا ہے۔ اسی طرح ہمیں معلوم ہے کہ کن معاملات کے اندر شریعت نے کیا احکام دیئے ہیں اور قرآن نے کس طرح غیر معمولی حالات میں حکمت، مصلحت اور ضرورت کی بنیاد پر کیا رعایت دی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم اس وقت غیر معمولی حالات سے گزر رہے ہیں۔

میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اسی بنیاد پر اس دستور نے سابق صدر جنرل یحییٰ کے دور

اور ۱۹۷۳ء کے آئین سے پہلے کے دور کو اور جنرل ایوب خان صاحب کے دور کو سندِ جواز دی ہے۔ یہ ساری فہرست یہاں موجود ہے اور یہ قانون سازی کے ناخوشگوار حصے ہیں لیکن بہرحال زندگی کا حصہ ہیں۔ ناخوشگوار حالات سے نکلنے کے لیے انہیں قبول کرنا ہوگا یہی اس کا سند جواز ہے۔

دستور سازی کا اختیار

جناب والا! اب میں زیر بحث بل کی طرف آتا ہوں، میں اپنے ان تمام دوستوں سے سو فیصد متفق ہوں اور میرے پاس یہ بتانے کے لیے ساری چیزیں موجود ہیں کہ ایک شخص واحد کو دستور سازی کا اختیار نہیں۔ ہماری عدالت عالیہ نے اس سلسلے میں بڑے اچھے فیصلے بھی دیئے ہیں اگرچہ بلاشبہ ایسے فیصلے بھی آئے ہیں جن کے اوپر ہم سب مضطرب ہیں لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ جہاں جسٹس منیر نے تمیز الدین خان کیس میں غلام محمد کے ناجائز عمل کو جواز دیا تھا وہیں یوسف پٹیل کیس ۱۹۵۵ء اور اس کے بعد فیڈرل کورٹ میں گورنر جنرل کے ریفرنس میں بڑا عمدہ فیصلہ بھی دیا گیا ہے جس میں یہ اصول ہمیشہ کے لیے بنا دیا گیا ہے کہ کوئی ایک فرد قانون سازی کو دستور سازی کا نام نہیں دے سکتا۔ اسی اصول کا پھر جسٹس یعقوب علی خان نے عاصمہ جیلانی کیس میں اور جسٹس انوار الحق نے نصرت بھٹو کیس میں جگہ جگہ حوالہ دیا ہے۔ یہ بنیادی چیز ہے اور ہم اس اصول پر قائم ہیں۔ اسی لیے ہم یہ چیز لا رہے ہیں کہ جب تک پارلیمنٹ ۲۷۰۔ اے (اے) کو قبول نہیں کر لیتی اس وقت تک یہ اصول رہے گا کہ ایک فرد دستوری مداخلت نہیں کر سکتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اگر پارلیمان خود اسی مداخلت کو قبول کر لیتی ہے تو یہ پارلیمان کے منہ پر ایک طمانچہ ہے۔

در حقیقت یہ ہر آمر اور فوجی حکمران کے لیے ایک پیغام ہے کہ اگر تم نے آئین کی خلاف ورزی کی تو تمہاری بات قوت کی بنیاد پر چل تو سکتی ہے لیکن مانی نہیں جائے گی، مانی صرف اس وقت جا سکتی ہے جب باقاعدہ آئینی طور پر اسے قبول کرنے کے لیے قانون سازی

ہو۔ یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ یہ بل قاعدہ ۲۳۸ کے تحت آیا ہے۔ یہ ایل ایف او کے تحت نہیں آیا۔ یہ ہے وہ بنیادی اصول، جسے ہم نے تسلیم کرایا ہے۔ اور یہ جنرل پرویز مشرف اور سرکاری پارٹی کی طرف سے اپنے مؤقف سے بہت بڑا انحراف ہے، وہ بل لے کر یہاں آئے ہیں اور یہاں پارلیمنٹ میں اس پر گفتگو ہوئی ہے، پارلیمنٹ نے اسے منظور کرنا ہے۔ جب تک کہ پارلیمنٹ اسے قبول نہیں کرتی یہ دستور نہیں بن سکتا۔ دراصل اس کو منظور کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم پوری قوم کو اور فوج کو یہ پیغام دے رہے ہیں کہ کسی ایک فرد کو دستور میں ترمیم کا اختیار نہیں ہے۔

ریفرنڈم اور اعتماد کے ووٹ کی حیثیت

جناب والا! ریفرنڈم کے بارے میں آرٹیکل ۴۱ میں ترمیم کر کے جو راستہ اختیار کیا گیا ہے وہ بھی بلاشبہ کوئی پسندیدہ راستہ نہیں ہے، ایک مجبوری کا راستہ ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ریفرنڈم کو غیر مؤثر قرار دینے کا بھی ایک ذریعہ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ریفرنڈم کے ذریعے میں منتخب ہو گیا ہوں، اس دعوے کو پارلیمنٹ نے مسترد کر دیا۔ پارلیمنٹ یہ کہتی ہے کہ وہ طریقہ غلط تھا جب تک کہ ہم اعتماد کا ووٹ نہ دیں، یہ عمل قبول نہیں کیا جاسکتا۔ صحیح اور مثالی طریقہ یہی تھا کہ جس شخص کو بھی صدر بننا ہو وہ دستور میں دیئے گئے راستہ کو اختیار کرے لیکن اگر وہ نہیں کیا گیا تو پارلیمنٹ ایک غیر معمولی حالت میں، ایک غیر آئینی پوزیشن کو قانونی بنانے کا راستہ بتا رہی ہے۔

یہاں میں آپ کو بتاؤں کہ ہماری تاریخ میں اس سے پہلے بھی بہت سے ایسے واقعات ہوئے ہیں۔ میں نے بھٹو صاحب کے اعتماد کے ووٹ کا ذکر آپ سے کیا۔ اگر آپ اس سے اور پیچھے دیکھیں تو امام ابو حنیفہ کے دور میں بھی ایک بڑا دلچسپ واقعہ ہوا تھا اور وہ یہ کہ دو بھائیوں کی دو بہنوں سے شادی ہو گئی۔ کنفیوژن میں ایک کی دلہن دوسرے کی طرف چلی گئی اور شب باشی بھی ہو گئی۔ اس کے بعد جب مسئلہ سامنے آیا تو امام صاحب نے بڑا تاریخی فیصلہ

دیا، انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے یہ ایک غلط کام ہو گیا ہے لیکن اب اس کو درست کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ دونوں اپنی اپنی بیوی کو طلاق دے دیں اور جس نے جس کے ساتھ شب باشی کی ہے اس سے ان کا نکاح کر دیں۔ ہماری پوزیشن بھی یہی ہے کہ وہ وہاں (عہدہ صدارت) پر موجود ہیں لیکن اس کا قانونی جواز انہیں حاصل نہیں، ہم اس کو قانونی کر رہے ہیں۔ اس لیے میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ ریفرنڈم کے عمل کو مسترد کرنے کے لیے غیر معمولی حالات میں ہم نے ایک راستہ نکالنے کی کوشش کی ہے۔

فوج کا کردار

جناب والا! اس ضمن میں فوج کا کردار بھی ہمارے سامنے آتا ہے۔ میرے دوستوں نے یہ بات کہی ہے اور میں ان سے زیادہ اس بات کا قائل ہوں کہ فوج کو سیاست میں شرکت کا کوئی اختیار نہیں ہے یہ دستور میں لکھا ہوا ہے اور یہی وہ عہد ہے جو ہر فوجی کرتا ہے وہ اصل چیز ہے اور جس نے بھی اس سے انحراف کیا وہ غلط ہے۔ اس حوالے سے میں اپنے بھائی سینیٹر فرحت اللہ بابر سے اتفاق کرتا ہوں کہ آرٹیکل ۶ کے بارے میں پارلیمنٹ نے قانون سازی نہیں کی۔[1] اصولاً اس کا اہتمام ہمیں ضرور کرنا چاہیے۔ جب تک ان لوگوں کو سزا نہیں ملے گی جو دستور سے انحراف کرتے ہیں، ان کا راستہ نہیں رکے گا۔ ۱۷ویں ترمیم اس سلسلے میں

---

[1] سنگین غداری: (۲)(۱) کوئی بھی شخص جو طاقت کے استعمال یا طاقت سے دیگر غیر آئینی ذریعے سے دستور کی تنسیخ کرے، تخریب کرے یا معطل کرے یا التواء میں رکھے یا اقدام کرے یا تنسیخ کرنے کی سازش کرے یا تخریب کرے یا معطل یا التواء میں رکھے سنگین غداری کا مجرم ہو گا۔

(۲) کوئی شخص جو شق (۱) میں مذکورہ افعال میں مدد دے گا یا معاونت کرے گا یا شریک ہو گا اسی طرح سنگین غداری کا مجرم ہو گا۔

(۲)(الف) شق (۱) یا شق (۲) میں درج شدہ سنگین غداری کا عمل کسی بھی عدالت کے ذریعے بشمول عدالت عظمیٰ اور عدالت عالیہ جائز قرار نہیں دیا جائے گا۔

(۳) مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) بذریعہ قانون ایسے اشخاص کے لیے سزا مقرر کرے گی جنہیں سنگین غداری کا مجرم قرار دیا گیا ہو۔

ایک بڑی غیر معمولی ترمیم ہے کہ ایک حاضر سروس جنرل کو اس کے سارے دعووں اور کوشش کے باوجود کہ قومی سلامتی کونسل دستور کا حصہ بن جائے کامیابی نہیں ہو سکی۔ حالانکہ پارلیمنٹ اس کی راہ میں رکاوٹ کے طور پر موجود ہی نہیں تھی۔ اور آج کوئی آئینی ادارہ یا کوئی آئینی اتھارٹی اس (قومی سلامتی کونسل کی) شکل میں نہیں ہے۔ ہاں یہ ٹھیک ہے کہ پارلیمنٹ کے قانون کے ساتھ یہ کونسل بن سکتی ہے اور اس سے پہلے بھی بنی تھی، آخر کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ سابق صدر فاروق لغاری نے قومی سلامتی کونسل کی ایک شکل قائم کی تھی۔ میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ ۱۵۲ (اے) (قومی سلامتی کونسل سے متعلقہ دفعہ) کا نکالا جانا دراصل اس بات کا برملا اظہار ہے کہ فوج کو سیاست میں شرکت کا اختیار نہیں[1]۔

اسی طریقے سے اس اصول کا تسلیم کیا جانا کہ یہ ٹھیک ہے کہ آئینی انحراف کے محدود عرصے کی حد تک چیف آف آرمی اسٹاف صدر رہ سکتا ہے لیکن یہ دونوں عہدے آئینی طور پر جمع نہیں کیے جاسکتے، اسے ایک عہدہ چھوڑنا پڑے گا اور اس کے لیے فوجی حکمراں جنرل مشرف نے عوام کے سامنے اس بات کا اعلان کیا۔ یہ سب کہنے کے باوجود کہ ''نہیں! میں (دو عہدوں کی) گنجائش رکھوں گا''۔ دراصل ہم نے اس اصول کو منوایا۔ میں مانتا ہوں کہ یہ سارے اصول ہم اپنی مکمل مطلوبہ شکل میں حاصل نہیں کر سکے لیکن یہ اپنے ہدف کی طرف ایک قدم ہے۔ پہلا قدم یہی ہے کہ کوئی فرد دستور میں ترمیم نہیں کر سکتا، دستور میں ترمیم کا ایک ہی طریقہ ہے جو کہ دفعہ ۲۳۸۔ اور دفعہ ۲۳۹۔ میں ہے۔

پارلیمنٹ کی خود مختاری

ایک نہایت اہم اصول یہ ہے کہ پارلیمنٹ خود مختار ادارہ ہے اور پارلیمنٹ بھی خود مختار اس لیے ہے کہ اسے عوام نے منتخب کیا ہے۔ اصل خود مختار تو عوام ہیں ہم ان کے

---

[1] حکومت کے پاس آئینی ترمیم کے لیے اکثریت نہیں تھی۔ ایم ایم اے نے قومی سلامتی کونسل کے لیے ووٹ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ جس کا ذکر معاہدے میں موجود ہے۔

نمائندے کے طور پر خود مختار ہیں۔ ہماری خود مختاری محدود ہے لا محدود نہیں ہے۔ یہ چیز میں نہیں کہہ رہا ہوں، Albert Venn Dicey سے لے کر آج تک جتنے بھی آئینی ماہرین ہیں، انہوں نے یہ بات کہی ہے کہ حتمی طور پر خود مختار تو عوام ہیں اور اگر تحلیل کا حق کسی کو (عارضی طور پر) دیا بھی جاتا ہے تو اس لیے کہ یہ حق دوبارہ عوام کے حوالے ہو۔

پھر میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ ۱۷ویں ترمیم اصولاً صدر کے اختیارات کو کم کر رہی ہے، بڑھا نہیں رہی ہے۔ اسی لیے میں نے کہا کہ یہ صرف پہلا قدم ہے اس میں مزید اقدامات کی ضرورت ہے اس لیے کہ (نظم حکومت میں) جو توازن ہونا چاہیے وہ ہمارے ہاں نہیں ہے۔ لیکن ساتھ ہی میں یہ بھی کہوں گا کہ جس طرح صدارتی مداخلت غلط ہے، اسی طرح پارلیمانی نظام اور وزارتی نظام میں فرق ہے۔ آج مغربی دنیا میں سیاست کی کوئی کتاب اٹھا کر دیکھ لیجیے، بڑی اہم بحثیں اس موضوع پر ہو رہی ہیں کہ پارلیمانی نظام کے اندر اگر وزیر اعظم کو مطلق اختیار مل جاتا ہے تو اس طرح پارلیمانی نظام اپنی روح کے مطابق نہیں رہے گا۔ مجھے دکھ سے کہنا پڑتا ہے جو چیز آپ لوگوں نے ۱۹۷۳ء میں کی تھی، وہ بھی ایک صلح تھی۔ میں اپنی بات نہیں کر رہا ہوں۔ میں آپ کو متوجہ کروں گا کہ پیپلز پارٹی کے وزیر قانون جناب محمود علی قصوری نے جس بناء پر اختلاف کیا، پھر اس کا اختلافی نوٹ دیا۔ یہ پاکستان میں دستور سازی کی دستاویزات میں موجود ہے۔ اس میں وہ صاف کہتے ہیں۔

> (ترجمہ): ''مکمل جمہوریت اور پارلیمانی حکومت کے بجائے ہم نے اپنے دستور میں وزیر اعظم کو ایک ڈکٹیٹر بننے کے تمام مواقع مہیا کیے ہیں یہ پارلیمانی حکومت نہیں بلکہ وزیر اعظم کی آمریت ہے۔ یہ دلچسپ امر نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ ہٹلر اور مسولینی دونوں کے سرکاری عہدے وزیر اعظم سے ملتے جلتے تھے''۔

یہ جناب محمود علی قصوری کے الفاظ اختلافی نوٹ میں ہیں، جس میں صدر کے لیے بھی وزیر اعظم کے توثیقی دستخط ضروری ہیں، صدر اس کے بغیر دستخط نہیں کر سکتا تھا۔ یعنی نہ وہ طرز عمل صحیح ہے، نہ ہی یہ صورت صحیح ہے۔

تحدید و توازن کا راستہ

ہمیں بیچ کا راستہ نکالنا ہے، تحدید و توازن (Check and balance) کی ضرورت ہے۔ میں واضح طور پر کہتا ہوں کہ اپنی موجودہ شکل میں صدر کو ایسے اختیارات دے دیئے گئے ہیں جو اس کو حاصل نہیں ہونے چاہییں۔ ۱۷ویں آئینی ترمیم میں ہم نے اس میں سے کچھ کے پر کاٹے ہیں، سب کے نہیں۔ ہمیں آگے بھی کام کرنا ہے۔ میں آپ سے یہ بھی کہنا چاہتا ہوں جناب والا! کہ قومی مالیاتی کمیشن کا نکال دیا جانا پارلیمنٹ اور حزب اختلاف کی ایک بہت بڑی کامیابی ہے۔ حزب اختلاف نے اس پر مؤقف اختیار کیا اور ہم نے اس کی نشان دہی کر دی ہے۔ میں آپ سے یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ ہم نے عدلیہ کو بحال کیا ہے۔ عدلیہ ایک ادارہ ہے، افراد سے غلطیاں ہو سکتی ہیں لیکن ہمیں اداروں کی حفاظت کرنی ہے، اسی طرح پارلیمنٹ سے غلطی ہو سکتی ہے۔ فوجی قیادت کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں کہ فوج میں شہید اور غازی بھی ہیں اور فوج میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اس ادارہ کے نام پر کلنک کا ٹیکا ہیں۔ ہمیں ادارے کا تحفظ کرنا ہے، افراد کا نہیں۔ عدلیہ کے سلسلے میں ہم نے کوشش کی ہے کہ جو نذرانہ دیا گیا تھا اس کو ختم کیا جائے اور ہماری وکلاء برادری کا بھی بڑا حصہ ہے، اس پوری جدوجہد میں ان کا تعاون حاصل رہا ہے۔

عدالت عالیہ کو ۵۸(۲)(بی) کے تحت اقدامات پر عدالتی نظر ثانی کے معاملے میں لانے کے معنی بھی یہی ہیں کہ اس کا فیصلہ حتمی اور لازم ہو گا۔ اس میں بہتری ہو سکتی تھی لیکن جس شکل میں یہ معاملات ہیں، یقیناً اس شکل کے اندر یہ عدالتی نظر ثانی کے لیے انتظامیہ کے اقدامات کو کھول رہا ہے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے اور یہ عدلیہ کو ایسا مقام دینا ہے جس سے ہم توقع رکھتے ہیں کہ تحدید و توازن اس کی شکل میں رونما ہو گا۔ اگر پارلیمنٹ اپنے معاملات کو ٹھیک سے انجام نہیں دیتی ہے تو بلا شبہ حتمی اختیار صدر کا نہیں ہے، عوام کا ہے جو نئے انتخابات کے ذریعے نئے افراد کو لے کر آئیں گے۔ میں آپ کو یہاں یہ بھی یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ۸ویں ترمیم کے بعد جتنی بھی حکومتیں آئیں انہوں نے ۵۸(۲)(بی) کو باقی رکھا حتّٰی کہ

۱۷ویں آئینی ترمیم کے تحت اس کو تبدیل کیا گیا۔ کیا ایسا نہیں ہے؟ تحدید و توازن ایک ترقی پذیر عمل ہے۔ اس کے لیے ہم نے ایک جانب پیش قدمی کی ہے اور ابھی آگے اور بھی اقدامات کرنے ہیں۔

ایک اور بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حکومت کا رویہ میری نگاہ میں پوری حزب اختلاف کو ساتھ لے کر چلنے کا ہونا چاہیے۔ حکومت کو یہ محسوس کرنا چاہیے کہ انحرافات ہوئے ہیں۔ ان انحرافات کو ہم ایک جھٹکے میں نہیں ختم کر سکتے لیکن ان کو بتدریج ختم کرنا ضروری ہے۔ ہمارا ہدف یہی ہونا چاہیے۔ ایم ایم اے نے صرف اس لیے تعاون کیا ہے کہ ہم نے ان انحرافات میں، کم از کم کچھ کو محدود کرنے اور کچھ کو ختم کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ لیکن یہ محض ایک جزوی کامیابی ہے۔ یہ پہلا قدم ہے۔ ہمیں ابھی اس معاملے میں بہت آگے بڑھنا ہے۔ پارلیمان کی بالادستی صحیح معنوں میں اس وقت قائم ہوگی جب سیاست میں فوج کی مداخلت ختم ہوگی۔ موجودہ صدر کو جب بل میں ایک سال کی مدت دی گئی ہے تو تمام چیزیں ختم ہو جاتی ہیں اور پارلیمنٹ صحیح خطوط کے اوپر عوام کے مسائل اور ان کی ضرورت کے مطابق قانون سازی اور پالیسی سازی سرانجام دینے کے قابل بنتی ہے۔

پارلیمنٹ کے ممبران سے میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ آپ اپنی ذمہ داریاں محسوس کریں، یہ خود مختار ادارہ ہے، صرف حکومت اور اپوزیشن نہیں بلکہ ہم سب کو مل کر پاکستان کے دستور کی حفاظت اور پاکستان میں جمہوریت اور پارلیمانی نظام کی حفاظت کے لیے کام کرنا ہے بجائے اس کے، کہ ہم ذاتی مفادات، گروہی مفادات یا اقتدار کے لیے کام کریں۔ میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ ہم نے صرف دستوری مسائل کے معاملے میں ملک کو اس بحران سے نکالنے کے لیے یہ اقدام کیا ہے۔ کوئی دوسری چیز اس پیکیج میں شامل نہیں تھی اور نہ ہے۔

اس دوران ہم ان شاءاللہ اپوزیشن میں رہ کر اپنے منشور اور اپنے اصولوں کے مطابق اپنا کردار ادا کریں گے۔ حکومت جو صحیح بات کرے گی اس پر ہم تعاون کریں گے اور

جو غلط بات کرے گی ہم اس پر گرفت کریں گے۔ اپوزیشن کے ہمارے دوسرے ساتھی جو صحیح بات کریں گے، ہم ان کا ساتھ دیں گے اور جہاں ہمیں ان سے اختلاف ہو گا وہاں ہم احترام کے ساتھ اختلاف کریں گے۔ ہم اس طریقے پر آگے بڑھنا چاہتے ہیں قرآن نے ہمیں یہ اصول بتایا ہے کہ نیکی اور اچھائی کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کرو اور جہاں غلط کام ہو وہاں ہر گز تعاون نہ کرو۔ ان شاء اللہ ہم اسی راستے پر چلیں گے۔ اسی بنیاد پر ایک بوجھل دل کے ساتھ، اس جذبے کے ساتھ نہیں کہ کامیابی ہوئی ہے اور ہم نے بڑا تیر مار لیا ہے، صرف اس جذبے کے ساتھ کہ ہم ملک کو اس بحران سے نکال رہے ہیں، پارلیمنٹ کو بحران سے نکال رہے ہیں۔ ہم نے احتجاج کیا، اس احتجاج نے اپنے نتائج دکھائے لیکن وہ احتجاج بے مزہ ہوتا جا رہا تھا جو آپ بھی جانتے ہیں ہم بھی جانتے ہیں۔ اب ہم نے وہ راستہ نکالا ہے جس میں آپ بھی مؤثر طور پر شرکت کر سکیں گے اور ہم بھی شرکت کر سکیں گے اور اس طرح ہمارے قدم آگے بڑھ سکیں گے۔

جو کچھ کیا گیا ہے یہ ایک تدبیر کا معاملہ ہے، حکمت اور مصلحت کا معاملہ ہے اور ہمیں توقع ہے کہ اس کو اسی تناظر میں لیا جائے گا۔ ہم نے اپوزیشن کے ساتھ کام کیا ہے اور ہم آگے بھی مل کر کام کرنا چاہتے ہیں۔ ہم نے آپ سے اختلاف کیا ہے لیکن ہم آپ کی رائے کا احترام کرتے ہیں۔ جواباً ہم توقع رکھتے ہیں کہ آپ ہماری رائے کا احترام کریں گے، بجائے اس کے کہ ایسی الزامی زبان استعمال ہو کہ 'یہ دائیں بازو اور اسٹیبلشمنٹ کا تعاون ہے'۔ کیا ہم بتائیں کہ ماضی میں لیفٹ، لبرل اور فوج کا تعاون کب کب اور کیا رہا ہے؟ ساری تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ کون کس کا وزیر خارجہ تھا اور کون کس کا وزیر ریلوے تھا۔ یہ سب کچھ ہم جانتے ہیں۔ ہم بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن ہم اس چیز کو نظر انداز کرتے ہیں۔

ہمیں کہا گیا کہ یہ کوئی انتہا پسند گروپ ہے۔ ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ ایم ایم اے میں جید علماء ہیں، اس میں سکالرز بھی ہیں، اس میں وہ لوگ ہیں جن کی دنیا میں عزت ہے۔

جنھوں نے ہزاروں گریجویٹس نہیں پی ایچ ڈی تیار کیے ہیں جو آج بھی ممتحن ہیں اور دنیا میں ان کا عزت سے حوالہ دیا جاتا ہے۔ اس طریقے سے انتہا پسندی کی بات کرنا بڑی نامناسب بات ہے لیکن میں اس میں پڑنا مناسب نہیں سمجھتا۔ ہمیں وہ زبان استعمال کرنی چاہیے جو معقول پارلیمانی زبان ہے۔ ایک دوسرے سے اختلاف کے باوجود ایک دوسرے کا احترام کیجیے اور اس کے ساتھ ساتھ کوشش کیجیے کہ ہمارے قدم آگے بڑھیں اور ملک جس بحران میں ہے اس سے نکلیے۔ یہ ہے وہ چیز جس نے ہمیں مجبور کیا ہے کہ ہم اس ترمیم پر ساتھ دے رہے ہیں ورنہ ہم اپوزیشن میں ہیں، اپوزیشن میں رہیں گے۔ (۳۰ دسمبر ۲۰۰۳ء)

۱۷ویں آئینی ترمیم[1] کی تیسری خواندگی

اس بل کی دو خواندگیاں ہو گئی ہیں۔ پہلی خواندگی کے موقع پر تمام ضروری نکات سامنے آگئے ہیں۔ اس لیے یہ کوئی رسم نہیں ہے کہ ہم اس موقع پر کوئی تقریر کریں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ چند باتیں بہت ضروری ہیں جو حتمی طور پر بل کی منظوری کے وقت ہمارے ذہنوں میں تازہ رہنی چاہییں۔ ہم نے جس جذبے سے اس ترمیم میں حکومت کا ساتھ دیا ہے وہ بنیادی طور پر یہ ہے کہ ملک ابھی ایک عبوری مرحلے سے گزر رہا ہے۔ کم از کم میری جانب سے اور میری پارٹی کی طرف سے اس ایوان اور قوم کے ساتھ یہ ایک وعدہ ہے جس کا تعلق قیام پاکستان کے مقصد اور دستور پاکستان کی اساس سے ہے۔ اس مقصد اور اساس کو مختصراً دہرا لینا مفید ہو گا۔

قیام پاکستان کا مقصد اور دستور کی بنیادیں

ہماری منزل بہت صاف ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ جس مقصد کے لیے پاکستان قائم ہوا

---

[1] ۱۷ویں آئینی ترمیم کی تینوں خواندگیاں ایک ہی دن میں مکمل کی گئیں تو تیسری خواندگی کے موقع پر بھی پروفیسر خورشید احمد نے اپنے مؤقف کے خاص خاص نکات دہرائے۔

تھا اور جسے قرار داد مقاصد میں اور بحیثیت مجموعی ۱۹۷۳ء کے دستور میں پوری وضاحت اور گہرائی کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے، اس کی جانب پیش رفت کی جائے۔ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے۔ یہ ایک نظریئے کی بنیاد پر قائم ہوا ہے۔ اللہ کی حاکمیت اور اللہ کی دی ہوئی ہدایت، اس ملک کا بنیادی قانون، نظام زندگی اور مستقبل ہے۔ اس کے ساتھ دوسرا بنیادی اصول جمہوریت ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کی ہدایت کو نافذ کرنے کا نظام اور ذریعہ عوام کے منتخب نمائندوں کو بننا ہے جو اللہ کے سامنے جواب دہ ہیں اور اللہ کے ساتھ عوام کے سامنے جواب دہ ہیں۔

اسلام میں قانونی جواز دو چیزوں سے آتا ہے۔ پہلا اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے وفاداری اور شریعت کی بالادستی اور دوسرا عوام کا اعتماد اور ان کے سامنے جواب دہی۔ اس کے ساتھ ہی جمہوریت کا وہ تصور جو پارلیمانی جمہور کا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ نہ وہ صدارتی ہو، نہ وہ مطلق العنان ہو، نہ اس میں آمریت کا کوئی شائبہ ہو بلکہ پارلیمنٹ کی حاکمیت، اللہ کی حاکمیت کے تابع ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انتظامیہ پارلیمنٹ کے سامنے جواب دہ ہوگی۔ صدر بلاشبہ ہمارے دستور کے تحت پارلیمنٹ کا حصہ ہیں۔ پارلیمنٹ مشتمل ہے صدر، سینیٹ اور قومی اسمبلی کے اوپر، لیکن اس میں صدر کو ایک خاص مقام دیا گیا ہے۔ اس مقام سے کم یا اس سے زیادہ، دونوں پارلیمانی جمہوریت کے لیے سم قاتل ہیں اور بدقسمتی سے ہم مختلف وجوہ کی بنا پر ایک ایسے نظام کی طرف بہتے چلے گئے ہیں جس میں حقیقی توازن مجروح ہو گیا ہے۔ یہ ایک خاص سمت میں جھک کر کمزور ہو گیا ہے۔ ہم نے یہ بل اس لیے پاس کیا ہے کہ ہم اس توازن کی طرف دوبارہ آنا چاہتے ہیں۔ ابھی اس کی طرف آنے میں وقت لگے گا۔ ہمیں ایک طویل راستہ طے کرنا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہم نے ایک قدم اس طرف اٹھایا ہے۔

اسلام، پارلیمانی جمہوریت اور وفاق، یہ ہمارے دستور کی تین بنیادیں ہیں۔ وفاق کے معنی ہیں "مرکز" اور یہ مرکز پاکستان کی وحدت کی علامت ہے، یہ اس کا نمائندہ ہے۔

صوبے اپنا حق رکھتے ہیں، وہ وفاقی اکائیاں ہیں اور دستور جو خود مختاری انہیں دیتا ہے، وہ لازماً انہیں ملنی چاہیے۔ پارلیمنٹ اور خاص طور پر یہ سینیٹ ان کی محافظ ہے۔ ہمیں افسوس سے یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ وفاق کے اصول کو بھی کمزور کیا گیا ہے اور توازن یہاں بھی بگڑا ہوا ہے۔ اختیارات اور وسائل صوبوں سے مرکز کی طرف (صدر کی طرف) منتقل ہوئے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ جو مقامی حکومتوں کا نظام ہے جسے صوبوں کے تحت ہونا چاہیے، اس کی حیثیت کو مرکزی کر دیا گیا ہے۔ یہ ساری چیزیں دستوری احکام، دفعات اور روح کے خلاف ہیں۔ جناب والا! ان تینوں کا تحفظ ضروری ہے۔ یہ دستور کی بالادستی اور پارلیمنٹ کی بالادستی کے لیے ہے۔ ہماری نگاہ میں ۱۷ویں ترمیم اس جانب ایک قدم ہے۔ لیکن ابھی ہمیں بہت راستہ طے کرنا ہے۔

سویلین بالادستی: جناب والا! دستور کا مزاج اور دستور کے الفاظ دونوں گواہ ہیں کہ پاکستان کی سیاست میں فوج کا ملوث ہونا، اس کی براہ راست مداخلت یا ساز باز، یہ قطعاً غلط ہے۔ ہم نے آج تک اس کا خمیازہ بھگتا ہے۔ ہمیں اس بارے میں یکسو اور یکجا ہونا ہے۔ یہ صحیح جمہوری نظام کے ارتقاء اور اس کو تقویت دینے کے لیے ضروری ہے کہ فوج کو ان حدود کے اندر پابند کیا جائے۔ فوج ہمارے لیے ضروری ہے۔ سلامتی کے لیے ضروری ہے۔ فوج کی جو حقیقی ضروریات ہیں، ان کو پورا ہونا چاہیے۔ سلامتی کے معاملات میں فوج کی جو حقیقی ضروریات ہیں، ان کو پورا ہونا چاہیے۔ سلامتی کے معاملات میں فوج کے نقطۂ نظر کو سمجھنا ضروری ہے لیکن فیصلہ سول حکومت نے کرنا ہے۔ اصل میں وہ ذمہ دار ہے اور فوج اس کے سامنے جواب دہ ہے۔ اس کے برعکس جو بھی صورت حال ہے وہ دو عملی ہے۔ ۱۷ویں ترمیم کے بعد ہم عبوری عرصہ کے لیے اسے برداشت کر رہے ہیں۔ ہم اس عبوری عرصے کو جتنا کم کر سکیں اس کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ یہ وقت کی ضرورت ہے۔ اس وقت ہم نے دسمبر ۲۰۰۴ء کی ایک حد کھینچ دی ہے وہ حتمی حد ہے۔ ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ اس سے جتنا پہلے یہ کام ہو جائے، اچھا ہے تاکہ سول حکومت پورے طریقے سے قائم ہو جائے۔

میں یہاں بھی یاد دلانا چاہتا ہوں کہ مئی ۲۰۰۰ء کے ظفر علی شاہ کیس میں سپریم کورٹ نے ایک جگہ نہیں بلکہ تین جگہ صاف الفاظ میں یہ کہا ہے کہ فوج کو سیاسی بنانا یا آرمی کا سویلین نظام میں کردار غلط ہے اور جمہوریت کے لیے خطرہ ہے اور ہم یہ سب کچھ اس لیے کر رہے ہیں کہ دوبارہ سویلین بالادستی قائم ہو سکے۔ ہم اس سویلین بالادستی کے لیے کام کر رہے ہیں۔

جناب والا! میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ ۱۷ویں ترمیم کے بعد پارلیمنٹ اور وزیر اعظم کے اختیارات تھوڑے سے بہتر ہوں گے۔ ہم نہ کسی تصادم کو پسند کرتے ہیں اور نہ ہی یہ ملک کے لیے مفید ہے لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ پارلیمنٹ سے قائم ہونے والی کابینہ اور اس کا لیڈر پرائم منسٹر، جسے دستور نے اختیارات اور ذمہ داریاں دی ہیں اور قوم اس سے جو توقعات رکھتی ہے، ان کو پورا کرے۔ جہاں تک ایم ایم اے کا تعلق ہے، ہم نے اصولوں کی خاطر، کسی ذاتی یا جماعتی مفاد یا کسی دوسرے سیاسی فائدے کے بغیر یہ تعاون دیا ہے۔ ہمیں اس پر کوئی تحفظات نہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ ترمیم مطلوبہ معیار سے بہت کم معیار پر ہو رہی ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس وقت ملک کو کشمکش سے نکالنا، تصادم سے بچانا اور کوئی ایسی کیفیت، جس میں عوامی احتجاج کے نتیجے کے طور پر فوج اور قوم ایک دوسرے سے صف آراء ہوں، یہ ہمارے ملک کے مفاد میں نہیں ہے، اس لیے ہم نے یہ قربانی اور یہ تعاون دیا ہے۔

حکمران پارٹی اور خاص طور پر وزیر اعظم صاحب سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اب آپ کی ذمہ داری پہلے سے بڑھ گئی ہے۔ اب آپ ایک عظیم آزمائش میں ہیں۔ ہم تو ان شاء اللہ اپوزیشن میں ہی بیٹھیں گے اور اپنا مثبت کردار ادا کریں گے، آپ نے اگر کوئی بھی بات کی تو ہم اس کی تائید کریں گے بلالحاظ اس کے کہ ہماری پارٹی آپ سے مختلف ہے اور ہم اس میں شریک نہیں ہیں۔ لیکن جہاں کہیں آپ الگ راستہ اختیار کریں گے تو ہم آپ کا احتساب اور گرفت کریں گے۔ دستور نے ہمیں جو بھی سیاسی اختیارات دیے ہیں، پارلیمنٹ کے اندر اور باہر ہم ان تمام کو استعمال کریں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ کا اور کنگ ریلیشن شپ صرف

ایم ایم اے سے نہیں، پوری اپوزیشن سے ہو۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ان کا بھی اتنا ہی حق ہے کہ ان کی بات کو سنا جائے، چاہے وہ کتنا بھی اختلاف کریں۔ اگر اختلاف کے اظہار میں وہ کچھ زیادتی بھی کرتے ہیں تو جمہوریت میں ایک دوسرے کو اسی طریقے سے برداشت کیا جاتا ہے، یہ بہت ضروری ہے ہمیں جمہوریت کو آگے لے کر چلنا ہے۔ پارلیمنٹ کو لے کر چلنا ہے تو یہ آپ اچھی طرح سمجھ کر چلیں کہ ہم نے محض پہلا قدم اٹھایا ہے۔ ابھی بہت سے اقدامات ہم نے اٹھانے ہیں۔

آمرانہ حکومت کے جاری کردہ قوانین کی اصلاح: ساتھ ہی میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ جن دو کمیٹیوں کا وعدہ حکومت نے ہم سے کیا ہے ان کا فوری اہتمام کیا جائے۔ ایک کمیٹی پرائم منسٹر کی صدارت میں چھٹے شیڈول کے بارے میں ہے۔ جو قوانین یہاں ہیں اور جن پر صدر کی پہلے اجازت ضروری قرار دی گئی ہے یہ صوبائی حقوق کی خلاف ورزی ہے۔ دستور کی روح اوراس میں دی گئی متفقہ فہرست کی خلاف ورزی ہے۔ اس کمیٹی کو جلد از جلد بلایا جائے، چاروں صوبوں کے وزرائے اعلیٰ بھی اس میں بیٹھیں اور سب مل کر وہ راستہ بنائیں کہ صدر سے بھی ہم بات کر کے جلد از جلد اس صورت حال سے نکلیں۔

ہم دل و جان سے یہ چاہتے ہیں کہ ملک میں مقامی حکومتوں کا نظام صحیح بنیادوں پر قائم ہو، لیکن اسے صوبائی نظام کا ایک حصہ ہونا چاہیے۔ وہ مرکز کا ایک تتمہ اور توسیع نہیں ہو سکتا۔ اگر مرکز نے یا صدر نے کوشش کی کہ اپنے سیاسی مقاصد یا سیاسی تائید حاصل کرنے کے لیے اس نظام کو استعمال کریں تو وہ اس ملک کے ساتھ اور اس دستور کے ساتھ ظلم کریں گے۔ یہ ایک مجرمانہ فعل ہے۔ اس لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم اس کو ایک شکل دے دیں اور وہ کمیٹی جلد کام شروع کرے۔ چھ سال آخری حد ہے۔ جو ہم نے بہر حال مجبوراً تسلیم کی ہے۔ اب ہم چاہیں گے کہ یہ مسئلہ جلد سے جلد طے ہو تا کہ ملک میں جمہوریت کا پودا ٹھیک ٹھیک پنپ سکے۔

دوسری کمیٹی میری نگاہ میں اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ یہ بہت ہی وقیع ذمہ داری

ہے جو پارلیمنٹ نے اپنے اوپر لی ہے۔ ہم نے دل پر جبر کر کے یہ کڑوا گھونٹ پیا ہے کہ ۲۷۰۔اے (اے) کے تحت ان تمام قوانین، آرڈیننسوں اور احکامات اور تقرریوں کی، ایک قسم کی توثیق کر دی جائے جو ایل ایف او کے تحت کی گئی تھیں۔ کمیٹی کے ذریعے ہم نے ان پر نظر ثانی کرنی ہے۔

میں یہاں آپ کو یاد دلاؤں گا کہ عاصمہ جیلانی کیس میں جسٹس یعقوب علی خان کا جو فیصلہ ہے، انہوں نے ایک بڑا لطیف نکتہ اٹھایا ہے اور یہ کہا ہے کہ اس نوعیت کی جو توثیق ہے یہ دراصل توثیق نہیں ہے، یہ معافی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وزیر اعظم اور حکمران پارٹی کے لوگ اس بات کو سامنے رکھیں کہ پارلیمنٹ نے ایک قسم کی معافی دی ہے اور اس کا تقاضا ہے کہ ہم بیٹھ کر ان تمام چیزوں کو از سر نو دیکھیں۔ ساڑھے تین سو کے قریب آرڈیننس ہیں جو اس زمانے میں آئے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں کہ جو اپنا کام ختم کر چکے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں کہ جن کا ہونا ضروری ہے لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جو مخصوص مفادات یا بیرونی مطالبوں کی وجہ سے، یا غلط پالیسیوں کی بنا پر اختیار کر لیے گئے ہیں۔ ہم انہیں معاف کر رہے ہیں لیکن جلد از جلد ان پر نظر ثانی کرنا اور دوبارہ جائزہ لینا ناگزیر ہے۔ ان میں جو صحیح ہیں ان کو باقی رکھیں، جو غلط ہیں ان کی اصلاح کی جائے۔ یہی کام پارلیمنٹ کا ہے کہ ہم اس کے بعد قانون سازی اور ترمیم کے ذریعے، ان تمام چیزوں کی اصلاح کریں تاکہ ہم جمہوریت کے راستے پر آسکیں۔

اراکین پارلیمنٹ کی ذمہ داری: جناب والا! اس ملک میں جمہوریت کا پودا اگر پنپ نہیں سکا تو اور چیزوں کے علاوہ اس کی بڑی ذمہ داری خود پارلیمنٹ، پارلیمنٹ کے ارکان، حکومت اور انتظامیہ پر آتی ہے۔ بلاشبہ شکار کے لیے لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپ اگر کمزوری دکھائیں گے تو وہ ضرور اپنا کام کر جائیں گے لیکن اگر آپ مضبوط ہوں گے اور اپنی ذمہ داری ادا کریں گے تو کسی کو ہمت نہیں ہو گی۔

جمہوری نظام کی اصل طاقت پارلیمنٹ کے اجلاس میں ہے کہ یہاں جمہوری نمائندے اپنی ذمہ داریاں کس طرح ادا کرتے ہیں۔ میں پہلے بھی بارہ سال اس ایوان کا رکن

رہا ہوں اور مجھے دکھ سے یہ بات کہنی پڑتی ہے کہ اس حوالہ سے اس وقت ہماری کارکردگی بہت خراب رہی ہے، کیا یہ ایک حقیقت نہیں ہے کہ ہم محض قانونی تقاضوں کی وجہ سے ۹۰ دن پورے کرنے کے لیے ملتے رہے۔ ان میں سے بھی کتنے دن ہم نے کام کیا ہے۔ کیا یہ ایک حقیقت نہیں ہے کہ نصف کے قریب اراکین ایسے ہیں جو چھ سال کی اپنی پوری مدت میں شاید ایک بار بھی نہ بولے ہوں۔ جناب والا! ہم یہاں آئے ہیں، ہمیں اپنی ذمہ داری ادا کرنی چاہیے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم پارلیمنٹ کے اجلاسوں میں کمیٹیوں کے اندر، ٹاسک فورس کے اندر ہوم ورک کر کے قانون سازی اور پالیسی سازی کے لیے اور سوالات اور مختلف قسم کی تحاریک کے لیے، اپنا وقت صرف کریں۔ ایک طرف اپنے حلقہ انتخاب کا حق ادا کریں لیکن دوسری طرف پارلیمنٹ کا بھی ہم کام کریں تاکہ یہ سارے مقاصد پورے ہو سکیں۔

دستور کے رہنما اصول: دستور کے آرٹیکل ۲ اور ۳ کے اندر کہا گیا تھا کہ سات سال کے اندر اندر تمام ملکی قوانین کو قرآن و سنت کے احکام کے مطابق ڈھال دیا جائے گا۔ اس دستور کو بنے ہوئے آج کتنا عرصہ ہو چکا ہے، پارلیمنٹ نے کیا کام کیا ہے؟ اسلامی نظریاتی کونسل نے ۴۰ سے زیادہ رپورٹیں بھیجیں، ۱۹۹۷ء تک کی بات کر رہا ہوں، اس کے بعد بھی لازماً آئی ہوں گی، ان ۴۱ رپورٹوں میں سے کسی ایک رپورٹ پر بھی نہ قومی اسمبلی نے، نہ سینیٹ نے بحث کر کے قانون سازی یا پالیسی کے لیے رہنمائی لی ہے۔ ریاستی پالیسی کے رہنما اصول آپ کے دستور کا حصہ ہیں، اس میں لکھا ہوا ہے کہ یہ رپورٹ پارلیمنٹ کے سامنے آنی چاہیے۔ ان رہنما اصولوں پر کام کرنے کے لیے حکومت نے کیا کیا ہے تاکہ پارلیمنٹ ان پر غور کرے اور یہ بتائے کہ آگے کیا کام کرنے کی ضرورت ہے، ہم نے کیا کیا ہے؟

میں کس کس چیز کا نام لوں، پبلک اکاؤنٹس کمیٹی میں ہمیں اپنی ذمہ داری پوری کرنی چاہیے۔ مجھے یاد ہے کہ آٹھویں ترمیم کے موقع پر بھی ہم نے اسی قسم کا ایک عہد نامہ کیا تھا اور وہ عہد نامہ یہ تھا کہ ہم آٹھویں ترمیم پاس کر رہے ہیں لیکن چھ مہینے کے اندر اندر ایک کمیٹی بنائی جائے گی جو نویں ترمیم کا خاکہ پیش کرے گی اور اس نویں ترمیم کے اندر تین چیزیں

رکھی گئی تھیں۔ پہلی قرآن وسنت کی بالادستی، دوسری یہی جو ہم نے آج کی ہے کہ ماضی کے جتنے بھی قوانین ہیں ان کو نظر ثانی کر کے یہ دیکھنا کہ دستور میں کون سے بگاڑ آ گئے ہیں، انہیں ہم کس طرح دور کریں اور تیسری چیز، باقی تمام احکامات اور آرڈیننس جو تھے، ان پر نظر ثانی کی جائے۔ مجھے دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ کمیٹی بنی ضرور، لیکن اس کمیٹی نے کوئی کام کر کے نہیں دیا۔ میں نہیں چاہتا کہ ہم ان چیزوں کو دہرائیں۔ ہم نے ایک بار پھر آپ (حکومت) پر اعتماد کیا ہے۔ ہم نے آپ پر بھروسہ کیا ہے کہ آپ وہ کمیٹی بنائیں گے اور وہ کمیٹی کام کرے گی۔ میں چاہتا ہوں کہ کمیٹی کام کرے تاکہ قوم کے سامنے ساری تفصیلات بھی آئیں اور ہم تفصیلی جائزہ لے کر اپنے گھر کے نظام کو ٹھیک کر لیں۔

جناب والا! یہ وہ ساری چیزیں ہیں جو کرنے کی ہیں۔ ہم قدم آگے بڑھا رہے ہیں کہ ۱۷ویں آئینی ترمیم جمہوریت کی طرف ایک قدم ہے لیکن ابھی ہم نے بہت سا کام آگے کرنا ہے۔ آیئے! مل جل کر اس کام کو انجام دیں۔

(۳۰ دسمبر ۲۰۰۳ء)

قومی سلامتی کونسل: ضرورت، ساخت اور آئینی حیثیت

(۱۷ویں آئینی ترمیم اور قومی سلامتی کونسل کے بل ۲۰۰۴ء کے تناظر میں بحث)

آئین پاکستان میں ۱۷ویں ترمیم کے پس منظر پر گذشتہ باب میں بحث ہوئی ہے۔ اس ترمیم کے تحت طے ہو گیا تھا کہ صدر جنرل مشرف کے ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء سے ۲۰۰۲ء تک جاری کیے گئے (منتخب) احکامات اور قوانین کو سند جواز عطا کیا جائے گا لیکن یہ بات واضح کی گئی تھی کہ قومی سلامتی کونسل کو کوئی تحفظ نہیں دیا جائے گا کیونکہ اس کے ذریعہ فوج کے لیے سیاست میں مداخلت کا راستہ نکلتا تھا۔

اس موقع پر یہ بات بھی طے پا گئی کہ صدر کی دوسری مدت کے لیے ایک ہی الیکٹورل کالج سے دوسری بار اعتماد کا ووٹ لینے کے لیے آئینی ترمیم کی جائے گی جبکہ صدر کو چیف آف آرمی سٹاف کی وردی اتارنے یعنی صدارت کے علاوہ دوسرے عہدے سے ہٹنے کے لیے ۳۱ دسمبر ۲۰۰۴ء تک مہلت دی گئی۔ یہ بھی واضح کیا گیا کہ اس تاریخ کے بعد آئین کی شق ۶۳(۱)ڈی قابل عمل ہو جائے گی جس کے تحت صدر کوئی اضافی منفعت بخش عہدہ نہیں رکھ سکتا۔

تاہم ۱۷ویں ترمیم کی منظوری کے بعد حکومت نے معاہدہ کے مطابق عمل کرنے کی بجائے قومی سلامتی کونسل کا بل اکثریت کی بنیاد پر قومی اسمبلی سے منظور کرا لیا۔ یہی بل ۱۳ اپریل ۲۰۰۴ء کو سینیٹ آف پاکستان میں منظوری کے لیے پیش کیا گیا۔ آنے والے صفحات میں شامل پروفیسر خورشید کی پہلی تقریر اس موقع پر کی گئی جس میں انہوں نے معاہدہ کا پس منظر اور معاہدہ کے موقع پر ہونے والی افہام و تفہیم کی تفصیلات بیان کیں اور واضح کیا کہ حکومت جو قانون سازی کر رہی ہے وہ دستور اور ۱۷ویں ترمیم کے موقع پر ہونے والے معاہدہ کے بھی خلاف ہے۔

اس کے باوجود حکومت نے سینیٹ میں اپنی اکثریت کے بل پر قومی سلامتی کونسل کا قانون منظور کر لیا۔ اس قانون کے تحت پاکستان کے پارلیمانی وفاقی آئین کے بر خلاف آئین پر عملدرآمد میں بنیادی تبدیلیاں وجود میں آ گئیں جس کے تحت صدر کے اختیارات کی نئی حدود

تخلیق ہوئیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ حکومتی اختیارات حکومت اور وزیر اعظم سے نکل کر صدر کی جانب چلے گئے جو پاکستان کے آئین کے بنیادی ڈھانچے سے متصادم تھا۔ اسی قانون کے تحت سلامتی کونسل میں مسلح افواج کے سربراہان کی موجودگی سے سیاست میں فوج کا ادارتی کردار وجود میں آیا جو آئین پاکستان کی خلاف ورزی تھا۔

دستور کی اس خلاف ورزی کے تناظر میں پروفیسر خورشید احمد نے ۵ مئی ۲۰۰۴ء کو قومی سلامتی کونسل کے قانون کے اثرات پر بحث کرنے کے لیے ایک تحریک پیش کی۔ اس تحریک کے تعارف میں انہوں نے تفصیل سے ان وجوہات کا احاطہ کیا تاہم سینیٹ میں تحریک کی حمایت میں مطلوبہ ووٹ نہ ملنے کے سبب تحریک پر بحث نہیں ہو سکی زیر نظر تحریروں میں سے دوسری تحریر ان کی اس موقع پر کی گئی تقریر پر مبنی ہے۔

دو سال بعد ۱۵ مئی ۲۰۰۶ء کو پروفیسر خورشید احمد نے قومی سلامتی کونسل ایکٹ میں ایک ترمیمی بل پیش کیا جس میں انہوں نے دستور کی اس مسلسل خلاف ورزی کو ختم کرنے کے لیے تجویز دی کہ سلامتی کونسل وزیر اعظم کی سربراہی میں قائم کی جائے اور اس ادارے کی رکنیت سے مسلح افواج کے سربراہان کو نکالا جائے البتہ جب بھی کبھی ضرورت ہو تو مشورے کے لیے جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کے چیئرمین کو بلایا جاسکتا ہے۔ اس ترمیم کا مقصد بھی حسب سابق سیاست سے فوج کے کردار کا خاتمہ کرنا، وزیر اعظم کے اختیارات کی بحالی، پارلیمان کی بالادستی کی بحالی اور دنیا بھر میں پاکستان کے جمہوری تصور کو بہتر کرنا تھا۔ زیر نظر سلسلہ تحریر میں تیسرا جزو اس موقع پر کی گئی تقریر پر مبنی ہے۔

پس منظر کے طور پر یہ بات بھی سامنے رہنا ضروری ہے کہ پروفیسر خورشید احمد سے قبل قائد ایوان وسیم سجاد نے اپنی تقریر میں قومی سلامتی کونسل بل کو پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس طرح کی کونسل دنیا کے کئی ممالک میں موجود ہیں۔ نیز یہ کہ پاکستان کو بھی ہمیشہ سے سلامتی کے خدشات رہے ہیں جن سے نمٹنے کے لیے یہ کونسل قائم کی جارہی ہے۔ ساتھ ہی ان کا کہنا تھا اس کونسل میں اکثریت منتخب نمائندوں پر مشتمل ہے۔ وسیم سجاد کی اس گفتگو کے جواب میں پروفیسر خورشید سے قبل رضا ربانی نے بھی تقریر کی تھی۔

جناب چیئرمین! میرے ساتھی رضا ربانی نے اپنا کیس بڑے مضبوط دلائل کے ساتھ

پیش کیا ہے۔ ان سے قبل جناب وسیم سجاد نے، جو بڑے اچھے وکیل ہیں اور مجھے پتہ ہے کہ ایک اچھا وکیل ایک کمزور مقدمے کو بھی مؤثر انداز میں پیش کر سکتا ہے، نے ایک بڑی ہی ناقص قانون سازی کی بڑی مؤثر اور جاندار وکالت کی ہے۔ میں سب سے پہلے جس بات پر میرا اور ان کا اتفاق ہے، اسے بیان کروں گا۔

میں ان کی اس بات کو تسلیم کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ یہ ریکارڈ کا حصہ بن جائے کہ قانون کا مسلمہ اصول ہے کہ کوئی زیریں قانون بالائی قانون کو تبدیل نہیں کر سکتا۔ اس پہلو سے یہ بات درست ہے کہ اگر خدانخواستہ یہ قانون پاس بھی ہو جاتا ہے، تب بھی یہ دستور کو مسترد نہیں کر سکتا۔ لیکن میں یہ ضرور بتاؤں گا کہ یہ کس طرح دستور کے خلاف ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اکثریت کی بنیاد پر ایک بُرا قانون پاس کیا جا سکتا ہے اور اس میں بڑے موٹے موٹے قانونی سقم بھی ہو سکتے ہیں، لیکن مجھے توقع ہے کہ بالآخر اس ملک کی عدالتیں آزاد ہیں اور دستور کا احترام کیا جائے تو ایسے قانون یا اس کے ناقص حصوں کو وہ کالعدم قرار دے دیں گی۔ یہاں میرا اور ان کا پورا پورا اتفاق ہے۔ میں یہی سمجھتا ہوں کہ ہم زیریں قانون سازی کے ذریعے سے ایک ایسا کام کرنے جا رہے ہیں، جو صرف آئین میں ترمیم کے ذریعے ہی کیا جا سکتا ہے۔

آج نہیں، ہم نے ۱۹۸۵ء میں بھی، اور پھر آج کے اس ایوان میں بھی ڈٹ کر یہ لڑائی لڑی کہ قومی سلامتی کونسل کا کوئی آئینی مقام نہیں ہو سکتا اور الحمدللہ ہم اس کو دونوں بار آئین پر مسلط کیے جانے کے بعد، اس سے نکلوانے میں کامیاب ہوئے۔ پہلے جنرل ضیاءالحق نے ۱۹۸۵ء میں یہ کام کیا، پارلیمنٹ نے اسے رد کیا اور انہیں آٹھویں ترمیم کے موقع پر مجوزہ دستوری ترمیم واپس لینی پڑی۔ اس کے بعد پھر ایک منتخب صدر نے درمیانی مدت میں اسے قائم کرنے کی ناکام کوشش کی۔ پھر جنرل پرویز مشرف نے یہ کام کرنا چاہا لیکن اس ایوان اور اس پارلیمنٹ نے واضح کر دیا کہ نہیں، ہم آئین کی یہ بدصورتی اور کانٹ چھانٹ قبول کرنے کو تیار نہیں۔ اب وہی کام ایک زیریں قانون کے ذریعے سے بالا قانون کو

تبدیل کر کے کیا جارہا ہے جناب وسیم سجاد اور ہمارے درمیان اس معاملے میں کوئی اختلاف نہیں کہ زیریں قانون یہ کام انجام نہیں دے سکتا۔

مختلف ملکوں میں قومی سلامتی کونسل کے قیام کا پس منظر

جناب والا! ہر قانون اور تجویز کا ایک پس منظر ہوتا ہے۔ ایک اس کے الفاظ ہیں، ایک اس کا پس منظر ہے۔ میں اس سے واقف ہوں کہ قومی سلامتی کونسل دنیا میں اس وقت کم از کم ۱۲۰ ممالک میں موجود ہے۔ ہر جگہ اس کا اپنا اپنا مقام ہے، کہیں وہ آئین کے ذریعے سے آئی ہے جیسا کہ ترکی، برازیل، ارجنٹائن اور چلی میں ہے۔ کچھ ممالک میں وہ پارلیمنٹ کے قانون کے ذریعے سے آئی ہے جیسا کہ فرانس اور امریکہ میں کچھ مقامات پر وہ صرف انتظامی حکم کے ذریعے وجود میں آئی ہے جیسا کہ بھارت میں ہے تو ہر ایک کا اپنا اپنا پس منظر ہوتا ہے۔

چونکہ امریکہ کا ذکر بار بار کیا جاتا ہے، مجھے اجازت دیں کہ چند جملے میں امریکہ کی قومی سلامتی کونسل کے بارے میں عرض کروں، جو ۱۹۴۷ء کے قانون کے تحت وجود میں آئی ہے۔ اس کا پس منظر ایک امریکی ماہر قانون نے اپنی کتاب میں بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ وہ پس منظر یہ تھا کہ دوسری جنگ عظیم کے دوران امریکہ کی دوسو سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ امریکی فوج کا صدر سے براہ راست رابطہ قائم ہوا۔ یہ رابطہ نہ صرف جوائنٹ چیفس کی سطح پر ہوا، بلکہ تمام افواج کے سربراہوں کے ساتھ ہوا۔ چونکہ جنگ کا زمانہ تھا اس بناء پر فوج سیاست میں ایسے شامل ہوگئی، جس کا آئین میں کہیں ذکر نہ تھا اور نہ ہی امریکہ کی جمہوری روایات میں اس کی کوئی گنجائش تھی۔

یہ تھا وہ پس منظر جس میں سول گورنمنٹ نے فوج کو اپنی حد میں رکھنے کے لیے قومی سلامتی کونسل قائم کی۔ اگر آپ اس زمانے کی دوسال کے دوران ہونے والی بحثیں پڑھیں، تو ایک ایک اختیار کے لیے لڑائی ہوئی ہے اور اس کے نتیجے کے طور پر اس قانون کے ذریعے

سے فوج کا صدر امریکہ سے براہ راست رابطہ ختم کیا گیا۔ حالانکہ صدر امریکہ مسلح افواج کا سپریم کمانڈر ہے، لیکن طے کیا گیا کہ براہ راست نہیں بلکہ فوج سویلین چینل کے ذریعے صدر سے رابطہ میں ہوگی۔ اس سویلین چینل میں سیکرٹری دفاع کے بارے میں بڑی بحث ہوئی ہے کہ اس کو فوجی ہونا چاہیے لیکن امریکا میں طے کیا گیا کہ نہیں سیکرٹری دفاع سویلین ہونا چاہیے اور یہ سویلین سیکرٹری دفاع ہی ڈیفنس کمیٹی کی سربراہی کرے، جوائنٹ چیفس اور سروسز چیف اس کے ماتحت ہوں گے۔ سلامتی کونسل میں تمام ارکان سویلین ہیں، جو صدر امریکہ کو مشورہ دیتے ہیں اور ایک قومی سلامتی کا مشیر ہوتا ہے، جو اس میں رابطے کا کام انجام دیتا ہے۔

یہ اقدام دراصل فوج سے اختیارات کو، جو عملاً صورتحال پیدا ہوگئی تھی، واپس لینے کے لیے کیا گیا۔ اختیارات کم کرنے کے لیے ہی دوسری بات یہ کی گئی کہ فوج کے پاس انٹیلی جنس کی ساری قوت تھی، اسی قانون کے تحت طے کیا گیا کہ سی آئی اے فوج کے تحت نہیں ہوگی بلکہ وہ قومی سلامتی کونسل کے تحت ہوگی۔ قومی سلامتی کونسل میں صرف جوائنٹ چیفس بطور فوجی مشیر کے بلایا جائے گا، اس کی حیثیت ممبر کی نہیں ہوگی۔ پھر اس بات پر بڑی لڑائی ہوئی کہ فوج کا بجٹ آزاد رہے، لیکن پراکٹر جنرل کا عہدہ قائم کیا گیا تاکہ فوج کا بجٹ بھی سویلین کے تحت آجائے۔ پھر فوج کو یہ کہا گیا کہ وہ جوابدہ ہوگی، سینیٹ اور کانگریس کی پارلیمانی کمیٹی کے سامنے آکر اپنے معاملات کو واضح کرنے کے لیے۔ آخری سب سے زیادہ لڑائی اٹامک انرجی کمیشن پر ہوئی جو پہلے فوج کے تحت تھا لیکن اس کو بھی سویلین ماتحتی میں لیا گیا۔

اگر آپ پس منظر دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہاں پر قومی سلامتی کونسل فوج کی دراندازی سے بچنے اور روکنے کے لیے ہے، قانونی راستہ اختیار کرکے فوج کے کردار کو محدود کیا گیا اور اس پر سویلین کمانڈ قائم کی گئی۔

اس کے برعکس ترکی کی صورت حال یہ ہے کہ وہاں فوج نے سویلین پر اپنے آپ کو مسلط کرنے کے لیے آئین میں یہ تبدیلی کروائی ہے۔ جناب والا! اس دستوری ترمیم، جو کہ

ترکی کے دستور کا آرٹیکل ۱۸ ہے، کے ہونے کے بعد بھی تین بار قانونی مارشل لاء لگا ہے اور ایک بار ۱۹۹۲۔۱۹۹۷ء میں حاضر وزیر اعظم نجم الدین اربکان کو فوج نے حکومت سے نکالا ہے۔ اس لیے ایسا نہیں کہ ایسی کسی کونسل کی موجودگی کی وجہ سے فوجی مداخلت رک جاتی ہے۔

پاکستان کی صورتحال

ہمارے ملک کی صورتحال یہی ہے، ہمارے ہاں دراصل مرکزی مسئلے دو ہیں۔ پہلا یہ ہے کہ فوج کا کردار سیاست میں کیا ہو، ہو یا نہ ہو۔ دوسرا فوج سول نظام کے تابع ہے یا فوج کو یہ اختیار ہے کہ وہ اس نظام میں ایک کھلاڑی کی حیثیت سے شریک ہو، فیصلوں میں اور مشوروں میں شریک ہو۔ یہ ہیں دو مسئلے اور ان دو مسائل کے حوالے سے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔

مجھے سینیٹر رضا ربانی کی بات سے سو فیصدی اتفاق ہے کہ دستور نے فوج کے کردار کو بالکل واضح کر دیا ہے، سب سے پہلے آرٹیکل ۲۴۳ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ وفاقی حکومت کا مسلح افواج پر کنٹرول اور کمانڈ ہو گا۔ پھر آرٹیکل ۲۴۴ ہے، اس کے تحت فوج سے یہ عہد لیا گیا ہے کہ وہ سیاست کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کریں گے، کوئی مداخلت نہیں کریں گے، کوئی پوزیشن اختیار نہیں کریں گے۔ انہیں ووٹ دینے کا حق ضرور ہے لیکن فوج کا پیشہ اختیار کرنے کے بعد فوج کی سیاست سے دوری دستور کا تقاضا ہے۔ تیسری چیز آرٹیکل ۲۴۵ ہے جس میں فوج کے دو کردار مقرر کر لیے گئے ہیں کہ سویلین نظام کے تحت ملک کے دفاع اور اندرونی انتشار میں حکومت کے بلانے پر حکومت کی مدد کرے گی۔ اس کے علاوہ فوج کا کوئی اور کردار نہیں ہے۔

یہ بات بالکل درست ہے کہ ملک کی سلامتی کے لیے فوج کی ضرورتوں کو پورا ہونا چاہیے، یہ بات بالکل صحیح ہے کہ سلامتی کے معاملات میں ان سے مشورہ ہونا چاہیے۔ اس کے لیے ہم نے پہلے ہی ادارے قائم کیے ہوئے ہیں، ایک ہے کابینہ کی دفاعی کمیٹی، جو اس

مقصد کے لیے ہے کہ فوجی قیادت اور سیاسی قیادت مل کر بیٹھے اور سیکورٹی کے معاملات میں ایک دوسرے کی رائے کو جانے۔ نئے ادارے وہاں بناتے ہیں، جہاں ادارے موجود نہ ہوں۔ جہاں موجود ہوں، وہاں اضافہ نہیں کیا جاتا۔ دوسری ضرورت اس بات کی بھی تھی کہ تمام سروسز کے درمیان رابطہ ہو۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ کے بعد یہ بات سامنے آئی کہ بحریہ، فضائیہ اور بری فوج کا باہمی رابطہ نہیں تھا۔ اس لیے اس کے بعد چیئرمین جوائنٹ چیفس آف اسٹاف کمیٹی کا عہدہ تخلیق کیا گیا۔ اب یہ چیئرمین کی ذمہ داری ہے کہ وہ تینوں افواج کو بھی مربوط کرے اور وہی ان کے درمیان رابطہ بھی ہے۔ فوج کی تشویش، فوج کی ضرورتوں، سیکورٹی کے معاملات میں فوج کی آراء، فوج کے مشوروں کا سول نظام تک پہنچانا، اس کے لیے مشترکہ دفاعی کمیٹی موجود ہے، اس میں سروسز چیف اور چیئرمین جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی دونوں کی موجودگی ہے تو ادارے پہلے ہی موجود ہیں۔ ان اداروں کی موجودگی میں اس تجویز کو دوبارہ لانا، اس کا خاص پس منظر ہے، جس کو جنرل مشرف نے بار بار کہا ہے، وہ یہ ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ اس طرح مارشل لاء نہ آئے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ دراصل وہ اس طریقے سے سیاست میں ایک دائمی مارشل لاء یعنی فوج کا ایک مستقل قانونی کردار پیدا کر رہے ہیں اور یہ دستور کے لیے اور ملک کے لیے ہی نہیں فوج کے لیے بھی بہت ہی خطرناک ہے۔

آئین کی اکھاڑ پچھاڑ

میں سب سے زیادہ زور دے کر یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ آج جمہوریت کو جہاں سیاستدانوں اور سیاسی پارٹیوں سے خطرات ہیں وہیں ہمیں اس بات سے انکار نہیں کرنا چاہیے کہ اس ملک میں جمہوریت کو سب سے بڑا خطرہ فوجی مداخلت سے ہوا ہے، یہ بھی سمجھنا چاہیے سیکورٹی کا اندرونی خطرہ جمہوریت کی اکھاڑ پچھاڑ سے ہوتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ آپ جمہوری اداروں میں فوج کو بے جا مداخلت سے روکیں۔ اسی لیے دستور میں آرٹیکل ۶ آیا کہ دستور کی اکھاڑ پچھاڑ، اس کو معطل کرنا اور اسے جانتے ہوئے مارشل لاء لگانا ایک بغاوت ہے،

لیکن دستور کی اس دفعہ کو ہم نے عملاً نافذ نہیں کیا ہے۔ ہم اس کو مسلسل نظر انداز کر رہے ہیں۔ اس لیے میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ ملک کی سلامتی کے لیے فوج کا غیر سیاسی اور غیر متنازعہ ہونا ضروری ہے۔ جس ملک میں فوج متنازعہ ہوئی ہے یا اس نے سیاست میں مداخلت کی ہے وہاں فوج بھی تباہ ہوئی ہے اور ملک بھی تباہ ہوا ہے۔ اگر آپ امریکہ کے اہم تھنک ٹینک Center for Strategic and International Studies کے لنڈسے شیفرڈ (Lindsey Sheppard) کی رپورٹ پڑھیں، اس نے صاف الفاظ میں یہ بات کہی ہے کہ پاکستان میں فوج کی بار بار مداخلت جمہوریت کو کمزور کرنے اور بگاڑنے کا ذریعہ ہے اور انہیں خطرہ ہے کہ آئندہ اس قسم کے قوانین کے ذریعے سے ادارتی اور تزویراتی خرابی آئے گی۔ میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ اس پورے پس منظر کو کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

دوسری چیز جو جائز ہے اور جس کی طرف وسیم سجاد صاحب نے اشارہ کیا ہے، میں بھی اس کا قائل ہوں اور وہ یہ ہے کہ جو ارتباطی (Coordination) ڈھانچہ ہمارے ہاں موجود ہے، اس کو مزید مؤثر کرنے کی ضرورت ہے۔ البتہ سوال یہ ہے کہ وہ کیسے کیا جاسکتا ہے۔ میں جب اس قانون میں تفصیلی ترامیم پیش کروں گا تو اس میں یہ دکھاؤں گا کہ ایسی قومی سلامتی کونسل پاکستان میں ہوسکتی ہے جو ۱۰۰ فیصد سویلین ہو اور جو پارلیمنٹ کے دیے ہوئے کردار اور رول کے مطابق فرائض انجام دے۔ اس کا کام یہ ہوگا کہ مختلف شعبوں میں رابطہ کرے اور سب سے اہم یہ اہتمام کرے کہ تزویراتی تجزیہ و تحقیق ہو تاکہ صحیح معلومات اور اطلاعات آسکیں اور ان معلومات کی صحیح معنوں میں تعبیر ہو سکے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ بھارت نے یہی کیا ہے، بھارت میں قائد حزب اختلاف اسی لیے اس کا حصہ ہے۔ بھارت میں ایک ادارہ ایسا بنایا گیا ہے جس کے تحت تین کمیٹیاں ہیں اور ہر کمیٹی کا خاص میدان ہے، ایک تزویراتی تجزیہ کے لیے ہے، اور بقیہ دو معیشت اور دوسرے معاملات کے لیے ہیں۔ کمیٹیاں تحقیق کرتی ہیں، مسلسل تحقیق کرتی ہیں، انٹیلی جنس معلومات کا تجزیہ کرتی

ہیں اور پھر رپورٹیں تیار کرتی ہیں۔ بھارت میں جب کبھی کوئی اہم موقع آیا ہے قائد ایوان نے قائد حزب اختلاف سے مشورہ کیا ہے، خواہ وہ پاکستان سے مذاکرات ہوں یا کوئی اور معاملات ہوں، ان کا اپنا نظام ہے۔ ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر ایک ادارہ بنایا جاسکتا ہے۔

جناب والا! اب میں تین چیلنجز گنوانا چاہتا ہوں۔ ان میں سے دو وہ ہیں جو جناب وسیم سجاد کے دلائل سے ابھرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ دستور کا جو ڈھانچہ ہے، وہ اس سے متاثر نہیں ہوتا۔ دوسرا یہ ہے کہ اس میں کوئی نیا اختیار، کوئی نئی حدود قائم نہیں کی گئی، یہ دونوں قانونی نکات ہیں، بڑے اچھے نکات ہیں لیکن میں جناب وسیم سجاد سے اور اس ایوان سے کہوں گا کہ ذرا غور کریں کہ کیا فی الحقیقت جو دعویٰ انہوں نے کیا ہے وہ صحیح ہے یا غلط ہے۔

تیسری چیز یہ ہے کہ صدر کا اس دستور میں کیا مقام ہے۔ پارلیمانی نظام ایک مخصوص سسٹم کا نام ہے۔ صدارتی نظام کا اپنا ڈھانچہ ہوتا ہے اور پارلیمانی نظام کا اپنا ڈھانچہ ہوتا ہے۔ ہم نے بڑی بحث اور بڑے تجربات کے بعد ایوب خان کے زمانے میں صدارتی نظام بھی چلایا ہے۔ اس بنیاد پر ۱۹۶۲ء کا دستور بنایا لیکن اس کے بعد آپ کو یاد دلاتا ہوں کہ ۱۹۷۲ء کا جو عبوری دستور اور مجوزہ دستور تھا، اس میں صدارتی نظام رکھا گیا تھا تاہم ۱۹۷۳ء کے دستور میں قومی اسمبلی نے بڑی بحث کے بعد جس نظام کو اختیار کیا اس کی تین اہم بنیادیں ہیں جن میں اس کا پارلیمانی ہونا، وفاقی نظام اور اس کی اسلامی دفعات شامل ہیں۔

صدر کے اختیارات اور دائرہ کار: پارلیمانی نظام میں صدر اتحاد کی علامت ہوتا ہے لیکن وہ منتظم اعلیٰ نہیں ہوتا۔ وہ پالیسی سازی کا مرکز اور منبع نہیں ہوتا۔ یہ مقام اسے نہیں دیا جاتا اور یہی وجہ ہے کہ (۱۹۷۳ء کے) اصل دستور میں کوئی صوابدیدی اختیار صدر کو حاصل نہیں تھا۔ مجھے اعتراف ہے کہ آرٹیکل ۸۵ (آٹھویں ترمیم) میں ایسا ہوا اور پھر اب (۱۷ویں ترمیم میں) صدر کو بعض معاملات میں صوابدیدی اختیار دیا گیا ہے یا بحال کیا گیا ہے۔ اصولاً میری نگاہ میں یہ غلط ہے۔ لیکن صرف بحث کی خاطر دستور میں جہاں اور جس شکل میں صوابدیدی اختیار دے دیا گیا ہے، چاہے اس سے دستور میں جو بھی بگاڑ پیدا ہو گیا ہے، وہ اس وقت ہمارے

دستور کا حصہ ہے۔ جب تک اسے پارلیمنٹ تبدیل نہ کرے، وہ دستور کا حصہ رہے گا۔ لیکن اس سے ہٹ کر کوئی اختیار دینا اس سے ہٹ کر کوئی چیز متصور کرنا، یہ دستور کے خلاف ہے۔

میں بتانا چاہتا ہوں کہ اس صوابدیدی اختیار کے بعد بھی صدر کی دستور کے تحت یہ پوزیشن ہے کہ کابینہ اصل پالیسی ساز ادارہ ہے اور صدر کابینہ کے مشورے کا پابند ہے، سوائے ان معاملات کے جہاں اس کی صوابدید ہے۔ کابینہ کے مشورے پر اس کے لیے چلنا ضروری ہے۔ اس میں یہ حق دیا گیا ہے کہ وزیر اعظم کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اسے (صدر کو) مطلع رکھے۔ صدر کو یہ اختیار ہے کہ وہ وزیر اعظم کو کابینہ میں زیر غور لانے کے لیے کوئی بات کہے۔ صدر کو یہ اختیار ہے کہ کابینہ کے کسی فیصلہ کے بارے میں اگر اس کے کوئی تحفظات ہوں تو کابینہ کو واپس بھیج سکتا ہے، لیکن کابینہ جب کوئی بات طے کرے تو اس کے مطابق اقدامات صدر پر لازم ہیں۔ حکومتی فیصلہ سازی کا اصل ادارہ کابینہ ہے۔ پارلیمانی نظام میں اسے گورنمنٹ اسی لیے کہتے ہیں۔ سر چارلس ہاورڈ میکلوین (Sir Charles Howard Mcllwain) کی کتاب The American Revolution: A Constitutional Interpretation اٹھا کر دیکھ لیجیے کہ کابینہ ہی اصل گورنمنٹ ہے اور پاکستان کے دستور میں تو یہ بات صاف رکھی گئی ہے کہ:

> دفعہ ۴۸(۱): اپنے کارہائے منصبی کی انجام دہی میں صدر کابینہ یا وزیر اعظم کے مشورے کی مطابقت میں عمل کرے گا۔

دوسری بات یہ ہے کہ صدر کو یہ اختیار ہے کہ وہ دونوں ایوانوں سے خطاب کر سکتا ہے، ان کو پیغام بھیج سکتا ہے۔ صدر کو یہ اختیار ہے کہ وہ غیر مالیاتی بل کو نظر ثانی کرنے کے لیے بھیج سکتا ہے، لیکن کوئی بھی بل، اگر پارلیمنٹ اسے نظر ثانی کے بعد منظور کر لیتی ہے تو صدر اس کو ماننے کے لیے مجبور ہے۔ یہ آپ کے دستور کا ڈھانچہ ہے۔ اس ڈھانچے میں صدر مشترکہ اجلاس کی صدارت بھی نہیں کرتا۔ صدر کسی دستوری و قانونی یا تزویراتی ادارے کی سربراہی نہیں کرتا۔ وہ مشورہ دے سکتا ہے۔ یہ ہمارے دستور کی بڑی اہم خصوصیت ہے۔

آپ دیکھیں کہ مشترکہ اجلاس کو اسپیکر اور چیئرمین سینیٹ کنڈکٹ کرتے ہیں۔ صدر خطاب کر سکتا ہے لیکن صدارت نہیں کر سکتا۔ کابینہ کی سربراہی وزیر اعظم کرتا ہے، صدر کابینہ کو مشورہ دے سکتا ہے لیکن صدارت نہیں کر سکتا۔ جبکہ اب آپ ایک ایسا ادارہ تخلیق کرنا چاہ رہے ہیں جس کا چیئرمین صدر ہو گا۔ یہ دستور کی پوری سکیم 'کابینہ گورنمنٹ' کے پورے تصور کے خلاف ہے۔ یہ آپ ایک زیریں قانون سازی کے ذریعے سے اختیار کی نئی حدود تخلیق کر رہے ہیں جس کا کوئی مقام نہیں۔

اس ضمن میں آپ یہ دیکھیں کہ دستور نے واضح کر دیا ہے کہ سوائے ان مقامات کے جہاں صدر کو صوابدید حاصل ہے، صدر کابینہ کے مشورے پر کام کرنے کے لیے پابند ہے۔ صدر کو کوئی بھی صوابدید صرف دستور دے سکتا ہے اور دستور میں وہ چار یا پانچ مقامات واضح ہیں جہاں اسے صوابدید دی گئی ہے۔ لیکن زیر بحث قانون میں آپ نے یہ بھی رکھا ہے کہ:

> The meeting of Council shall be convened by the President either in his discretion or on the advice of the Prime Minister.

اگر موجودہ تجویز یہ زیریں قانون سازی ہے یا اگر یہ ماتحت ادارہ ہے تو لازمی کابینہ کے مشورے اور وزیر اعظم کے مشورے کے مطابق کام ہو گا۔ آپ اس قانون کے ذریعے سے ایک نیا صوابدیدی اختیار صدر کے لیے تخلیق نہیں کر سکتے، اس لیے کہ آئین نے صدر کو صوابدیدی اختیار نہیں دیا۔ جن چند مقامات پر لفظ صوابدید استعمال ہوا ہے وہاں ہم مجبور ہیں لیکن جہاں صوابدید نہیں ہے وہاں وزیر اعظم کا مشورہ ہے۔ لیکن اس قانون کے تحت صدر وزیر اعظم کا مشورہ مسترد کر سکتا ہے اس لیے کہ آپ نے کہا ہے کہ وہ صوابدید رکھتا ہے۔ یہ آپ نے ایک نئی صوابدید تخلیق کی، تو یہ دستور کے ڈھانچہ میں تبدیلی ہے کیوں کہ دستور کی ڈھانچے میں صدر کا جو مقام ہے اس کے مطابق وہ مشورہ دے سکتا ہے، خطاب کر سکتا ہے اور تعامل کر سکتا ہے، لیکن وہ کسی ادارے کی سربراہی نہیں کر سکتا۔ آپ نے ایک نیا ادارہ بنایا ہے جس میں آپ اس سے سربراہی کروا رہے ہیں۔ دوسرے آپ نے ایک

زیریں قانون کی دفعہ سے اسے ایک صوابدیدی اختیار دیا ہے جبکہ دستور یہ کہتا ہے کہ سوائے ان صوابدیدی اختیارات کے جو دستور نے صدر کو دیئے ہیں وہ کابینہ اور وزیر اعظم کے مشورے کا پابند ہے۔ ان دونوں معاملات میں آپ نے صدر کے لیے اختیار تخلیق کیا جو آپ نہیں کر سکتے یہ غلط ہے اس ادارے کے بارے میں مجھے برادرم رضا ربانی کی رائے سے اتفاق ہے کہ یہ جو ترمیم کے ذریعے آرٹیکل ۵(۳) کے اندر اضافہ کیا گیا ہے کہ:

قومی اہمیت کی حامل کوئی تجویز یا کوئی مسئلہ جس پر عمل درآمد کی ضرورت ہو۔

دوسرے الفاظ میں اب صدر کا یہ کام بھی ہو گیا ہے کہ آپ وہ بات کہیں گے جو نافذ کی جاتی ہے، اس کے معنی ہیں کہ:

پالیسی میں تبدیلی، یہاں تک کہ قانون میں تبدیلی بھی کونسل کے ذریعہ مناسب کارروائی کے لیے قومی اسمبلی یا سینیٹ کو بھیج دی جائے گی۔

گویا کہ آپ ہدایات دے رہے ہیں اور اس سے آپ حدود کار بڑھا رہے ہیں۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ مقننہ انتظامی ادارہ نہیں ہوا کرتی۔ انتظامی اختیار کابینہ کا ہوتا ہے۔ مقننہ زیادہ سے زیادہ قانون سازی کرے گی یا حکومت کو سفارشات دے گی، وہ اسے ہدایات بھی دے سکتی ہے لیکن عملدرآمد حکومت یعنی انتظامی حصہ کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

قومی سلامتی کونسل کا مجوزہ تصور: میرا ایک اہم اور بنیادی اعتراض سروسز چیفس کے کردار کے حوالے سے ہے۔ ایک ایسے ادارے کے اندر آپ نے سروسز چیفس اور چیئرمین جوائنٹ چیفس آف اسٹاف کمیٹی کو لا کر فوج کا ایک قانونی و ادارتی کردار تخلیق کر دیا ہے جو فوج اور قوم دونوں کے ساتھ زیادتی ہے اور اسے ہرگز ہرگز قبول نہیں کیا جانا چاہیے۔ البتہ ایک ایسی قومی سلامتی کونسل جو کسی طور پر سویلینز پر مبنی ہو جس میں مرکز اور صوبوں کی شرکت ہو اور جس میں فوج کی قیادت کو یا دوسرے لوگوں کو ضروری مشورے کے لیے حسب ضرورت بلایا جا سکتا ہو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اس وقت اکنامک کوارڈی نیشن کونسل (ECC)

موجود ہے ، ہم اور ادارے بھی بنا سکتے ہیں اگر اس کی ضرورت ہو۔ البتہ ایسے کسی نئے ادارے کا کام صرف اس وقت ہو گا جب کہ وہ کام (ECC) کے بغیر نہیں چل سکتا۔ میری نگاہ میں وہ کام ہے تحقیق، انٹیلی جنس اور تجزیہ کا، وہ کام ہے داخلی، عالمگیر اور علاقائی خطروں کے بارے میں صحیح ادراک پیدا کرنے کا۔ اگر یہ کام آپ کرتے ہیں اور سویلین ادارہ ہوتا ہے تو بلاشبہ وہ صحیح ہو گا اور اس سے جمہوریت فروغ پائے گی لیکن فوج کو اس کے اندر لا کر کے آپ دراصل فوج کو ایک کانٹوں کی سیج پر لا رہے ہیں۔ بار بار کے مارشل لاء اور سیاست میں مداخلت کی وجہ سے پہلے ہی ملک میں فوج کی پیشہ ورانہ حیثیت اور ساکھ بہت کمزور ہو رہی ہے۔

میں آپ سے بڑے دکھ اور درد مندی کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ ان ایوانوں میں بیٹھ کر اور اسلام آباد کے سرد کمروں میں بیٹھ کر نہ سوچیے، باہر نکل کے بات کیجیے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ملک میں ۱۹۶۵ء تک قوم فوج کی عزت کرتی تھی، اس سے محبت کرتی تھی اور اس کے لیے دعائیں کرتی تھی۔ ۱۹۶۵ء کے بعد سب سے اونچا مقام ان کو دیا گیا لیکن ۱۹۷۱ء کے سنگین حادثہ اور اس کے بعد بار بار کے مارشل لاء اور سیاسی مداخلت نے اس کی ساکھ کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ سول نظام میں آج ۱۰۲۵ حاضر سروس یا ریٹائرڈ فوجی افسر آپ لے آئے ہیں۔ معیشت کے میدان میں ایک فوجی ایمپائر آپ نے تخلیق کر دی ہے اور اس کے مفادات تخلیق کر دیے ہیں۔ ہر جگہ آپ فوج کے لوگوں کو لگا رہے ہیں۔ اس کے نتیجے کے طور پر بے اعتمادی پیدا ہو رہی ہے۔ لوگ فوج کے بارے میں، افراد کے بارے میں نہیں، فوج کے بارے میں بد گمان ہو رہے ہیں، یہ بڑی خطرناک صورتحال ہے۔ فوج کو تو ہماری محبتوں کا مرکز ہونا چاہیے جو ہماری سیکورٹی کی علامت ہے۔ فوج کو سیاست میں لا کر آپ نے دیکھا کہ وانا (وزیرستان)[1] میں کیا ہوا۔ یہ اس لیے ہوا کہ آپ نے فوج کو غلط استعمال کیا۔

---

[1] اشارہ ہے پاکستان کے قبائلی علاقوں میں پہلی بار فوج کی تعیناتی اور بعد ازاں مارچ ۲۰۰۴ء میں جنوبی وزیرستان کے قصبہ وانا میں وہاں تعینات پاکستانی افواج اور جنگجوؤں کے درمیان ہونے والی جنگ کی طرف۔ جس میں پاک فوج کو کامیابی ضرور ہوئی لیکن اس کے لیے اسے بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔

جب کبھی فوج کا غلط استعمال کیا جائے گا یہ منفی نتائج سامنے آکر رہتے ہیں۔ عراق میں دیکھ لیجیے، وہاں امریکہ کا کیا حشر ہو رہا ہے۔ قومی مزاحمت ہے، امریکہ نے کہا تھا کہ ہم آزادی کے لیے جا رہے ہیں لیکن لوگ امریکہ کو قابض فوج سمجھتے ہیں۔ خدا کے لیے آپ اس طرح نہ کیجیے کہ آپ کے لوگ خود اپنی فوج کے بارے میں یہ بات کہیں کہ فوج کی قیادت، اس فوج کو پاکستانی فوج کی بجائے قابض فوج کے طور پر استعمال کر رہی ہے۔ فوج کا کام یہ ہے کہ ہماری سرحدوں کا دفاع کرے اور پوری قوم اس کی پشت پر ہو۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب وہ سیاست سے باہر رہے۔ اگر آپ اس کو سیاست میں لائیں گے تو اس میں کرپشن بھی آئے گی، وہ متنازعہ معاملات میں ملوث بھی ہو گی، اور متنازعہ بھی بنے گی، لوگ اس پر بے اعتمادی بھی کریں گے۔

آپ کے یہ کہہ دینے سے کہ فوج کے خلاف کوئی بات نہ کہو، اس سے زبانیں بند نہیں ہوں گی۔ آج گلی اور بازار میں آپ جائیں لوگ وہ لطیفے سناتے ہیں جس میں فوج کی تحقیر اور تضحیک ہے۔ یہ سب اس لیے کہ آپ فوج کو غلط استعمال کر رہے ہیں۔ خدا کے لیے فوج کو اس کام کے لیے رکھیں جو اس کا کام ہے۔ اس کا کام سیاست نہیں ہے، قومی سلامتی کونسل کی رکنیت نہیں ہے۔ پارلیمنٹ کو سفارشات دینا نہیں ہے کہ تم نافذ کرو۔ جو کچھ آپ کرنا چاہ رہے ہیں اس کے تو معنی یہ ہیں کہ چار فوجی افسران وہاں بیٹھ کر سینیٹ اور اسمبلی کو یہ ہدایت بھجوائیں گے کہ یہ ہے ہماری نگاہ میں قومی اہمیت کی چیز اور اب آپ اسے نافذ کریں۔ خدا کے لیے یہ صورتحال پیدا نہ کیجیے۔ پارٹی بازی کی بنیاد پر نہ سوچیے۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے اداروں کے استحکام کو نظر انداز کیا ہے اور یا افراد کی خاطر سکیڑا اور خاص مقصد کے لیے انھیں ڈھالا ہے۔ ایوب خان ہوں یا جنرل یحییٰ اور ضیاء الحق، سب نے یہی کیا اور اب پرویز مشرف بھی یہی کر رہے ہیں۔ میرے نزدیک وہ لوگ جو اس معاملے میں ان کے شریک کار بن رہے ہیں، جو ملک کے دستور اور قانون کو اور ملک کے اداروں کو ایک فرد کی بنا پر ہلا رہے ہیں، وہ اس ملک کے ساتھ

ظلم کر رہے ہیں۔ میں یہ بات بھی کہنا چاہتا ہوں کہ ایسی جو بھی کوشش ہوئی ہے، اسے استحکام حاصل نہیں ہوا۔ جوں ہی وہ شخص کمزور ہوا ہے تو وہ ادارہ بھی بیٹھ گیا۔ ۱۹۷۲ء کے دستور کو یاد کیجیے۔ اس کے ساتھ کیا ہوا؟ اس سے پہلے ایوب خان نے کہا تھا کہ میں، فیلڈ مارشل آپ کو یہ دستور دے رہا ہوں اور پھر کیا ہوا؟ اس فیلڈ مارشل نے اپنے بنائے ہوئے دستور کے تحت قومی اسمبلی کے اسپیکر کو اقتدار نہیں دیا بلکہ جنرل یحییٰ کو اقتدار سونپ دیا اور اس کے ساتھ ہی فیلڈ مارشل کا بنایا ہوا وہ دستور بھی ختم ہو گیا۔

اب آپ یہی کچھ پھر کرنا چاہ رہے ہیں۔ خدا کے لیے اپنے ماضی سے کچھ سبق سیکھیے۔ افراد کے لیے اداروں کو نہ بنایئے، چند مخصوص لوگوں کے لیے دستور کی تفریق اور قانون سازی نہ کیجیے۔ اگر اس طرح آپ نے کیا تو پھر ادارے تباہ اور کمزور ہوں گے۔ جمہوریت کا استحکام اداروں کی مضبوطی پر مبنی ہے، جمہوریت اور پارلیمنٹ کی بالادستی اس سے عبارت ہے کہ ہم دستور کی حفاظت کریں۔ دستور میں جو بدصورتیاں ہیں ان کی اصلاح کی کوشش کریں اور اسی لیے ہم نے ۱۷ویں ترمیم کے موقع پر یہ منوایا تھا کہ بارہ افراد کی ایک کمیٹی مزید کام کرے گی، تاکہ دستور اور قوانین اور آرڈیننسوں میں جن مزید تبدیلیوں کی ضرورت ہو، ان کا اہتمام کیا جائے اور ہم اس کو دستور کی اصل روح اور اصل الفاظ سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کریں۔ یہ ہے اصل جمہوریت۔ یہ نہیں ہے کہ آپ دستور سے متصادم ایک اور سلامتی کونسل قوم پر مسلط کر دیں۔

سویلینز پر مشتمل سلامتی کونسل: میں ایک بات کی مزید وضاحت کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ ۱۷ویں آئینی ترمیم کے موقع پر ہمارا اصل موضوع دستور سے قومی سلامتی کونسل کو نکالنا تھا۔ جناب ایس ایم ظفر نے، جو ان تمام معاملات میں شریک تھے، ایک بار نہیں اپنے متعدد انٹرویوز میں بار بار یہ بات صاف کہی ہے کہ اس وقت یہ مسئلہ تھا اور نہ ہی ایم ایم اے سے ہمارا کوئی معاہدہ یا وعدہ تھا کہ قانون کے ذریعے سے اگر لایا جائے گا تو وہ اس کی تائید کریں گے۔ ہم نے ایم ایم اے سے یہ ضرور کہا کہ قانون کے ذریعے سے لایا جاسکتا ہے اور جس کے

پاس اکثریت ہو وہ قانون پاس کر سکتا ہے لیکن اس وقت ہمارا اصل ہدف دستوری ادارے کی حیثیت سے اس (قومی سلامتی کونسل) کو ترمیم کے مسودہ سے نکلوانا تھا۔ اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ جب معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پہلے ڈرافٹ میں قومی سلامتی کونسل کو رکھا گیا تو مخالفت کی گئی اور بالآخر جب اسے واپس لیا گیا، اس کے بعد ہم گفتگو کے لیے ہمیشہ تیار تھے، لیکن میں یہ بات پوری ذمہ داری سے ایوان کے فلور پر کہتا ہوں کہ حکومت نے اس مسودے کو تیار کرتے ہوئے یا کرنے کے بعد کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی کہ حزب اختلاف سے مل کر قانون کے ذریعہ اس کی تشکیل کے لیے مسودے کے بارے میں کوئی گفتگو کریں۔ یک طرفہ طور پر اس کو لے کر آئے ہیں اور اس کے نتیجے کے طور پر ایک ایسا قانون آیا ہے کہ جو دستور، قانونی روایات، جمہوری ضروریات، پارلیمنٹ کی بالادستی، وفاقی نظام اور میری نگاہ میں اسلامی احکامات سے بھی متصادم ہے۔

میرے کچھ ساتھی اب بھی یہ سمجھتے ہیں کہ قومی سلامتی کونسل کا ادارہ بن سکتا ہے بشرطیکہ وہ صرف سویلینز پر مشتمل ہو، اور وہ صرف رابطہ کاری کے لیے ہو۔ بشرطیکہ اس کا مقصد فوج کو سیاسی اور حکومتی معاملات میں شریک کرنے کا نہ ہو۔ ہم فوج کی کسی بھی شکل میں کونسل میں رکنیت کے خلاف ہیں۔ قومی سلامتی کونسل میں کسی ایک فوجی ممبر کی موجودگی بھی اس کے کردار کو بدل دے گی۔ فوج سے مشورہ کر سکتے ہیں، معلومات لے سکتے ہیں لیکن اس کی رکنیت قابل قبول نہیں ہے۔ اگر یہ مکمل سول ادارہ ہو جس کا سربراہ وزیراعظم ہو تو اس کی تشکیل پر غور کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اپنی موجودہ شکل میں یہ بل ہمارے لیے ہرگز قابل قبول نہیں ہے، ہم اس کی بھرپور مخالفت کریں گے۔

اس پورے پس منظر میں اپنی بات کو ختم کرتے ہوئے میں یہ کہوں گا کہ موجودہ شکل میں یہ بل قوم کے لیے قابل قبول نہیں ہے۔ کیونکہ (۱) یہ دستور کے خلاف ہے۔ (۲) یہ پارلیمان کی بالادستی کے خلاف ہے۔ (۳) یہ اس ملک میں جمہوریت کے فروغ کے خلاف ہے۔ (۴) اس میں اداروں کو نظر انداز کر کے ایک فرد (جنرل مشرف) کے مطالبات، ضد اور

ہٹ دھرمی کو سامنے رکھ کر قانون سازی کی جارہی ہے۔ (۵) اس کے اندر فوج کو ایک مستقل ادارتی کردار دیا جارہا ہے۔(۶)اس کے اندر زیریں قانون سازی کے ذریعے سے نئی حدود تخلیق کی گئی ہیں۔

اصل حدود میں سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ اس دستور کے تحت صدر کسی ادارے کا سربراہ نہیں ہے۔ اسے سربراہی کرنے کا اختیار کسی جگہ نہیں ہے، مشورہ کیے جانے کا، رائے دینے کا، توثیق کا، پیغام کا اور خطاب کرنے کا صدر کا اختیار ہے، سربراہی کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ وہ کابینہ اور وزیراعظم کے مشورے کا پابند ہے اور اس ترمیم کے اندر اس کو ایک نئی صوابدید دی جارہی ہے، وہ صوابدید جو دستور کے اندر موجود نہیں ہے۔ ان دونوں اعتبار سے یہ نئی صوابدید جو زیریں قانون سازی کے ذریعے تخلیق کی جارہی ہے قطعاً قابل قبول نہیں۔ اس بل کو اپنی موجودہ شکل میں مسترد ہونا چاہیے۔ اگر یہ پارلیمنٹ اسے منظور کرلیتی ہے تو یہ اس قوم کی تاریخ میں ایک بڑا تاریک اور افسوسناک دن ہوگا۔ (۱۳؍اپریل ۲۰۰۴ء)

قانون سازی کا غیر جمہوری اور غیر اخلاقی طریقہ

جناب والا! میں خاص طور پر اس ایوان کے تمام ہی ارکان کے ضمیر کو دعوت دینا چاہتا ہوں کہ وہ یہ سوچیں کہ پرسوں جس انداز میں نام نہاد قومی سلامتی کونسل بل کو اس ایوان میں پاس کیا گیا ہے وہ کس قدر غیر جمہوری اور غیر اخلاقی ہے۔ دستور، قانون، ضابطہ اور شریفانہ معاہدہ، جو چیئرمین سینیٹ کے دفتر میں تمام پارٹیوں کے نمائندوں نے کیا تھا اور جس پر ہم نے یہ بات کہی تھی کہ دیکھیے جس طرح قومی اسمبلی میں چیزوں کو روندا گیا ہے سینیٹ میں وہ نہیں ہونا چاہیے اس کی خلاف ورزی کی گئی۔ آپ کے پاس اکثریت ہے، آپ بل کو منظور کرسکتے ہیں لیکن ہمارا حق ہے کہ ہم اپنے نقطہ نظر کو پورے دلائل کے ساتھ پیش کریں۔ آپ کا حق ہے کہ آپ اس کا جواب دیں اور اس کے بعد قاعدے کے مطابق ووٹنگ ہو۔ ہم نے یہ راستہ اختیار کیا کہ نہ صرف اصولی طور پر پورے بل پر اپنے نقطہ نظر کو پیش

کرنے کا آپ سے وعدہ کیا بلکہ دوسری خواندگی کے لیے پانچ ترامیم بھی میں نے اور میرے ساتھیوں نے پیش کیں تاکہ اس کی ایک ایک شق کے بارے میں ہم قانون سازی کے صحیح اصولوں اور ضابطوں کے مطابق بات کریں اور جہاں جو تبدیلی چاہتے ہیں اسے آپ کے سامنے رکھیں۔ ایوان قبول کرے یا نہ کرے اس کو اختیار ہے لیکن ایوان کے سامنے ان چیزوں کا نہ آنا اور ارکان کو یہ موقع نہ ملنا کہ ہم اپنی بات کو پیش کریں سراسر ناانصافی ہے۔ ہم نے متوجہ کیا کہ جو وعدہ چیئرمین نے اور قائد ایوان نے ہمارے سامنے کیا تھا اس کو اس بے دردی کے ساتھ نہ توڑا جائے لیکن اس پر توجہ نہیں دی گئی۔ ہم نے کمیٹیوں کے مسئلہ پر اپنی بات کو پیش کیا، آپ نے اس کو نہیں مانا، ہم نے اس پر احتجاج کیا، یہ ہمارا حق ہے۔ لیکن اس کو وجہ بنا کر موضوع کو تبدیل کر کے سرعت سے قانون سازی کر لینا بڑا غیر جمہوری اور غیر اخلاقی عمل تھا۔ ہم آپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، پارلیمانی روایات کا یہ تقاضا تھا کہ نیا موضوع لینے سے پہلے ہمیں اس ایوان میں بلایا جاتا، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس کے باوجود کہ غالباً آپ کی جانب سے یہ کہا بھی گیا۔ ایک اخبار نے یہ بات لکھی ہے کہ:

(ترجمہ):"سینیٹ کے چیئرمین، محمد میاں سومرو کے اپوزیشن کے سینیٹرز کو واپس لانے کے حکم کو اَن سُنا کر دیا گیا اور قائد ایوان وسیم سجاد اور وزیر مملکت برائے قانون و انصاف جسٹس رضا حیات ہراج نے اصرار کیا کہ وہ شق وار بل کی خواندگی جاری رکھیں"۔

اگر یہ بات صحیح ہے تو جناب والا! آپ سے جو شکایت تھی وہ تھوڑی کم ہو گئی ہے لیکن قائد ایوان (وسیم سجاد) جن کے ساتھ ہم نے اس ایوان میں ۱۳ سال گزارے ہیں اور اختلاف کے باوجود ہمارے تعلقات بڑے اچھے رہے ہیں ان سے ہم زیادہ بہتر طرز عمل کی توقع رکھتے تھے۔ ہماری پوری کوشش یہ تھی کہ اس ایوان میں بھی تعلقات کار ہوں، اختلاف اپنی جگہ ہے، لیکن تعاون کے ساتھ، ہر ایک کے حق کو ادا کرتے ہوئے کام کو آگے بڑھنا ہے۔ لیکن جناب والا! جو رویہ اختیار کیا گیا وہ غیر دستوری، غیر قانونی، غیر اخلاقی اور

غیر سیاسی تھا، کیوں؟

دستور کہتا ہے کہ قانون سازی کا کام پوری ذمہ داری کے ساتھ ہونا چاہیے اور یہی وجہ ہے کہ قانون سازی کے لیے یہ راستہ اختیار کیا گیا ہے کہ ایک نہیں دونوں ایوانوں میں ہر قانون آئے تاکہ جہاں کہیں کوئی سقم رہ جائے، اس کی اصلاح کی جا سکے۔ معاملہ صرف ایوان کا نہیں بلکہ یہ ہے کہ بل کے ایوان میں آتے ہی اس کو اسٹینڈنگ کمیٹی میں بھی بھیجیں، تاکہ وہ توجہ کے ساتھ دیکھا جا سکے۔ کیونکہ قانون میں ایک ایک لفظ، ایک ایک نکتے، ایک ایک شوشے کی اہمیت ہوتی ہے، جو عمومی بحث میں درست طور پر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ہر بل کو دقتِ نظر سے جانچنا ہوتا ہے۔

اگر معاملہ ایسا ہے کہ اس کے بارے میں عوامی رائے لینا ضروری ہے، تو آپ قانون سازی میں جلدی نہ کریں، عوام کو بھیجیں تاکہ وہ اپنی رائے دیں۔ اگر اس میں کوئی پہلو اخلاقی اور اسلامی ہے تو اسلامی نظریاتی کونسل کو بھیجیں تاکہ وہ اپنی رائے دے دیں۔ ایک ایوان سے دوسرے ایوان میں آئے۔ اس کے بعد یہاں بھی ایک نہیں تین خواندگیوں کا طریقہ رکھا گیا ہے آخر اس کا فلسفہ کیا ہے؟ تین خواندگیوں کا فلسفہ یہ ہے کہ قانون سازی زبان بندی کرنے کی چیز نہیں ہے۔ قانون کے لیے پہلے عمومی خواندگی ہوتا کہ اس کے اصولوں پر بات ہو، پھر اس کی ایک ایک دفعہ پر ترمیم آئے، ترمیم میں اگر ترمیم ہے، وہ بھی آئے جب یہ بحث ہو جائے تب تیسری خواندگی میں عمومی بحث کے بعد اسے منظور کیا جائے یا اسے رد کیا جائے۔ لیکن آپ نے کیا رویہ اختیار کیا؟ آپ ہر چیز کو روندنا چاہتے ہیں۔ آپ قانون سازی کو مذاق بنا رہے ہیں۔ آپ اس ایوان کی عزت پامال کر رہے ہیں اور دنیا بھر میں قانون سازی کی جو روایات ہیں، اہم قانون ہو تو مسئلہ ہفتوں یا مہینوں میں نہیں کئی کئی سال تک قانون بنانے میں لگ جاتے ہیں۔ کوئی اہم قانون ایسا نہیں ہے، امریکہ ہو یا برطانیہ ہو یا خود ہندوستان کی پارلیمنٹ ہو جہاں اس کو پاس کرنے میں دو تین مہینے سے کم لگتے ہوں، لیکن ایک ایسا قانون جس پر پاکستان میں جمہوریت کا انحصار ہے، جس میں دستور کے مزاجی ڈھانچے سے اور خاص

طور سے ملک کی سیاست میں فوج کا کردار جو ایک بڑا بنیادی مسئلہ ہے سے متعلق ہے اسے اس طرح نمٹا دینا بہت سنگین مذاق ہے۔

یورپین کمیونٹی کا ردّعمل: میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ ۲۰۰۴ء میں یورپین کمیونٹی نے پاکستان کی قومی سلامتی کونسل کے حوالے سے قرارداد پاس کی ہے[1]۔ اس قرارداد کا ایک بڑا اہم پہلو یہ ہے کہ:

> (ترجمہ):"افسوس ہے کہ پاکستانی حکومت اور سیاست میں فوج مسلسل مؤثر مداخلت جاری رکھے ہوئے ہے اور یہ تشویش کی بات ہے کہ ایل ایف او کے تحت قومی سلامتی کونسل کے قیام کی منظوری دی گئی جبکہ امریکی اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کی ۲۰۰۳ء میں انسانی حقوق پر سالانہ رپورٹ کے مطابق اس اقدام سے (پاکستان کی) سیاست میں فوج کے کردار کو سند جواز مل جائے گا۔ یہ اقدام پاکستان میں جمہوریت کی بحالی اور فوجی حکومت سے سول انتظامیہ کو اقتدار کی منتقلی کے روڈمیپ کے سراسر خلاف ہے"۔

ایک ایسا قانون جس میں ملک کے دستور، سیاست میں فوج کا کردار اور پاکستان کی بین الاقوامی شہرت، اہمیت، تصور اور تعلقات کے لیے گہرے مضمرات ہیں اس کو اس طرح منظور کرانا ایک ظلم ہے۔ یورپین یونین کی کمیٹی نے جو قرارداد منظور کی ہے۔ اب یہ قرارداد یورپین کونسل میں جائے گی وہاں کیا فیصلہ ہوتا ہے میں نہیں کہہ سکتا ہوں۔

جناب والا! اتنی اہمیت کے حامل بل کو تین منٹ میں نمٹا دینا اور تین خواندگی کر ڈالنا ایک افسوسناک واقعہ ہے۔ جناب چیئرمین! یہ آپ کا فرض تھا کہ جن حضرات کے نام پینل میں آپ کو دیے گئے، ان کے ناموں کا آپ اعلان کرتے۔ ٹھیک ہے، اگر وہ ایوان میں نہیں

---

[1] یورپی یونین کے سرکاری جریدے میں شائع ہونے والی اپریل ۲۰۰۴ء کی رپورٹ کے پیراگراف نمبر ۴ میں اس قرارداد کا ذکر ہے۔

تھے، تو کم از کم نام کا اعلان تو آپ کا فرض تھا۔ میں نے اور میرے دس ساتھیوں نے پانچ ترامیم پیش کی ہیں۔ آپ کا فرض تھا کہ آپ ایک ایک ترمیم لیتے، نام لیتے، ہم یہاں بیٹھے ہوئے تھے، کہیں دور نہیں تھے۔ اور خدا گواہ ہے کہ جس انداز میں کام کیا گیا ہے، کہ ہم ابھی آپس میں بات چیت کر رہے تھے، جیسے ہی اسپیکر کی آواز کھولی گئی تو معلوم ہوا کہ دوسری خواندگی کا آخری حصہ ہے جس میں کہ آپ کلاز۔ا اور دیباچہ، (Clause-I and Preamble) کو اس کا حصہ قرار دے رہے ہیں۔

آمریت کا راستہ: جناب والا! یہ قانون کے ساتھ مذاق اور جمہوریت کے منہ پر ایک طمانچہ ہے۔ اس نے ایوان کے منہ کو کالا کیا ہے۔ خدا کے لیے یہ راستہ اختیار نہ کیجیے۔ ہم مجبور ہیں، آپ ہمیں دھکے دے دے کر محاذ آرائی کی طرف لے جا رہے ہیں۔ ہم بھی انسان ہیں، ہمارا بھی اس معاشرے میں کوئی کردار ہے لیکن جو راستہ آپ نے اختیار کیا ہے اس کا کوئی جواز موجود نہیں ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ سینیٹر وسیم سجاد سے مجھے ذاتی شکایت تھی، گو انہوں نے پرسوں مجھے ٹیلی فون کیا اور یہ ان کی شرافت تھی، ہمارے اعتماد اور احترام کے تعلقات ہیں لیکن بات ذاتی نہیں ہے، بات قائد ایوان کی ہے، قائد ایوان ہونے کی حیثیت سے ان کا فرض تھا کہ وہ قواعد و ضوابط اور روایات کا احترام کرواتے۔ لیکن انہوں نے کچھ ایسے لوگوں کا ساتھ دیا جو میری نگاہ میں جنرل مشرف کو بھی تباہی کی طرف لے جا رہے ہیں۔ کبھی ان کو کہتے ہیں کہ وردی نہ اتارو۔ حالانکہ وردی اتارنے کا معاملہ ان کی ذات کا معاملہ نہیں ہے۔ یہ کسی سے ان کا کوئی ذاتی معاہدہ نہیں ہے۔ یہ ایک دستوری تقاضہ ہے۔ اور اگر وہ دستوری تقاضے سے اس طرح روگردانی کرتے ہیں اور لوگ ان کو اس کام کے لیے اکساتے ہیں، تو یہ میری نگاہ میں آئین کے آرٹیکل ۶ کو مدعو کرنا ہے۔ دستور سے بغاوت کوئی بھی کرے اور اتنے سنجیدہ معاملے کو اس طریقے سے کرنا نا قابل قبول ہونا چاہیے۔

میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے ہمیں دکھ پہنچایا ہے۔ ایوان کی جو روایات ہیں اور تعاون کے اور آگے بڑھنے کے جو امکانات تھے، ان کو شدید دھچکا پہنچا ہے۔ اپوزیشن اپنے آئندہ

کے لائحہ عمل کے بارے میں غور کرے گی کہ اس نے کیا راستہ اختیار کرنا ہے اور کس طرح معاملات کو نمٹانا ہے لیکن اگر یہ راستہ آپ نے اختیار کیا ہے تو میں آپ کو صاف کہنا چاہتا ہوں کہ یہ جمہوریت کا نہیں آمریت کا راستہ ہے، یہ جمہوریت کا نہیں فسطائیت کا راستہ ہے، یہ وہ راستہ ہے کہ جس میں آپ ملک کو بھی نقصان پہنچائیں گے اور جو ملک تھوڑا بہت بحران سے نکل رہا تھا، ہم دوبارہ اس کو ایک بہت بڑے بحران کی طرف لے جا رہے ہیں۔ تو جناب! ان الفاظ کے ساتھ میں اس رویے کے اوپر شدید احتجاج کرتا ہوں اور خواہش کرتا ہوں کہ آپ انصاف کرنے کی کوشش کریں گے اور آپ اس ایوان کو بچانے کی کوشش کریں گے، اس ایوان کو تباہی کی طرف لے جانے سے روکیں گے۔ (۱۶ اپریل ۲۰۰۴ء)

قومی سلامتی کونسل اور پاکستان کا عالمگیر تصور

جناب والا! جیسا کہ آپ سے اور قائد ایوان سے باہم مشورے میں طے ہوا تھا۔ ہماری کوشش یہ ہو گی کہ اس اہم ایشو پر مدلل بات کریں۔ چونکہ قومی سلامتی کونسل کا قانون جیسا بھی ہے، پاس ہو چکا ہے۔ اس لیے ایوان کو یہ موقع ملنا چاہیے کہ کم از کم اس کے جو اثرات ہیں ان کو قوم کے سامنے رکھا جائے اور یہ ہم اس جذبے سے کر رہے ہیں کہ ایک طرف اپوزیشن اپنا نقطہ نظر دلیل کے ساتھ پیش کرنا چاہتی ہے اور دوسری طرف حکومت اور ذمہ دار افراد سے بھی اپیل کرتی ہے کہ کھلے دل کے ساتھ اس پر ایک بار پھر غور کریں۔ قانون میں ترمیم کا دروازہ بھی کھلا ہوا ہے اور تنسیخ کا دروازہ بھی کھلا ہوا ہے۔ اس میں کسی کی انا کا مسئلہ نہیں ہے۔ دلیل کی بنیاد پر معاملات کو دیکھنے کی ضرورت ہے۔

ہماری اس تحریک کا مفہوم صرف اتنا ہے کہ قومی سلامتی کونسل ایکٹ کی بنا پر دو بنیادی مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ پہلا یہ کہ پارلیمانی نظام جس پر ہمارا دستور مبنی ہے اس میں صدر کا کردار پارلیمانی نظام کے بالکل برعکس وجود میں آ گیا ہے جس نے دستور کے پورے کے پورے نظام کو توڑ مروڑ کر رکھ دیا ہے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ اس میں سیاست کے اندر

فوج کی ادارتی مداخلت پیدا کر دی گئی ہے۔

میں کہنا چاہتا ہوں کہ یہ بات بھی آپ کے سامنے رہے کہ قومی سلامتی کونسل میں صدر کے بارے میں جو نیا کردار آرہا ہے اس کے مطابق کونسل میں جو چاروں سروسز چیف آئیں گے وہ اس کے ہی نامزد ہوں گے۔ صوابدیدی طور پر صدر قومی اسمبلی کو بھی توڑ سکتا ہے اور صوبائی اسمبلیوں کو بھی تڑوا سکتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک جوہری تبدیلی واقع ہو رہی ہے۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ اس کے ضمنی اثرات کو سامنے لایا جائے۔ ان ضمنی اثرات کے کم از کم پانچ پہلو ایسے ہیں جن پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

پہلی چیز دستور کے بارے میں ہے۔ اس کے لیے دستور نے خاص طور پر فوج اور صدر کا کردار متعین کر دیا ہے۔ اب ہم اسے کس طرح تبدیل کر رہے ہیں؟ دوسری چیز پارلیمنٹ کی بالادستی ہے جو پارلیمانی نظام کی روح ہے۔ اس پر اس کے کیا کیا اثرات پڑ رہے ہیں؟ تیسری چیز ملک میں جمہوریت کا فروغ ہے، اس لیے کہ جمہوریت کے معنی یہ ہیں کہ سول مقتدرہ کی بالادستی ہو۔ اگر فوج اس میں ایک مؤثر شریک بن جاتی ہے، تو حقیقت یہ ہے کہ اس سے ملک میں جمہوریت کے فروغ اور جمہوری اداروں کی ترقی متاثر ہوتی ہے۔ چوتھی چیز یہ ہے کہ اس کے اثرات خود فوج کے لیے کیا ہیں؟ اس لیے کہ فوج سب سے اہم اور نازک ادارہ ہے اور سیکورٹی کا اس سے تعلق ہے۔ اگر ہم فوج کو سیاست میں لائیں گے تو فوج کا متنازعہ بننا، فوج کی پیشہ واریت کا ختم یا متاثر ہونا اور اس کے نتیجہ کے طور پر ملک کا دفاع متاثر ہونا، خود فوج کے لیے کیا اثرات پیدا کر سکتا ہے؟ پانچواں یہ ہے کہ اس پوری صورت حال سے پاکستان کا کیسا تصور ساری دنیا میں پھیل رہا ہے؟

میں صرف اتنی دعوت دوں گا کہ قومی سلامتی کونسل کے اس معاملہ کے آنے کے بعد، اور پھر اس قانون کے پاس ہونے کے بعد بھی یورپی یونین نے اور دنیا کے تمام اہم اخبارات نے اور اسی طرح ایمنسٹی نے اور ورلڈ واچ نے بلا استثنیٰ کہا ہے کہ فوج کی اس مداخلت سے پاکستان میں جمہوریت کا چہرہ مسخ ہوا ہے۔ ہم اپنی فوج کے بارے میں تصور کو

خراب کر رہے ہیں۔ دستور، پارلیمنٹ کی بالادستی، ملک میں جمہوری نظام کے ارتقاء خود فوج کے ادارے کے تحفظ، پاکستان کے عالمگیر تصور کے بارے میں اس کے اثرات کیا ہیں، اس پر ہم بات کرنا چاہتے ہیں۔ (۵ مئی ۲۰۰۴ء)

جمہوری ممالک میں قومی سلامتی کونسل[1]

جناب والا بنیادی چیز یہ ہے کہ قومی سلامتی کونسل اپنی موجودہ شکل میں دستور، پارلیمانی نظام اور جمہوری روایات ہر ایک کے خلاف ہے۔ جہاں تک قومی سلامتی کونسل کے تصور کا تعلق ہے اس کے بارے میں دو آراء ہو سکتی ہیں بلاشبہ بعض جمہوری ممالک میں بھی یہ ادارہ پایا جاتا ہے۔ امریکہ میں اپنے انداز میں ہے، ہندوستان میں ہے، ترکی میں ہے، اس کے علاوہ بھی تقریباً آدھے درجن ممالک میں پایا جاتا ہے لیکن تمام جمہوری ممالک میں بنیادی چیز یہ ہے کہ یہ ادارہ سویلین ہے اور پارلیمنٹ کے دستوری عہدیداروں کے تابع ہے۔ فوج کو سیاست میں داخل کرنے اور سول معاملات میں براہ راست شامل کرنے کے لیے چور دروازے کے طور پر استعمال نہیں کیا جاتا۔ صرف ایک ملک ترکی تھا جہاں فوجی انقلاب کے بعد ایک فوجی جرنیل نے جو وہاں کا صدر مملکت تھا، سیکورٹی کونسل کا نظام اس طرح بنایا کہ اس میں فوج کے پانچ نمائندے اور پانچ سویلین نمائندے ہوتے تھے۔ اس ماڈل کو سامنے رکھتے ہوئے بدقسمتی سے ہمارے ملک کے اندر بھی اس ادارے کو متعارف کیا گیا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ سب سے پہلے جنرل ضیاء الحق نے اس ادارے کو متعارف کرنے کی کوشش کی۔ اور پارلیمنٹ نے اس کو رد کیا۔ چنانچہ آٹھویں ترمیم کے موقع پر انہیں مجوزہ دستوری ترمیم واپس لینا پڑی اس کے بعد ایک منتخب صدر نے اسے بنانے کی کوشش کی لیکن اسے بھی کوئی قبولیت نہیں ملی۔

---

[1] دو سال بعد ۲۰۰۶ء میں پروفیسر خورشید احمد نے قومی سلامتی کونسل کے قانون میں ترمیم پیش کی اس موقع پر انہوں نے درج بالا تقریر کی۔

اس عدم قبولیت کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے دستور کے ڈھانچے کے اندر قومی سلامتی کے سارے معاملات پارلیمنٹ اور کابینہ کی ذمہ داری قرار دیئے گئے ہیں۔ کابینہ اسی کے لیے ایک ڈیفنس کمیٹی بناتی ہے اور اس ڈیفنس کمیٹی کا سربراہ وزیر اعظم ہے۔ لیکن وزیر دفاع، فوجی سربراہ، وزیر خزانہ اور وزیر خارجہ اس کے رکن ہوتے ہیں اور دفاع اور سلامتی کے جو بھی حساس معاملات ہوتے ہیں، ان پر وہ غور کرتے ہیں۔ تاہم فیصلہ کرنے کی اتھارٹی کابینہ اور پارلیمنٹ کے پاس ہوتی ہے۔ اس وقت مجوزہ کونسل میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ اسے صدر مملکت کی صدارت میں بنایا جائے۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ اگر کوئی قومی سلامتی کونسل ہوتی ہے تو اس کو وزیر اعظم کی سربراہی میں ہونا چاہیے جس طرح بھارت میں ہے۔ خود امریکہ میں بھی اس کا سربراہ سویلین وزیر دفاع ہوتا ہے۔ ترکی میں اب بھی صدر اس کا ممبر ہے لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ یورپین یونین میں ترکی کے داخلے کے سلسلے میں مجملہ اور چیزوں کے جو بڑی رکاوٹ ہے، ان میں ایک ترکی میں قائم قومی سلامتی کونسل کے ادارہ کی ساخت اور اس کا تصور بھی ہے۔ یورپی یونین والے فوج کی براہ راست سول معاملات میں شمولیت کو جمہوریت کے خلاف سمجھتے ہیں۔

جمہوریت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ فوج سول انتظامیہ کے کنٹرول میں ہو۔ بلاشبہ فوج کی رائے کو دفاعی مسائل پر اہمیت ملنی چاہیے۔ دفاع کے معاملات میں فوج کی ضروریات کا تعین صحیح طور پر ہونا چاہیے اور اس کے لیے مناسب طریقہ کار واضح ہونا چاہیے۔ لیکن ملک کی انتظامیہ میں اس کا کردار نہیں ہے۔ بد قسمتی سے ہمارے ہاں تو سیکورٹی کونسل نے دنیا جہاں کے ہر مسئلہ میں مداخلت کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ دراصل پورے دستوری نظام کو پلٹنے کی کوشش ہے۔ ہم نے اس ترمیم کے ذریعے جو تجویز کیا ہے وہ یہ ہے کہ اگر ہمیں اس ادارے کو رکھنا ہے اور رکھا جاسکتا ہے تو پھر اس میں دو بنیادی تبدیلیاں ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ اس کا سربراہ وزیر اعظم ہو، تمام ضروری وزارتیں اس میں موجود ہوں اور جہاں تک فوج کا تعلق ہے تو اس کو حسب ضرورت خاص کر جوائنٹ چیف کو مدعو کیا جائے، اس کی رائے لی

جائے لیکن اسے بہر حال پارلیمنٹ کا ایک سول ادارہ ہونا چاہیے۔ یہ بنیادی تصور ہے۔

جناب والا! میں اس بل میں ترمیم کو ضروری سمجھتا ہوں ملک میں حقیقی جمہوریت کی بحالی اور دستور کے نظام کو اس کے لیے تقاضوں اور لفظاً معناً بروئے کار لانے کے لیے مجھے توقع ہے کہ پورا ایوان اس معاملے میں ہماری تائید کرے گا۔

اس ضمن میں آپ ایوان کی سابقہ کارروائی اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ ۱۷ویں آئینی ترمیم میں ایسی کسی کونسل کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس وقت ساری بحث کے آخر میں یہ لوگ چاہتے تھے کہ آپ صرف اتنا مان لیں کہ دستور میں آرٹیکل ۱۵۱ کے اندر یہ بات آجائے کہ ایک سیکورٹی کونسل ہو گی۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اس بات کو بھی پارلیمنٹ نے تسلیم نہیں کیا بلکہ جو چیز اصل ایل ایف او میں تھی اسے خارج کیا گیا۔ چنانچہ جس شکل میں اس بحث کے دوران یہ آئی ہے وہ پارلیمنٹ کی سادہ سی کارروائی ہے اور اس بارے میں بھی ہمارا کوئی وعدہ نہیں تھا۔ جس وقت یہ بل یہاں آیا ہے ہم نے اس پر تنقید کی اور اس میں ترمیم پیش کی ہے۔ ریکارڈ میں موجود ہے کہ پانچ یا چھ ترامیم تھیں جو اسی ڈھانچے میں ہم نے پیش کی تھیں تاکہ اگر اس کو پارلیمنٹ کے ایک فیصلے کی حیثیت سے آنا ہے تو پھر سو فیصد ایک سویلین ادارہ ہو، پارلیمنٹ کے سامنے جواب دہ ہو اور جو لوگ پارلیمنٹ کے سامنے جواب دہ ہیں وہ اس میں جائیں۔ یہ بنیادی تصور ہمارا اس وقت بھی تھا اور آج بھی ہے۔ سب چیز ریکارڈ میں موجود ہے۔ وزیر صاحب کو ہماری مخالفت کرنے کا حق ہے لیکن غلط بیانی کا اور ایسی باتیں منسوب کرنے کا جن میں کوئی صداقت نہیں ہے یہ حق حاصل نہیں ہے۔[1] (۱۵ مئی ۲۰۰۶ء)

---

[1] بلاشبہ ۲۰۰۶ء میں پیش کی جانے والی یہ ترمیم منظور نہیں ہوئی تاہم پارلیمنٹ میں ہونے والے ان مباحث نے جو بنیاد ڈال دی تھی اس کے نتیجہ میں پرویز مشرف کے اقتدار سے باہر ہونے کے بعد کونسل کی ہیئت اور ساخت میں نمایاں تبدیلیاں آتی رہیں۔ اس وقت (۲۰۲۱ء میں) وزیر اعظم پاکستان کی سربراہی میں قومی سلامتی کمیٹی کی شکل میں جو ادارہ قائم ہے اس میں وزرائے دفاع، امور خارجہ، داخلہ، وزیر اعظم کے تین خصوصی مشیر اور مسلح افواج کے سربراہان بشمول جوائنٹ چیفس اس کا حصہ ہوتے ہیں۔

فوجی سربراہ اور منصب صدارت

(جنرل پرویز مشرف کی دوہری حیثیت پر بحث کے تناظر میں)

گزشتہ مضامین میں ۱۷ویں آئینی ترمیم اور اس ضمن میں حکمراں جماعت اور ایم ایم اے کے درمیان معاہدہ اور اس پر مباحث سامنے آچکے ہیں۔ معاہدہ کے مطابق جنرل مشرف نے ۳۱دسمبر ۲۰۰۴ء تک یا اس سے پہلے لازماً فوجی وردی اتارنے کا وعدہ کیا تھا۔ آئینی ترمیم میں خصوصی دفعہ شامل کرکے اس حوالہ سے خصوصی استثنیٰ دیا گیا کہ جنرل مشرف ۳۱دسمبر ۲۰۰۴ء تک ایک اضافی منافع بخش عہدہ رکھ سکتے ہیں۔ تاہم اس پر عمل کی بجائے حکومت نے اکثریت کی بناء پر ایک قانون منظور کرکے صدر جنرل مشرف کو ایک اضافی نفع بخش عہدہ کی اجازت دے دی۔

پروفیسر خورشید احمد نے مسلسل اس مسئلے کو پارلیمنٹ میں اٹھایا۔ ذیل میں اس حوالہ سے ۲۹؍ اکتوبر ۲۰۰۴ء کو کی گئی ان کی مفصل تقریر دی گئی ہے اس تقریر میں بہت اہم سیاسی اور آئینی و قانونی نکات پیش کیے گئے ہیں۔ تاہم اس مفصل تقریر سے قبل اسی موضوع پر مختلف تحاریک کے ضمن میں کی گئی تین مختصر تقریریں بھی پس منظر کو سمجھنے کے لیے شامل کر دی گئی ہیں۔ جبکہ اسی حوالہ سے ۲؍ نومبر ۲۰۰۴ء کو کی گئی مختصر تقریر بھی موضوع کے تسلسل میں شامل ہے۔

جناب چیئرمین! میں اور میرے دس ساتھی یہ تحریک پیش کر رہے ہیں کہ:

(ترجمہ): ”ہم یہ بل (مسودہ قانون) سینیٹ آف پاکستان کے قواعد وضوابط اور طریقہ عمل ۱۹۸۸ء کے رول ۹۰ کے تحت پیش کر رہے ہیں کہ ۲۰۰۴ء کے جس قانون کے تحت صدر پاکستان کو ایک اور منافع بخش عہدہ رکھنے کی اجازت دی گئی ہے اس کو اسلامی نظریاتی کونسل کی رائے معلوم کرنے کے لیے بھیج دیا جائے کہ آیا یہ قانون اسلامی تعلیمات کے خلاف تو نہیں ہے“۔

یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس ملک کا دستور (دفعہ ۲۲۷(۱) اور ۲۲۸) یہ کہتا ہے کہ کوئی بھی ادارہ کوئی قانون قرآن و سنت کے خلاف پاس نہیں کر سکتا۔ اسی کام کے لیے اسلامی نظریاتی کونسل ایک آئینی ادارہ ہے جو اس چیز کا جائزہ لے سکتی ہے۔ میری نگاہ میں اس وقت کی صورتحال ہمارے عقیدے، ایمان اور اسلام کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہے اور اسی بنا پر اسے لازماً اسلامی نظریاتی کونسل میں بھیجا جائے تاکہ ہم ان کی رائے معلوم کر سکیں۔

اس ضمن میں پہلی چیز 'تقسیم اختیارات' سے متعلق ہے۔ یہ اصول کہ فوجی سربراہ صدر مملکت کے ماتحت ہے، اسلام کا ایک بنیادی اصول ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ آپ قانون کی کوئی بھی اہم کتاب پڑھ کر دیکھ لیں، آپ کو یہ ملے گا کہ لشکر کا سالار، خلیفہ اور امیر المومنین کے تابع ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ دو الگ الگ دفتر ہیں، ان کو ایک جگہ جمع نہیں کیا جا سکتا۔ جس وقت سے اسلامی دور میں فوج بنی اور یہ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں قائم ہوئی، اس وقت سے لے کر یہ اصول متفق علیہ رہا ہے کہ لشکر کا سالار امیر المومنین کے تابع ہوتا ہے۔ سالار لشکر امیر المومنین نہیں ہو سکتا اور ان دونوں کو ایک ساتھ جمع نہیں کیا جا سکتا۔

یہاں میں آپ کو یاد دلاؤں گا کہ اسی اسلام آباد میں خود جنرل پرویز مشرف نے چند مہینے پہلے مشائخ اور علماء کی ایک کانفرنس سے خطاب کیا تھا، میرے پاس اس تقریر کا متن موجود ہے۔ اس میں انہوں نے یہ بات کہی ہے کہ خلیفۃ المسلمین نے عین اس وقت جب کہ لڑائی ہو رہی تھی حضرت خالد بن ولیدؓ جیسے جری سالار کو جو فورسز کے کمانڈر تھے ہٹا دیا اور امیر المومنین کے حکم کے مطابق کمانڈر نے سر تسلیم خم کر لیا۔ معلوم ہوا کہ سالار ماتحت ہے امیر المومنین کا اور بیک وقت یہ دونوں (دفتر) جمع نہیں کیے جا سکتے۔ تو میری پہلی دلیل یہ ہے کہ ہماری فقہ اور سیاسی فکر کا یہ مسلمہ اصول ہے جس کی یہ نمایاں مثال خود پرویز مشرف نے علماء مشائخ کانفرنس کے موقع پر دی ہے۔ اس کی بنیاد پر اسلامی نظریاتی کونسل کی رائے لی

جائے کہ کیا یہ مجوزہ قانون اس اصول سے متصادم ہے؟

جناب والا! دوسری بات یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جنرل پرویز مشرف صاحب، حکومتی پارٹی اور پارلیمنٹ کی کم از کم دو تہائی اکثریت نے، ٹھیک ہے میرے کچھ ساتھی اس میں شریک نہیں تھے، میں ان کی خوبی کا اعتراف کرتا ہوں، ۱۷ویں ترمیم کے تحت ایک اصول طے کیا تھا۔ اس اصول کے مطابق، ترمیم کا جوہر اور مرکزی مسئلہ یہ تھا کہ فوج کی حکومت میں مداخلت کے خاتمہ کی تاریخ مقرر کی جائے۔ نتیجتاً آرٹیکل ۴۱ کلاز ۷ میں ترمیم کی گئی اور اس ترمیم کے تحت (دو عہدوں کے ایک فرد میں جمع ہونے کے) خاتمہ کی تاریخ دی گئی[1]۔ اس تاریخ کی روشنی میں جنرل صاحب نے ٹی وی پر آکر پوری قوم اور پوری دنیا سے عہد اور یہ وعدہ کیا کہ وہ ۳۱ دسمبر ۲۰۰۴ تک فوجی عہدے کو چھوڑ دیں گے۔ اس موقع پر ان کا کہنا تھا کہ میں اس معاملے میں پہلے دورائے رکھتا تھا لیکن اب میں نے اس پر بہت غور کیا ہے۔ اس میں جو ساری باتیں، بالخصوص استحکام کے بارے میں ہوئی ہیں، ان سب پر میں نے غور کیا ہے، میرے ساتھیوں نے مجھے اس کے برعکس مشورہ دیا لیکن اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے اور یہ بات طے کر لی ہے کہ میں ۳۱ دسمبر ۲۰۰۴ء تک اس عہدے کو چھوڑ دوں گا، البتہ یہ اختیار میں رکھتا ہوں کہ اس سے پہلے بھی کسی تاریخ پر میں اس عہدے سے فارغ ہو جاؤں۔

جناب والا! میں آپ کو دعوت دوں گا کہ آپ دستور کی شق ۶۲ نکال کر دیکھیں، اس میں جو شرائط ہیں ایک رکن پارلیمنٹ کی، ان میں یہ بھی ہے کہ وہ امین ہو گا اور جو شخص عہد کر کے عہد توڑے وہ امین نہیں رہتا اور امین نہ رہ کر اس پوزیشن سے وہ نااہل ہو جاتا ہے۔ تو دوسری دلیل میری یہ ہے کہ دستور کی دفعہ ۶۲ کی انہوں نے خلاف ورزی کی ہے۔ اس کی دو شقیں ہیں اور دونوں میں یہ چیز آتی ہے اور اس کے نتیجے کے طور پر یہ اسلام کے اصولوں

---

[1] اس ترمیم کے تحت ۳۱ دسمبر ۲۰۰۴ء کے بعد صدر مملکت کے لیے چیف آف آرمی اسٹاف کا منافع بخش عہدہ رکھنے کا استثنیٰ خود بخود ختم ہو جاتا تھا۔

سے متصادم ہے اور اس کو جاننے کا اور تحقیق کرنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ ہم اس بل کو یہاں بحث کرنے کی بجائے پہلے اسلامی نظریاتی کونسل کو بھیجیں، ان سے کلیئرنس لیں اور اگر وہ اس کی کلیئرنس دیتے ہیں تب اس پر غور کیا جائے ورنہ نہیں۔ (بعد ازاں ایوان میں مطلوبہ تعداد کی حمایت نہ ملنے پر پروفیسر خورشید اور دس دیگر ارکان کی جانب سے پیش کی گئی یہ تحریک منظور نہ ہو سکی)۔ (۲۷۔ اکتوبر ۲۰۰۴ء)

صدر ایک اور عہدہ رکھ سکتا ہے: قانون پر بحث

جناب چیئرمین! اپنے دوسرے تمام ساتھیوں کے ساتھ میں بھی اس بل کا محرک ہوں۔ ہم میں سے ہر ایک نہیں بولے گا لیکن جو نکتہ میرے بھائی ثناء اللہ بلوچ نے کہا ہے[1] وہ بڑا اہم ہے میں اس کی پوری تائید کرتا ہوں لیکن اس کے ساتھ ساتھ دو باتیں اور کہنا چاہتا ہوں۔ پہلی چیز یہ ہے کہ ابھی ہم اکتوبر کے مہینہ میں ہیں اور یہ بل ۳۱ دسمبر ۲۰۰۴ء کے بعد عمل پذیر ہو رہا ہے۔ گو ہماری نگاہ میں اس کا کوئی قانونی جواز نہیں ہے لیکن اس پہلو کو نظر انداز کرتے ہوئے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمیں کوئی جلدی نہیں ہے کہ اس کو لازماً آج ہی پاس کریں۔ اس لیے ہماری نگاہ میں ضروری ہے کہ یہ بل ہم عوام کے حوالے کریں اور ان کی رائے لیں۔ چونکہ جنرل صاحب نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ عوام ان کی نگاہ میں ان کی حمایت کرتے ہیں۔ تو ہم ان کو آئینہ دکھانا چاہتے ہیں کہ محض آپ کی دعوؤں پر کوئی بات نہیں چلے گی۔ حقیقت کو معلوم کیجیے۔

میری معلومات کے مطابق اس اثناء میں Pattan Development Organization

---

[1] پروفیسر خورشید احمد سے قبل سینیٹر ثناء اللہ بلوچ نے صدر کے لیے دوسرا عہدہ رکھنے پر آئینی استثنیٰ کے قانون پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ قانون آئین کی ۲۱ دفعات کے خلاف ہے اور آرٹیکل ۶ کے مطابق ایسی قانون سازی جرم ہے۔

دوسرا انہوں نے صدر جنرل مشرف کے اس دعویٰ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہ انہیں ملک کے ۸۸ فیصد عوام کی حمایت حاصل ہے، کہا کہ یہ جاننے کے لیے اس قانون پر عوامی سروے کروالیا جائے۔ (بحوالہ سینیٹ روداد ۲۷۔ اکتوبر ۲۰۰۴)

کی طرف سے صرف ایک ہی سروے ہوا ہے جس میں ۱۵ ستمبر سے ۳۰ ستمبر تک ۱۲۵۸ سیمپل لیے گئے ہیں۔ یہ گیارہ اضلاع ہیں۔ اٹک، راولپنڈی، گوجرانوالہ، فیصل آباد، سرگودھا، جھنگ، لاہور، خانیوال، ملتان، مظفر آباد اور ڈی جی خان یہاں یہ سروے ہوا ہے۔ اس کی رو سے جو نتائج سامنے آئے ہیں وہ یہ ہیں۔

> 46.4% of the respondents wanted General Musharraf to retire in December 2004 while 37.9% said that he should retain the double offices of President and the Army Chief.

یعنی جو ایک ہی سروے ہوا ہے اس میں بھرپور اکثریت نے یہ بات بتادی ہے کہ انہیں یہ پوزیشن جاری نہیں رکھنی چاہیے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اس کے بعد اور بھی ضروری ہو گیا ہے کہ محض اندازوں پر نہیں بلکہ حقائق پر بحث کی جائے۔ رائے عامہ کا جائزہ لیجیے تاکہ پارلیمنٹ نے جو بھی رائے قائم کرنی ہے وہ باخبر ہو کر رائے قائم کرے۔ محض تاثرات اور دعوؤں پر بات نہ ہو۔ نہ میری بات چلے اور نہ مشرف صاحب کی چلے۔ آیئے عوام سے رائے لیں۔ عوام کو اگر آپ مانتے ہیں کہ وہ اصل رہنمائی کا ذریعہ ہیں۔ تو ان سے بھاگنا کسی جمہوری پارٹی اور کسی جمہوری گروپ کے لیے جواز نہیں بنتا۔ میں اپیل کروں گا سرکاری بنچوں کے لوگوں سے بھی کہ وہ اپنے مفاد کی سطح سے بلند ہو کر یہ دیکھیں کہ لوگ کیا چاہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ایک ہی طریقہ ہے کہ اسے عوام کے سامنے پیش کریں۔

(۲۷ اکتوبر ۲۰۰۴ء)

صدر جنرل پرویز مشرف کے لیے خصوصی آئینی استثنیٰ کا قانون

جناب چیئرمین! میرے پیش نظر دستور، پاکستان، پاکستان کی پارلیمنٹ اور جمہوری نظام کے مستقبل کا مفاد ہے۔ اسی پر ہمارے وجود، ہمارے استحکام اور ترقی اور ہمارے عالمی کردار کا انحصار ہے۔ یہ ایک بڑا ہی نازک لمحہ ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہم سب کی بدنصیبی ہے کہ ایک ایسا قانون (صدر مملکت کے لیے ایک اور عہدہ رکھنے کی گنجائش کا قانون) پارلیمنٹ

میں غور کرنے کے لیے بھی پیش کیا گیا ہے۔ لیکن اگر یہ آ گیا ہے تو بہر حال ہمارا فرض ہے کہ ہم نے جو عہد اپنے اللہ سے، اور جو عہد دستور کے ساتھ وفاداری کا کیا ہے اس کی روشنی میں اس پر غور کریں۔

قانون سازی کا اختیار

جناب والا! میں سب سے پہلی بات تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ قانون سازی کا اختیار مقننہ کو ہے۔ لیکن مقننہ اس معاملے میں مادر پدر آزاد نہیں۔ مقننہ قانون سازی آئینی ڈھانچے میں دیے گئے اختیارت کے اندر کر سکتی ہے۔ یہ مسلمہ اصول جمہوریت کے بھی ہیں اور اسلام کے بھی ہیں۔ پہلے اسلام کا اصول ہم اپنے ذہنوں میں تازہ کر لیں۔ اسلام کا اصول یہ ہے کہ بنیادی قانون مسلمان فرد اور مسلمان قوم کے لیے اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی ہدایت ہے یعنی قرآن اور سنت:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ..... وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ..... هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (المائدہ ۵:۴۴، ۴۵، ۴۷)

اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں... اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی ظالم ہیں... وہی فاسق ہیں۔

قرآن نے صاف کہا ہے کہ:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (سورۃ النساء ۴:۵۹)

اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنے معاملات میں اطاعت کرو اللہ کی اور اللہ کے رسول ﷺ کی اور اپنے میں سے اولو الامر کی اور جب تمہارے درمیان کوئی تنازعہ ہو یعنی اختلاف ہو تو پلٹو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف۔

گویا کہ یہ وہ حتمی دائرہ ہے۔ اس پر عمل لازم ہے۔

اسی لیے یہ اصول طے کیا گیا ہے کہ مخلوق کی اطاعت، جس کے نتیجے میں خالق کی نافرمانی آتی ہو اس کا کوئی جواز نہیں ہے۔ یہ ہمارا بنیادی اصول ہے۔ اسی لیے اگر پارلیمنٹ کی ۱۰۰ فیصد اکثریت بھی، جس چیز کو اللہ نے حرام کہا ہے اسے حلال قرار دے، تو وہ قانون ناجائز ہو گا، فاسق ہو گا، باطل ہو گا اور غلط ہو گا۔

جمہوریت کے اصول بھی یہی ہیں۔ وہ تمام ممالک جن میں تحریری دستور ہیں، وہاں قانون سازی دستور کے تابع ہوتی ہے۔ کوئی قانون جو دستور سے متصادم ہو، اگر بن بھی جائے تو وہ کالعدم/بے معنی رہتا ہے اور اس کو غیر مؤثر قرار دینے کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ حتّٰی کہ جہاں تحریری دستور نہیں ہیں، وہاں بھی یہ چیز مانی جاتی ہے کہ انسانی آزادی کی آفاقی اقدار جو مسلمہ اصول ہیں، ان کے خلاف کوئی خراب قانون سازی نہیں ہو سکتی۔ یہاں میں آپ کے سامنے ایک بڑا اہم اصولِ قانون رکھنا چاہتا ہوں۔ یہ وہ اصول ہے جو دوسری جنگ عظیم کے بعد بننے والے Nuremberg and Tokyo Tribunals نے طے کیا۔ یہ اصول قانون کی تاریخ میں ایک سنگ میل ہے۔ اس عدالت نے جس بناء پر اپنے فیصلے کیے وہ یہ تھا کہ ملک کے قانون سے بھی بالا ایک قانون ہے۔ ملک کی مقتدرہ بھی ان بنیادی آفاقی اقدار کے خلاف کوئی حکم جاری نہیں کر سکتی اور اگر کرتی ہے تو وہ قانونی نہیں ہو گا۔

جناب والا! اسی بنیاد پر میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ نیورمبرگ ٹریبونل کے اندر نازی جرمنی کے چیف جسٹس پر مقدمہ چلا ہے۔ چیف جسٹس پر الزام یہ تھا کہ اس نے انسانیت کے خلاف جو جرائم کیے جا رہے تھے ان سے نہیں روکا۔ چیف جسٹس کا دفاع یہ تھا کہ جو بھی اقدامات کیے گئے وہ مقتدرہ نے براہ راست کیے تھے اور پارلیمنٹ کے قانون کے تحت یہ کام کیے گئے تھے۔ نیورمبرگ کورٹ کا فیصلہ یہ ہے کہ پارلیمنٹ کا جو قانون آفاقی اقدار اور فطری انصاف کے خلاف ہو، وہ غیر مؤثر ہے اور انہوں نے اس بنیاد پر چیف جسٹس کو عمر قید کی سزا دی۔ (بحوالہ: www.britannica.com/event/Nurnberg-Trials)

جناب والا! میں بتانا چاہتا ہوں کہ ایک قانون جو دستور کے خلاف ہو، جو قرآن و سنت کے خلاف ہو، جو آفاقی اقدار کے خلاف ہو، اگر کوئی پارلیمنٹ اسے قانون بنا بھی دیتی ہے، تب بھی وہ قانون کی اصطلاح میں void ab initio یعنی اپنی تاریخ پیدائش سے باطل اور فاسد ہے۔ اس کی کوئی گارنٹی نہیں ہو گی۔ جناب والا! پارلیمنٹ میری نگاہ میں آج جس مخمصے سے دوچار ہے وہ یہ ہے کہ ایک ایسا قانون یہاں بنانے کی کوشش کی جاری ہے جو اپنی ابتداء سے غیر قانونی، غیر مؤثر اور الل ٹپ ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ میں آپ کو دلائل دیتا ہوں۔ سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ دستور کو دیکھیں۔ دستور کا ایک واضح ڈھانچہ ہے۔ دستور کے اس ڈھانچے کے اندر یہ باتیں طے ہو گئی ہیں اور اسی دستور پر عمل کا ہم نے حلف اٹھایا ہے۔

دستور میں صدر کی حیثیت: اس میں صدر کی جو حیثیت ہے، وہ ایک متعین اختیارات کا حامل منصب ہے۔ صدر کا عہدہ کابینہ کے نظام اور پارلیمانی نظام کا حصہ ہے۔ بلاشبہ اس دستور میں ترامیم ہوئی ہیں اور میں اعتراف کرتا ہوں کہ ان ترامیم کے ذریعہ سے جو اصل توازن تھا، وہ متاثر ہوا ہے لیکن استدلال کی خاطر جو اس وقت کی پوزیشن ہے میں چاہتا ہوں کہ اس کو لے کر آگے بڑھا جائے۔ جناب والا! اس میں صدر کی حیثیت منتظم اعلیٰ کی نہیں بلکہ سربراہ مملکت کی ہے، جو وفاق کی علامت ہے اور وہ مجبور ہے کہ جہاں جہاں دستور اسے صوابدیدی اختیار دیتا ہے، اس کے علاوہ تمام معاملات وہ وزیر اعظم کی کابینہ کے مشورے پر طے کرے۔

مسلح افواج کا کردار: جناب والا! اسی دستور نے یہ بات بھی طے کر دی ہے کہ اختیارات کا اصل منبع پارلیمنٹ ہے لیکن پارلیمنٹ آئینی ڈھانچہ تبدیل نہیں کر سکتی۔ اس ڈھانچے کے اندر وہ قانون سازی کر سکتی ہے۔ اسی کے ذریعے یہ بات بھی طے کر دی گئی کہ مسلح افواج کا کردار دفاع وطن ہے اندرون ملک اگر اس کا کوئی کردار آرٹیکل ۲۴۵ کے مطابق ہے وہ یہی ہے۔[1] یہ جو ایک جملہ چل گیا ہے کہ 'جغرافیائی و نظریاتی حدود کا دفاع فوج کا کام ہے' اس کے

---

[1] آرٹیکل ۲۴۵ کے مطابق مسلح افواج کا کردار دفاع وطن ہے۔

متعلق جناب والا! میں بڑے ادب سے عرض کروں گا کہ یہ دستور، سیاسی نظام سیاسی آداب اور جمہوریت کے خلاف ہے۔ جغرافیائی حدود کا دفاع اس کا فرض ہے۔ نظریاتی سرحدوں کا دفاع کرنا پارلیمنٹ اور قوم کا کام ہے۔ ٹھیک ہے کہ اگر کوئی نظریاتی خطرہ ہو اور وہ خطرہ ملک کی سرحدوں پر اثر انداز ہو رہا ہو، تو بلاشبہ سول نظام کے تحت فوج کو طلب کیا جائے گا، لیکن فوج خود یہ کام نہیں کر سکتی۔ فوج دفاع وطن اور سول معاملات میں انتظامیہ کی مدد کے لیے بھی، انتظامیہ کے احکامات کی پابند ہے۔ آرٹیکلز ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵ بالکل واضح ہیں۔ اس لیے میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ ہر وہ قانون جو ملک کے دستور کے ڈھانچہ کو تبدیل کرے، وہ ایک غیر مؤثر قانون ہو گا لیکن میں اس سے آگے بڑھ کر یہ بات بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اس وقت جس طریقے سے قانون کو لایا جارہا ہے، یہ تو واضح طور پر دستور سے بغاوت ہے۔ آرٹیکل ۲۴۴ کے تحت جو ضابطہ فوج کے تمام افسران کے لیے بنایا گیا ہے، میں اسے پڑھ کر سنانا چاہتا ہوں۔ حلف کے الفاظ یہ ہیں:

''میں، ....، صدق دل سے حلف اٹھاتا ہوں کہ میں خلوص نیت سے پاکستان کا حامی اور وفادار رہوں گا اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور کی حمایت کروں گا جو عوام کی خواہشات کا مظہر ہے، اور یہ کہ میں اپنے آپ کو کسی بھی قسم کی سیاسی سرگرمیوں میں مشغول نہیں کروں گا اور یہ کہ میں مقتضیات قانون کے مطابق اور اس کے تحت پاکستان کی بری فوج (یا بحری یا فضائی فوج) میں پاکستان کی خدمت ایمانداری اور وفاداری کے ساتھ انجام دوں گا''۔ اللہ تعالیٰ میری مدد اور رہنمائی فرمائے۔ (آمین)

واضح رہے 'کہ میں کسی بھی قسم کی سیاسی سرگرمیوں میں شامل نہیں ہوں گا' اس حلف کے الفاظ کا حصہ ہے۔ اگر یہ دستور لاگو ہے اور ہم نے اس کا حلف لیا ہے اور اس کے تحت ہم نظام چلا رہے ہیں تو ہر وہ چیز جو فوج، فوج کے سربراہ اور فوج کے دوسرے افسران کو کوئی سیاسی کردار دیتی ہے، وہ دستور سے بغاوت ہے اور جناب والا! دستور سے بغاوت آرٹیکل ٦ کے تحت ایک انتہائی سنگین غداری ہے۔ میں کھل کر یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ

دستور کے خلاف کوئی قانون سازی نہیں ہو سکتی اور اس وقت قانون کا جو مسودہ ہمارے زیر غور ہے، مجھے بڑے دکھ سے یہ بات کہنا پڑتی ہے کہ وہ واضح طور پر دستور کے پورے ڈھانچے اور دستور کے واضح احکامات کو روندرہا ہے۔ اس مسودہ قانون پر اس ایوان کی طرف سے تائید میری نگاہ میں سیاسی اعتبار سے اور پارلیمانی اعتبار سے ایک قسم کی خودکشی ہے۔

عہد اور معاہدات کی پابندی: دوسری بات جناب والا! میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس قانون کا ایک پس منظر بھی ہے اور پس منظر سے ہٹ کر اس پر غور نہیں کیا جاسکتا۔ اور وہ پس منظر یہ ہے کہ ۱۷ویں دستوری ترمیم کے اوپر ایک سال تک مذاکرت ہوئے۔ ان مذاکرات کے بعد ایک پیکج طے ہوا۔ اس پیکج میں ہم نے کچھ رعائتیں دیں، کچھ چیزیں چھوڑ دیں اور جواباً کچھ چیزیں طے کرائیں۔ وہ ایک مجموعی سماجی معاہدہ تھا[1] اور اس سلسلے میں، میں سینیٹر ایس ایم ظفر کی کتاب: Dialogue on the Political Chess Board (2004) جو بہت ہی بروقت آئی ہے اور جس میں اس کا پورا پس منظر، انہوں نے پوری دیانت کے ساتھ دیا ہے، آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں اور یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ اس کتاب کو انہوں نے بڑے ہی سہل انداز میں لکھا ہے۔ سب سے پہلے قرآن پاک کی سورۃ النحل کی پچانویں آیت انہوں نے دی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ:

وَلَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ اِنَّمَا عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (سورۃ النحل ۱۶:۹۵)

اور اللہ کے عہد پر تھوڑے دام مول نہ لو بے شک وہ جو اللہ کے پاس ہے تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔

اس کے علاوہ بھی قرآن میں کئی آیات اور بے شمار احادیث نبویؐ موجود ہیں کہ عہد و پیمان فطری، معتبر، اور بنیادی شے ہے اور عہد کو توڑنا بڑا گناہ ہے۔ خود ایس ایم ظفر صاحب

---

[1] معاہدے کا متن ۱۷ویں آئینی ترمیم کی تقریر کے اختتام پر دیا گیا ہے۔

نے حضرت ابو جندل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واقعہ کا حوالہ دیا ہے اور یہ بڑا تاریخی واقعہ ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب حضور اکرم ﷺ نے معاہدہ کر لیا لیکن ابھی دستخط نہیں ہوئے تھے۔ تو اس کے بعد ایک صحابیؓ اس حالت میں آئے کہ ان کو تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ ان پر ظلم ہو رہا تھا۔ وہ کسی طرح قریش کے ظلم سے جان چھڑا کر مسلمانوں کے پاس آ گئے تھے، لیکن چونکہ معاہدے میں یہ شق شامل تھی کہ قریش سے آنے والے کسی کو نہیں لیا جائے گا، قریش آئے اور اس شق کی روشنی میں مطالبہ کیا کہ آپ قیدی ابو جندلؓ کو ہمیں واپس کیجیے۔

حضرت ابو جندل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنا سارا حال بتایا لیکن حضور پاک ﷺ نے فرمایا! کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ صحیح ہے، تم مظلوم ہو، ظلم تسلیم کیا جا رہا ہے لیکن ہم نے عہد کر لیا ہے اور ہم اس عہد سے روگردانی نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ تمہاری مشکل کو آسان کر دے۔ یہ ہے جناب والا! وہ پسِ منظر جسے خود ایس ایم ظفر نے مذاکرات اور اس عمل کی بنیاد کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے یہ بات بھی بہت صاف الفاظ میں کہہ دی ہے کہ اصل مسئلہ کیا تھا؟

اصل مسئلہ تھا ہی یہ کہ اگر ہم صدر کے بالائے آئین، دستور کی حدود سے باہر اور آئینی انحرافی اقدامات کو بحالت مجبوری، ایک صورتحال سے باہر نکلنے کی حکمت عملی کے طور پر قبول کر رہے ہیں، تو اس کی وجہ سے کچھ قیمت ادا کرنی تھی اور وہ قیمت یہ تھی کہ قومی سلامتی کونسل ایک آئینی ادارے کی حیثیت سے نہیں بنے گی، دستور سے ان دفعات کو نکالا جائے گا اور یہ بات واضح تھی کہ صدارت اور فوج کے سربراہ کے دونوں عہدے جنرل مشرف ساتھ ساتھ نہیں رکھ سکتے، انہیں (جنرل مشرف کو) لازماً ان میں سے ایک عہدہ چھوڑنا ہو گا۔ پھر بات مبہم نہیں تھی، بلکہ مذاکرات کے اندر یہ وعدہ ہوا کہ وہ چیف آف آرمی اسٹاف کا عہدہ چھوڑ دیں گے، ردوکد تاریخ پر ہوتی رہی اور بالآخر یہ طے ہوا کہ ۳۱ دسمبر ۲۰۰۴ء تک وہ (جنرل مشرف) لازماً یہ عہدہ چھوڑ دیں گے البتہ اتنا اختیار انہیں ضرور دیا گیا کہ اس اثناء میں کس تاریخ کو وہ یہ کام کرتے ہیں، یہ ہم ان پر چھوڑتے ہیں۔ یہ صورتحال سے

نکلنے کی حکمت عملی تھی لیکن یہ سماجی معاہدہ کا حصہ تھی اور یہ بات بحرانی تھی اور ۱۷ویں آئینی ترمیم اس معاہدہ کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوئی تھی۔ اگر یہ معاہدہ باقی نہیں رہتا ہے تو پھر ۱۷ویں آئینی ترمیم بھی باقی نہیں رہتی، اس کا اخلاقی جواز بھی اور میری نگاہ میں قانونی و آئینی حیثیت بھی ختم ہو جاتی ہے۔

میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ اس کتاب میں ساری تفصیلات ایس ایم ظفر نے دیانتداری کے ساتھ پیش کر دی ہیں۔ ایک موقع ایسا بھی آیا جہاں ایم ایم اے کی طرف سے یہ بات کہی گئی کہ کیا ۶۳ (۱) ڈی اس کام کے لیے کافی ہے اور کیوں نا اس کے ساتھ دستور کا آرٹیکل ۴۳ (صدر کے عہدے کی شرائط) کو شامل کیا جائے لیکن جواب میں یہ بات کہی گئی کہ ہم پر اعتبار کیجیے، اس کو ہم یہاں لا رہے ہیں اس کا احترام کیا جائے گا۔ اسی پر میں آپ کو یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ صدر جنرل مشرف نے صرف ایم ایم اے سے نہیں عوام کے سامنے کہا کہ یہ ایک دستوری عہد ہے اور دستوری عہد کے بعد یہ قوم سے وعدہ ہے اور قوم سے ہی نہیں بلکہ پوری دنیا سے وعدہ ہے۔ اس میں جنرل مشرف نے صاف الفاظ میں جو بات کہی ہے اس کو دیکھنا بہت ضروری ہے ۔ میں آپ کو وہ الفاظ سنانا چاہتا ہوں تاکہ پوری چیز آپ کے سامنے آجائے۔

صدر جنرل مشرف فرماتے ہیں کہ 'آخری مسئلہ وردی کا تھا۔ یہ ایک پیچیدہ مسئلہ تھا، یہ ایک مشکل فیصلہ تھا۔ میں نے پاکستان اور بیرونی دنیا میں ہمیشہ یہ کہا کہ صدر کا وردی میں ہونا جمہوریت کا حصہ نہیں ہے۔ یہ غیر جمہوری بات ہے لیکن پاکستان کے حالات کے حوالے سے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ میں کہتا رہا ہوں کہ مجھے اس کا احساس ہے کہ یہ جمہوری نہیں اور مجھے کسی مرحلے میں یہ وردی اتارنا ہو گی۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے بہت سے خیر خواہ مجھ سے کہتے ہیں کہ میں اپنی وردی نہ اتاروں کیونکہ وہ پاکستان کی سلامتی کے لیے فکر مند ہیں، میں بھی پاکستان کی سلامتی کے لیے فکر مند ہوں، مجھے پاکستان کی ترقی کی بھی فکر ہے۔ میں نے حالات پر گہرا غور و خوض کیا اور ان کا جائزہ لیا ہے۔ میں نے اپنے آپ کو ایک طرف رکھ

کر معروضی طور پر اس کا جائزہ لیا ہے، میں نے پاکستان کی سلامتی کے لیے بھی سوچا اور سیاسی ہم آہنگی کے لیے بھی۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس مسئلے پر صحیح وقت پر فیصلہ کرنا بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ چنانچہ میں نے محسوس کیا کہ فیصلے کا یہی وقت ہے، اور مجھے فیصلہ کرنا ضروری ہے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں ۳۱ دسمبر ۲۰۰۴ء تک اپنی وردی اتار دوں گا اور چیف آف آرمی اسٹاف کے منصب سے دستبردار ہو جاؤں گا۔ اس عرصے میں، میں خود ہی قطعی تاریخ کا فیصلہ کروں گا۔ ''یہ تمام تاریخی فیصلے ہیں۔ ان فیصلوں کی وجہ سے نہ کسی کی جیت ہوئی ہے نہ کسی کی ہار، جمہوریت جیت گئی ہے اور پاکستان جیت گیا''۔ (۲۴ دسمبر ۲۰۰۳ء) [رائٹر نیوز ایجنسی] آخر میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے یہ فیصلہ کرنے میں میری رہنمائی کی۔ میں اس موقع پر پاکستانی قوم کو مبارک باد دیتا ہوں اور میں اپنی طرف سے قوم کو یقین دلاتا ہوں کہ میں پاکستان کی ترقی اور خود مختاری پر کوئی آنچ نہ آنے دوں گا۔ اللہ ہم سب کی حفاظت کرے۔

جناب والا! میں نے یہ پورا بیان آپ کو پڑھ کر سنایا ہے۔ کہ یہ ایک فیصلہ تھا۔ ایک وعدہ اور ایک دستوری پابندی تھی۔ یہ محض ایک مشورہ یا ترجیح کا اختیار نہیں تھا۔ اختیار صرف اتنا تھا کہ ۳۱ دسمبر ۲۰۰۴ء سے پہلے پہلے اگر وہ چاہیں تو کسی بھی وقت اکتوبر یا نومبر میں وہ یہ کام کر دیں لیکن یہ واضح تھا کہ وہ اس کو زیادہ سے زیادہ ۳۱ دسمبر تک لازماً کریں گے۔ یہ اختیار نہیں تھا کہ ۳۱ دسمبر کے بعد بھی اس کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ اب جناب والا! ایک لطیف نکتہ اٹھایا گیا ہے کہ آرٹیکل ۴۱ میں لکھا ہوا ہے کہ:

notwithstanding anything in the constitution.

جناب والا! میں نے بھی اس کو پڑھا ہے لیکن میں آپ سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آرٹیکل ۴۱، ایک جامع آرٹیکل ہے۔ اور اس آرٹیکل ۴۱ کے اندر شق ۷ جس میں یہ ترمیم کی

گئی ہے کہ ۶۳ (ون) ڈی، ۳۱ دسمبر سے نافذ ہو گی، یہ احاطہ کرتی ہے[1]۔ اس پورے اقرار کو اور اس استثنیٰ کے لیے جو otherwise standing کی بناء پر نکلتی ہے اس کو استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ تو میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ یہ ایک دستوری پابندی ہے۔

اب یہ سوال ہو سکتا ہے کہ کیا اس میں ترمیم ہو سکتی ہے۔ جناب والا! ۶۳ (ون) ڈی کے اندر ایک ضمیمہ موجود ہے کہ کسی عہدے کو قانون کے ذریعے سے مستثنیٰ کیا جاسکتا ہے۔ لیکن میں بڑے ادب سے عرض کروں گا اور محض قانونی موشگافی نہیں کر رہا ہوں۔ بلاشبہ یہ باریک قانونی اور ایک اخلاقی نکتہ ہے اور وہ یہ کہ آرٹیکل ۴۱ (۷) میں ۱۷ ویں ترمیم کے ذریعے جو ترمیم کی گئی، وہ عمومی نہیں تھی وہ مخصوص تھی۔ جنرل پرویز مشرف کے دوسرے عہدے کو جاری رکھنے پر اس وقت جو قانون لایا جارہا ہے وہ بھی عمومی نہیں ہے، کہ ہر سربراہ مملکت دو عہدے رکھ سکتا ہے بلکہ صرف موصوف کے لیے یہ لائی جارہی ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایک دستوری ترمیم کے ذریعے سے ایک مخصوص تاریخ اور مخصوص فرد کے لیے فیصلہ دستور کے اندر کیا گیا تو پھر آرٹیکل ۶۳ (ون) ڈی کی یہ شق کہ کسی عہدے کو مستثنیٰ کیا جاسکتا ہے وہ اس پر لاگو نہیں ہو سکتی۔ وہ ان عہدوں پر تو لاگو ہو سکتی ہے جن کا دستور نے احاطہ نہیں کیا۔ بات عمومی عہدوں کی نہیں ہو رہی، بات مخصوص ہے۔ اس لیے جو چیز خاص طور پر دستوری ترمیم کے ذریعے سے طے کر دی گئی ہے، اس کے لیے کوئی قانون سازی ہو ہی نہیں سکتی۔ چونکہ یہ دستور کی ترمیم نہیں بلکہ یہ سادہ قانون کے ذریعے ایک ڈھونگ رچایا جارہا ہے۔ یہ آئین تباہ کیا جارہا ہے اس لیے اس کا کوئی قانونی یا سیاسی جواز نہیں ہو سکتا۔

جناب والا! خالص قومی نقطۂ نظر سے میں سمجھتا ہوں کہ یہ دستور کے پورے ڈھانچے کو سبوتاژ کرنا ہے جس میں صدر کا رول متعین کر دیا گیا ہے۔ اس سے بھی زیادہ خطرناک

---

[1] آرٹیکل ۲۳ (ون) ڈی: وہ پاکستان کی ملازمت میں کسی منفعت بخش عہدے پر فائز ہو یا سوائے ایسے عہدے کے جسے قانون کے ذریعے ایسا عہدہ قرار دیا گیا ہو جس پر فائز شخص نااہل نہیں ہوتا۔

اخلاقی پہلو معاہدے سے فرار اور اس کی خلاف ورزی ہے۔ یہ اخلاقی نقطۂ نظر سے نہایت شرمناک ہے۔ ایک اعلیٰ ترین عہدے پر فائز شخصیت کی جانب سے پارلیمنٹ کے سلسلے میں یہ خلاف ورزی محض ایسی اخلاقی چیز نہیں ہے، جس کے سیاسی اور قانونی اثرات نہ ہوں۔ میری نگاہ میں اعتبار اور قانونی جواز دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ جو سربراہ مملکت اور جو معاہدے کے فریق اور جو پارلیمنٹ ایسے معاملات کو طے کرنے کے بعد اس سے فرار، انحراف یا اس کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کرے وہ صرف اپنا اعتبار ہی ختم نہیں کرے گی، بلکہ وہ اپنا قانونی جواز بھی ختم کرے گی، اور قانونی جواز ختم کرنے کے بعد مسئلہ صرف فوج کے سربراہ کا نہیں پھر صدر مملکت اور پارلیمنٹ کا بھی ہو گا۔ جناب والا! یہ ایک خطرناک معاملہ ہے۔ اس کے بعد میں دوسری بات یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مسئلہ محض ایک فرد کا نہیں ہے۔ ٹھیک ہے اس وقت صدر پرویز مشرف کا ۳۱ دسمبر کے بعد چیف آف آرمی سٹاف کے عہدے کو جاری رکھنے کا مسئلہ ہے، لیکن دراصل یہ علامت ہے اس بات کی کہ ملک کی سیاست میں فوج کا کردار کیا ہو گا۔ شخصی حکمرانی اور فوجی حکمرانی یہ دونوں ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔

افواج پاکستان کے دو جنرلوں کی رائے: جناب والا! میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں اور اس سلسلے میں مجھے اجازت دیجیے کہ میں دو اہم فوجی افسران ہی کی آپ کو رائے بتادوں۔ ایک جنرل اسد درانی ہیں جو انٹر سروسز انٹیلی جنس کے چیف رہے ہیں اور سفارتی ذمہ داریاں بھی انہوں نے ادا کی ہیں۔ انہوں نے ابھی ایک مضمون لکھا ہے، اور اس میں بڑی بنیادی بات کہی ہے جو میں چاہتا ہوں کہ آپ کے سامنے اور خود پوری فوج اور فوج کے سربراہ کے سامنے آئے۔

> حتمی بات یہ ہے کہ ان (جنرل مشرف) کا وعدہ اب ہمارے آئین کا حصہ تھا، بنا کسی معقول سیاسی وجہ کے اسے توڑا نہیں جاسکتا۔ کم از کم یہ اچھا نہیں ہو گا۔

وہ مزید کہتے ہیں کہ:

مجھے یقین نہیں ہے کہ صدر صورت حال کو مزید پیچیدہ بنانے کی خواہش رکھتے ہیں۔ ممکن ہے کہ کچھ لوگ موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے نشستوں پر براجمان ہو جائیں یقیناً یہ احمقانہ بہادری ہو گی۔

میں چاہتا ہوں جو کہ آپ سب غور سے سنیں۔

بد نظمی و انتشار کا الزام ایک جنرل کی وردی کی ہوس پر لگایا جائے گا۔ یہ شرمناک بات ہو گی۔ اگر وردی تحفظ نہ دے سکی تو میں نہیں سمجھتا کہ صرف صدر تنہا جنگ لڑ سکتا ہے۔

جناب والا! جنرل کے ایم عارف کی کتاب "Khaki Shadow" جس کا مقدمہ، میرے محترم دوست وسیم سجاد نے لکھا ہے۔ ذرا یہ بھی سامنے رہے۔ یہ بڑی اہم کتاب ہے اور ایک سابق وائس چیف آف آرمی اسٹاف نے لکھی جو جنرل ضیاء الحق کا چیف آف سٹاف بھی تھا۔ اس کتاب میں فوج کے سیاست میں ملوث ہونے کی پوری کہانی ہے۔ اس کی کیا قیمت قوم نے ادا کی ہے۔ کیا اس کے مثبت پہلو تھے اور کیا اس کے منفی پہلو تھے، یہ سب اس کے اندر موجود ہے۔ زیادہ وقت نہیں ورنہ میں آپ کو اور تفصیل سے چیزیں سناتا لیکن یہ جو خلاصہ میں سنا رہا ہوں یہ سننے کے لائق ہے، وہ کہتے ہیں:

(ترجمہ): ''فوج نے سیاسی طاقت کا بھی مزہ چکھا، نشہ آور اور تلخ اور اس عمل میں سب سے اہم سبق سیکھا گیا کہ سیاست اور سپاہ گری دونوں کل وقتی پیشے ہیں، جن میں سے ہر ایک کو الگ الگ توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ پاکستان میں فوجی مداخلتوں نے ملک اور خود فوج کے لیے بھاری قیمت برداشت کی۔ دونوں کے بہترین مفاد میں ہے کہ اس نقصان سے دور رہا جائے۔ فوج پر ایک بڑی ذمہ داری ہے اور اس کا ایک روشن مستقبل ہے۔ ملک کا مستقبل جمہوریت کے ساتھ لازمی طور پر وابستہ ہے''۔

یہ سپاہ گری اور صدارت ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔ اس کے چلنے کے معنی ملک کے مفاد کو نقصان ہے اور اس کے معنی فوج کا نقصان ہے۔ سیاست میں شرکت فوج سے ہمدردی نہیں بلکہ فوج کے ساتھ ظلم ہے۔ یہی پیغام ایوب، یحییٰ اور ضیاء کے ادوار اور اب مشرف دور کا ہے۔ ہمیں آنکھیں کھول کر ان تمام چیزوں کو سمجھنا چاہیے اور اس بارے میں ایک صحیح مؤقف اختیار کرنا چاہیے۔

فوج اور عوام کا تعلق: جناب والا! میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ فوج کے ساتھ جو زیادتی ہو رہی ہے اور فوج کو جس طرح اپنے ذاتی، سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی جارہی ہے یہ اس ملک کے ساتھ اور فوج کے ساتھ دوستی نہیں ہے، یہ دشمنی ہے۔ جناب والا! میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں میرے پاس سارا مواد موجود ہے کہ لوگ آپ [فوج] کے بارے میں کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ صرف پچھلے تین مہینے کے Herald اور Newsline کو دیکھ لیجیے آپ کو اندازہ ہو گا کہ فوج کے بارے میں لوگوں کے احساسات اور جذبات کس طرح متاثر ہوئے ہیں۔ اگر اس ملک کی فوج کو دفاعی قوت رہنا ہے اور یہ بہت ضروری ہے تو اس کی عزت اور احترام اور اس کے لیے محبت برقرار رہنی چاہیے۔ ہم اس فوج کو ایک مستحکم اور جاندار دفاعی قوت دیکھنا اور بنانا چاہتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے وہ لوگ جن کے ہاتھوں میں اس وقت فوج کی قیادت ہے وہ فوج کو ایسے کانٹوں کی وادی میں لے جارہے ہیں جہاں مجھے ڈر ہے کہ پھر عوام اور فوج ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہوں گے۔ خدانہ کرے کہ وہ وقت آئے لیکن جس قوم اور جس ملک میں بھی فوج اور قوم کے درمیان تصادم ہوا ہے وہاں فوج بچی ہے اور نہ ملک۔ ایران کو دیکھ لیں، چلی کو دیکھ لیں دنیا کے کسی بھی ملک کو دیکھ لیں۔ خدا کے لیے فوج کو اس سمت میں نہ لے کر جائیں، فوج کے لیے بھی یہ ضروری ہے اور ملک کے لیے بھی ضروری ہے کہ دونوں دھارے الگ الگ ہوں۔ فوج پوری قوم کی متفق علیہ اور غیر متنازعہ دفاعی قوت ہو، جب ہی وہ اپنا فرض ادا کر سکتی ہے۔

کمان کی یکجائی کی بحث: جناب والا! جنرل مشرف اور ان کے کچھ حواری ملک کے استحکام،

پالیسیوں کے تسلسل، دہشت گردی کے خلاف جنگ اور اقتصادی اصلاحات کی وجہ سے کمان کی یکجائی کی بات کر رہے ہیں۔ یہ بڑا ہی عجیب اور تکلیف دہ معاملہ ہے۔ میں گزارش کروں گا کہ آپ جنرل پرویز مشرف کے BBC کو دیئے گئے انٹرویو کو غور سے پڑھ لیں۔ اس انٹرویو کا تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔

ایک سوال کے جواب میں وہ کہتے ہیں:

ترجمہ: ''اب ہم تیزی سے الیکشن کی طرف جا رہے ہیں۔

صحافی نے پوچھا کہ کیا پاکستانی چاہتے ہیں کہ آپ بطور صدر رہیں؟

اب اکتوبر (الیکشن) میں کیا ہوتا ہے، ہم دیکھیں گے''۔

اس کے بعد وہ کہتے ہیں، میں Unity of command کا قائل ہوں۔ پھر Unity of command کے بارے میں ان کی جانب سے بڑی اہم بات ہمارے سامنے آتی ہے۔ ان سے جب سوال کیا گیا کہ: ''کیا اس کا مطلب صدر کے لیے زیادہ طاقت ہے''۔

جواباً کہتے ہیں: ''نہیں مجھے بالکل بھی یقین نہیں، اس لفظ ''اختیار'' کو حقیقت میں کسی نے کبھی نہیں سمجھا۔ ''اختیار'' کیا ہے؟ ''اختیار'' سے واقعی ہمارا کیا مطلب ہے، فوج سے ہونے کی وجہ سے مجھے کمان کی یکجائی پر پختہ یقین ہے آپ کمان کو دو حصوں میں تقسیم نہیں کر سکتے لہٰذا مجھے پختہ یقین ہے کہ حکومت کو چلانے کے لیے اختیارات وزیر اعظم پاکستان کے پاس ہونا ضروری ہے''۔

''میں دہراتا ہوں کہ: میں پختہ یقین رکھتا ہوں کہ حکومت کرنے کی طاقت، حکومت چلانے، ملک چلانے کا اختیار وزیر اعظم پاکستان کے سپرد ہونا چاہیے۔ لیکن اس کی کارکردگی پر ایک چیک اینڈ بیلنس ہونا ضروری ہے، سمجھا جاتا ہے کہ وہ اچھی طرح سے کام کریں گے۔ اسے جمہوری انداز میں ایمانداری کے ساتھ کام کرنا ہے اور اسی جگہ پر نگراں کے کردار کی ضرورت ہے۔ تو اختیار نہیں ہے،

نگراں کا کردار اختیار نہیں ہے، حکومت کو چلانے اور چلانے کی طاقت ہی اختیار ہے"۔

جناب والا! معلوم ہے کہ انہوں نے یہ وعدہ کیا تھا کہ جمہوریت کی بحالی کے نتیجے میں Unity of command کے بعد منتظم اعلیٰ پرائم منسٹر ہو گا۔ اب یہ کہا جارہا ہے کہ اگر میں وردی نہ رکھوں تو میں کمزور ہو جاؤں گا، میری بات میں وزن نہیں رہے گا، میری باتیں چل نہیں پائیں گی اور پالیسی میں تبدیلی آجائے گی۔ میں ایوان کے اپنے بھائیوں کو دعوت دیتا ہوں کہ ذرا اس پر غور کریں کہ اس کے معنی کیا ہیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ وزیر اعظم قابل اعتماد نہیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ حکمران جماعت قابل اعتماد نہیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ کابینہ قابل اعتماد نہیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ فوج قابل اعتماد نہیں، جب تک کہ یہ سب ایک شخص کی گرفت میں نہ ہو پالیسیاں بدل جائیں گی۔

جناب والا! اس پارلیمنٹ، حکومت اور اس وزیر اعظم پر اس سے بڑا عدم اعتماد کا اظہار نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے یہ بات بار بار کہی ہے اور اس سلسلے میں، میں آپ سے اجازت چاہوں گا کہ جو بڑا اہم انٹرویو انہوں نے نیو یارک میں دیا ہے، وہ آپ کے سامنے پیش کروں۔ اس سے آپ کے سامنے ان کا ذہن آتا ہے، میں اپنی طرف سے بات نہیں کروں گا گو اس کے لیے بھی بڑا مواد موجود ہے میں صرف مختصراً حقائق ایوان کے سامنے رکھتا ہوں۔

> نیو یارک میں ان سے سوال کیا گیا: "آپ صدر پاکستان کی حیثیت سے وردی کے بغیر کام کیوں نہیں کر سکتے"؟
>
> وہ جواب دیتے ہیں: "ٹھیک ہے، میں کر سکتا ہوں۔ لیکن یہ تاثر کی بات ہے۔ اگر یہ تاثر ہو کہ میں کمزور ہو گیا ہوں تو سیاسی عدم استحکام پیدا ہو سکتا ہے۔ اس کی علامات خود لوگوں کے ذہنوں میں ظاہر ہوں گی۔ نظام کمزور ہو جائے گا۔ فوج انسداد دہشت گردی مہم میں مصروف ہے، جس میں ہمت اور حوصلے کی ضرورت

ہے اور آپ کو کئی خدشات لاحق ہوں۔ اگر آپ آرمی چیف نہیں ہیں تو کیا آپ آرمی کو دہشت گردی کے خلاف مہم میں دیکھ سکتے ہیں"۔

خدا کے لیے سوچیں، آپ کیا کہہ رہے ہیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ آرمی چیف ملک کو چلا رہا ہے۔ صدر، کابینہ، پارلیمنٹ کی حیثیت عملاً ان کے تابع ہے۔ اگر میں (جنرل مشرف) خود آرمی چیف نہ ہوں تو پھر آرمی کہیں اور چلی جائے گی، میں کہیں اور چلا جاؤں گا۔ اگر میں آرمی چیف نہ ہوں تو وزیر اعظم کہیں اور جائے گا، پارلیمنٹ کہیں اور جائے گی، کابینہ کہیں اور جائے گی، اس سے زیادہ بے حسی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ یہ تحفظ نہیں عدم تحفظ کا احساس ہے۔ جنرل مشرف نے اپنے عدم تحفظ کو ادارتی کر دیا ہے۔ جب بھی آپ ایک فرد واحد کے پاس یہ سارے اختیارات رکھیں گے، تو آپ سمجھ لیں کہ استحکام اور تحفظ کبھی نہیں آسکتا۔ اس سے زیادہ عدم تحفظ کی صورت حال کہیں اور ممکن نہیں۔ آگے چل کر وہ (جنرل مشرف) جو کچھ فرماتے ہیں وہ بھی بڑی دلچسپ بات ہے۔ موجودہ حکومت میں جو لوگ بڑھ چڑھ کر تائید کر رہے ہیں، ان سے خاص طور پر کہتا ہوں کہ وہ ذرا سن لیں کہ صدر جنرل مشرف نے کیا بات کہی ہے۔ ان سے سوال کیا گیا۔

ترجمہ: پچھلے پانچ سالوں میں آپ کو ان چیزوں کو درست کرنے کے لیے کافی وقت ملا تھا۔ آپ نے کیوں نہیں کیا۔

ذرا جواب سنیئے۔ فرماتے ہیں:

جواب: "ٹھیک ہے، ہم بہت ساری تبدیلیاں لائے ہیں۔ ان میں سے کچھ مکمل نہیں ہوئی ہیں۔ لیکن میں نے صرف تین سال حکومت کی، پھر ۲۰۰۲ء میں انتخابات کے بعد مسٹر ظفر اللہ جمالی تشریف لائے۔ ان کی کارکردگی کا میں ذمہ دار نہیں ہوں لیکن اس تبدیلی اور معاملے میں مزید وقت درکار ہے جو کام ہم نے شروع کیا ہے تمام اصلاحات اور کام کی تنظیم نو کے مکمل ہونے کے لیے"۔

(رپورٹر) پھر پوچھتا ہے کہ:

سوال: لیکن جمالی نے دو مہینے پہلے ہی استعفی دے دیا تھا، اور پھر بھی لوگوں کو، آپ کے بارے میں تحفظات تھے وہ واپس آ گئے۔ یہ کیسے ہوا؟

فرماتے ہیں:

جواب: سنو، ٹیم قائد کے ساتھ چلتی ہے۔ وہ انجن کی طرح ہے۔ دوسرے گاڑی کے ڈبوں کی طرح ہیں۔ چونکہ قائد انجن ہوتا ہے، لہٰذا ڈبے وہیں جاتے ہیں جہاں انجن لے جاتا ہے۔ لہٰذا، اگر انجن خراب ہے تو وہ بھی خراب ہوں گے"۔

یہ کابینہ، یہ وزیر اعظم، سابق وزیر اعظم، یہ حکمراں جماعت ان سب کو اس آئینے میں اپنی تصویر دیکھنی چاہیے۔

سوال: لیکن ماضی میں بدعنوانوں کو کیوں نہیں ہٹایا گیا؟

جواب: سنیئے رکاوٹیں، داخلی اور علاقائی مسائل تھے۔ ہمیں دیگر خدشات بھی تھے۔ اصلاحات کی ضرورت اور دہشت گردی کے خلاف جنگ جیسے معاملات کے مابین ایک توازن قائم کرنا ہوگا۔ ہمارے یہاں مثالی صورتحال نہیں ہے۔ ہر چیز کے بارے میں میرٹ پر فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارے پاس مثالی ماحول نہیں ہے۔ اگر ہم کسی ایسے شخص کو لیتے ہیں جس کی خراب ساکھ ہوتی ہے اور اسے کام پر لگاتے ہیں تو ہمیں ایسا کرنا ہوتا ہے"۔

جناب والا! میں حوالہ دے رہا ہوں، میں چاہ رہا ہوں کہ یہ لوگ ذرا غور کریں کہ کیا اس نظام پر اس سے زیادہ بے اعتمادی کوئی اور کر سکتا ہے۔ مجھ (سینیٹر پروفیسر خورشید) پر آپ تنقید کرتے ہیں کہ تم ان پر تنقید کر رہے ہو۔ ذرا سوچیئے کہ آپ کو کیا سرٹیفکیٹ دیا جارہا ہے اور جو اختیار لیا جارہا ہے، وہ کیوں لیا جارہا ہے، وہ اس لیے لیا جارہا ہے کہ پارلیمنٹ کام نہیں کر سکتی، وہ اس لیے لیا جارہا ہے کہ کابینہ بھی کام نہیں کر سکتی اور وزیر اعظم بھی نہیں کر سکتا

اور وہ اس لیے لیا جارہا ہے کہ فوج نہیں کر سکتی ہے۔ الاّ یہ کہ ایک خاص فرد وہ صدر بھی ہو اور فوج کا سربراہ بھی ہو۔ Unity of command کے اصول کے تحت وزیر اعظم کو چیف ایگزیکٹو بنادے لیکن اصل کمانڈ اسی کے پاس ہونی چاہیے۔

آمریت سے استحکام اور ترقی نہیں آتی: جناب چیئرمین! مجھے اجازت دیں، یہ بڑا اہم مسئلہ ہے، یہ کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ جناب والا! میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ جو کہا جارہا ہے کہ وردی ضروری ہے، اس کے معنی دراصل یہ ہیں کہ یہ پورا نظام کاغذی ہے۔ کسی ادارے میں استحکام نہیں ہے اور اس کے معنی آمریت کا قیام اور جمہوریت کی نفی ہے۔ ٹھیک ہے کہ صدارتی نظام میں بھی جمہوریت ہوتی ہے، لیکن جو ہم بنارہے ہیں، وہ کیا ہے۔ وہ ایک قسم کی فوجی آمریت اور فوج کا سیاست میں دائمی کردار یقینی بنانا ہے اور یہ وہ چیز ہے، جسے یہ قوم کبھی بھی قبول نہیں کرے گی۔ اس کے لیے ہمیں جو قربانی دینی پڑے گی، ہم وہ دیں گے۔

جناب والا! میں یہ بات صاف کہنا چاہتا ہوں کہ جن حالات سے ہم سب گزر رہے ہیں اس کا کوئی اختتام نہیں ہے۔ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جو بات آج جنرل مشرف کر رہے ہیں یہی بات ایوب خان نے کہی تھی۔ یعنی استحکام اور ترقی، بعد ازاں یہی بات جنرل ضیاء الحق نے کہی تھی۔ لیکن استحکام اور ترقی نہ ایوب خان کے زمانے میں آئی، نہ ضیاء الحق کے زمانے میں اور نہ اب اس زمانے میں آرہی ہے۔

ایک مشہور امریکی مصنف Stephen Cohen کی ایک کتاب "The Idea of Pakistan" فوج کے تعاون سے آئی ہے۔ جناب والا! اگر آپ اجازت دیں تو میں اس سے ایک حوالہ آپ کو سنادوں۔ جس میں وہ کہتا ہے کہ اگر پانچ سال مشرف برسر اقتدار رہ کر استحکام اور ترقی نہیں دے سکے، تو پھر اگلے چار سالوں میں بھی نہیں دے سکتے تو پھر اس کی رائے کیا ہوئی؟

جناب والا! میں آگے بڑھنے سے پہلے یہ بات بھی کہنا چاہتا ہوں کہ ہم (ایم ایم اے)

پر دو تین اعتراضات کیے گئے ہیں۔ مجھے موقع دیں کہ میں ان کی بھی وضاحت کر دوں۔ لیکن اس سے پہلے میں ایس ایم ظفر کا مشکور بھی ہوں میں نے ان کے بہت سے اقتباسات نشان زد کیے ہوئے ہیں لیکن وقت کی قلت کی بنا پر سارے نہیں پڑھ سکتا۔ البتہ ان کا ایک فقرہ ضرور سنانا چاہتا ہوں۔ ایک بات بڑی تفصیل سے انہوں نے کی اور وہ یہ تھی کہ ۱۷ویں ترمیم کا اصل مقصد صرف ایک تھا اور وہ یہ کہ فوج کی سیاست میں مداخلت کو ختم کر دیا جائے۔ ٹھیک ہے ہم نے اس حوالہ سے فعال کردار ادا کیا اور اس کے لیے مہلت دے دی۔ لیکن اس کا اصل جواز کیا تھا یہ بیان کرنے کے لیے انہوں نے اپنی جو تقریر یہاں کی تھی اسے حوالے کے طور پر اپنی اس کتاب .Dialogue on the Political Chess Board میں پیش کیا ہے میں اس کو دہرانا چاہتا ہوں۔ وہ کہتے ہیں:

ترجمہ: ”جناب! میں اب اپنی آخری بات کی طرف آتا ہوں۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہمیں آگے کی طرف دیکھنا چاہیے اور آگے بڑھنا ہو گا۔ ہم نئے ہزاریہ (۲۱ویں صدی) میں ہیں۔ اب یہ وقت ہے کہ ہم سب تمام پارلیمنٹیرین، سیاسی رہنما اور کارکن اور مسلح افواج کے تمام اراکین عہد کریں کہ اب فوج کی طرف سے کوئی مداخلت نہیں ہو گی۔ لیکن ایک سرگرم اور اچھے معاشرے کی حقیقت کو ہم اچھی حکمرانی اور پارلیمنٹ کے ذریعے حاصل کریں گے“۔

تو جناب والا! اصل مسئلہ یہی تھا۔ میں ایک بار پھر اس نکتہ کو توجہ کا مرکز بنانا چاہتا ہوں کہ جو قانون آرہا ہے، اگر یہ بدقسمت پارلیمنٹ خدانخواستہ اسے پاس کر دیتی ہے تو میری نگاہ میں، قانون اور دستور کی نگاہ میں اور اخلاقی اور سیاسی طور پر وہ بُرا قانون ہو گا۔ وہ ہمارے اس سماجی معاہدے اور اس وژن پر کہ ہم کس طریقہ سے فوج کو سیاست سے الگ کریں، چھرا گھونپنے کے مترادف ہو گا۔

۱۷ویں ترمیم کے حوالہ سے عہد شکنی کی بحث

جناب والا! میں آپ کی اجازت سے صرف دو تین باتیں بطور وضاحت عرض کرنا چاہوں گا۔ کہا گیا ہے کہ ایم ایم اے نے اعتماد کا ووٹ نہ دے کر وعدہ خلافی کی ہے۔ جناب والا! اس سے بڑا جھوٹ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس ضمن میں خود ایس ایم ظفر صاحب کی کتاب گواہ ہے کہ ایم ایم اے نے کسی مرحلہ پر یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ ہم اعتماد کا ووٹ دیں گے۔ اس کے برعکس یہ بات معاہدے کے اندر تحریر ہے کہ ایم ایم اے صدر کی موجودہ ٹرم کو قانونی جواز دینے کے لیے ترمیم کی حمایت کرے گی لیکن اس کے ارکان صدر کی حمایت کے لیے ووٹ دینے کے پابند نہیں ہوں گے (معاہدے کا متن تقریر کے اختتام پر دیا جارہا ہے)۔ ہم نے صرف ایک پابندی قبول کی تھی کہ ایوان میں موجود رہیں گے اور اس کے خلاف ہم کوئی سرگرمی نہیں کریں گے اور ہم نے لفظاً و معناً اس کو پورا کیا ہے۔

دوسرے ہمارا مؤقف یہ تھا کہ قومی سلامتی کونسل دستوری ادارہ نہیں بنے گی البتہ اگر حکومت چاہے اور اس کے پاس اکثریت ہے تو وہ اسے پارلیمنٹ کے ایک قانون کے طور پر لاسکتی ہے۔ ہم نے کہیں یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ ہم اس کی تائید کریں گے۔ بلکہ ہم نے صاف کہا تھا کہ آپ اپنی اکثریت کی بناء پر جو قانون لانا چاہیں لاسکتے ہیں لیکن ہم اس میں پارٹی بننے کو تیار نہیں۔ اس کے باوجود جناب والا! جب یہ قانون آیا ہے ہم نے اس پر نہ صرف بات چیت کی کوشش کی بلکہ اسمبلی اور سینیٹ میں بھی ترامیم پیش کیں۔ حکومت نے کوئی مذاکرات نہیں کیے نہ ہی اسے قابل قبول بنانے کے لیے کوئی کوشش کی۔ ہمیں اب اس کے بارے میں کوئی دوش نہیں دیا جاسکتا۔

لیکن ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ دستور کی ۱۷ویں ترمیم ایک فراڈ اور دھوکہ دہی کی بنیاد پر منظور کرائی گئی ہے۔ بعد کے واقعات نے واضح کر دیا ہے کہ شروع سے ہی ذہن کچھ اور تھا اور یہاں کہا کچھ اور گیا۔ ایس ایم ظفر صاحب نے اپنی کتاب کی پشت پر اقبال

کا جو شعر دیا ہے وہ اس حوالہ سے حقیقت کی درست ترجمانی ہے۔ ؎

بے چارہ پیادہ تو ہے اک مہرہ ناچیز
فرزیں سے بھی پوشیدہ ہے شاطر کا ارادہ

شاطر کا ارادہ کیا تھا؟ بعد کے واقعات واضح کر رہے ہیں کہ شاطر کا ارادہ فراڈ اور دھوکہ دہی تھا۔ یوں ۱۷ ویں آئینی ترمیم کے وجود پر ہی سوال اٹھتے ہیں۔ در حقیقت کوئی بھی قانون، معاہدہ، یا پالیسی جو دھوکہ دہی اور فراڈ پر مبنی ہو وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔

جناب والا! میں آپ کو یاد دلاؤں کہ امریکہ میں فراڈ اور دھوکہ دہی، غلط اطلاعات دینا، حقائق کو چھپانا، صدر امریکہ کے خلاف مواخذے کے لیے کافی وجہ ہے۔ سابق امریکی صدر کلنٹن کے مواخذے کی روداد ذرا پڑھ لیجیے۔ اخلاقی نوعیت جو بھی ہو لیکن امریکی سینیٹ اصل میں جس مسئلہ کو چیک کر رہا تھا وہ یہ تھا کہ صدر نے غلط بیانی یا جھوٹ تو نہیں بولا ہے اور وہ دھوکہ دہی اور فراڈ کے خطاکار تو نہیں ہیں؟ چنانچہ اگر یہ سارا کا سارا معاملہ فراڈ اور دھوکہ دہی پر مبنی تھا تو آپ جانتے ہیں کہ فوج کے ضابطوں میں بھی اور بین الاقوامی قانون کے اندر بھی کوئی معاہدہ جو دھوکہ دہی اور فراڈ پر مبنی ہو وہ معاہدہ نہیں رہتا۔

جناب والا! یہ ہے اصل پوزیشن۔ دوسری جانب ۱۷ ویں آئینی ترمیم کے ساتھ کا ایک واضح فیصلہ یہ تھا کہ وزیر اعظم پارلیمنٹ کے ۱۲ افراد پر مشتمل ایک کمیٹی بنائیں گے جو فوجی دور میں آئے تمام قوانین، بشمول آئینی ترامیم اور ایل ایف او پر غور کرے گی اور اس غور کے نتیجہ میں یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ کوئی قانون یا ترمیم جاری رہنی چاہیے یا نکال دینی چاہیے۔ اس بارے میں کمیٹی کی رپورٹ پارلیمنٹ کے سامنے لائی جائے گی۔ جناب والا! دوسری دھوکہ بازی یہ کی گئی ہے کہ وہ کمیٹی بنائی ہی نہیں گئی اور نہ ہی اس حوالہ سے کوئی کام کیا گیا۔ یہ اعلانیہ پالیسی تھی، ایوان کے اندر اعلان کی گئی اور معاہدے کے اندر موجود ہے۔ ایس ایم ظفر کی کتاب اٹھا کر دیکھ لیجیے اس کے اندر بھی یہ چیز واضح طور پر موجود ہے کہ ایک

کمیٹی بنائی جائے گی جو مارشل لاء دور کے قوانین کو چیک کرے گی۔

جناب والا! میں فوج کی قیادت کی جانب سے اس نوعیت کی بدعہدیوں پر اپنے شدید غم اور دکھ کا اظہار بھی کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے یہ بات پارلیمنٹ میں مذاکراتی ٹیم سے بھی کہی ہے اور آج میں اس کو پھر ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں کہ جنرل ضیاء الحق کے ساتھ جب ۱۹۸۵ء میں ایک آئینی ترمیم پر بات ہو رہی تھی۔ اس وقت مذاکراتی ٹیم نے ان سے بار بار اصرار کیا کہ انہیں فوجی وردی اتار دینی چاہیے۔ جنرل کے ایم عارف ان کے ساتھی تھے۔ میں اس حوالہ سے جنرل عارف کو خراج تحسین بھی پیش کرنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے بھی کھل کر اس کا اظہار کیا کہ مارشل لاء اور جمہوریت ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔ اس تناظر میں جب یہ طے ہوا کہ مارشل لاء ۳۱ دسمبر ۱۹۸۵ء سے ختم ہو گا، تو ساتھ ہی جنرل ضیاء کا یہ وعدہ تھا کہ وہ وردی اتار دیں گے۔ انہوں نے ہم سے وعدہ کیا تھا۔ اس کے باوجود جب انہوں نے اپنی تقریر میں اس کا اعلان نہیں کیا تو ہم نے ان کو تقریر کے دوران چٹ بھیج کر متوجہ کیا کہ آپ کا وعدہ تھا لیکن آپ نے یہ اعلان نہیں کیا۔ انہوں نے وہ چٹ اپنی جیب میں رکھ لی اور کوئی اعلان نہیں کیا۔ مجھے خوشی ہے کہ جنرل عارف نے ایمانداری سے کام لیا ہے اور انہوں نے کتاب میں اس واقعے کو اس پورے پس منظر کے ساتھ بیان بھی کر دیا ہے۔

اسی طرح کے تجربات کی بناء پر ہم نے کہا تھا کہ اب یہ ضروری ہے کہ یہ چیز دستوری ترمیم کا حصہ ہو کہ ایک sunset clause اور ایک cut off date مقرر ہو۔ sunset clause کے معنی Sunset ہوتے ہیں sunrise نہیں ہوتے۔ cut off کے معنی یہ ہیں کہ وہ آخری تاریخ ہو۔ چنانچہ ہم نے اس کو شامل کر لیا۔ لیکن اب اس سے بڑا فراڈ اور اس سے بڑی دھوکہ بازی اس قوم کے ساتھ اور دستور کے ساتھ کی جا رہی ہے اور ہم سے کہا جا رہا ہے کہ آپ فوجی حکومتوں میں شریک رہے ہیں۔

میں اس بات کو یاد نہیں دلانا چاہتا کہ کہنے والوں کا اپنا کردار کیا ہے؟ لیکن میں پوری دیانتداری کے ساتھ یہ بات کہتا ہوں کہ بلاشبہ میں، جماعت اسلامی اور جے یو آئی جنرل

ضیاء الحق صاحب کے ساتھ کابینہ میں ساڑھے نو مہینے کے لیے بیٹھے تھے۔ یہ ایک حقیقت ہے، لیکن یاد رکھیئے کہ یہ وہ زمانہ تھا، جب دستور in abeyance تھا۔ دستور اس وقت قابل عمل نہیں تھا اور ہم نے ایک معاہدے کے تحت حکومت میں شرکت کی تھی اور وہ معاہدہ یہ تھا کہ مرکز اور صوبوں میں عارضی حکومتیں بنیں گی، جو کلی طور پر سیاسی ہوں گی اور ان میں کوئی فوجی شامل نہیں ہو گا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہماری کابینہ میں جنرل ضیاء الحق کے علاوہ کوئی فوجی نہیں تھا۔ صرف ٹیکنو کریٹس اور سیاسی لوگ تھے اس کے ساتھ اس معاہدہ میں تھا کہ چند مہینوں کے اندر اندر نئے انتخابات کروائے جائیں گے۔ اسی لیے جس دن انتخابات کی تاریخ کا اعلان ہوا، یعنی ۲۳ مارچ ۱۹۷۹ء اسی دن ہم نے اعلانیہ کہہ دیا تھا کہ ہم مستعفی ہو رہے ہیں۔ ہمیں نکالا نہیں گیا تھا بلکہ ہم نے استعفی دیا تھا۔ لیکن میں یہ بات دہرانا چاہتا ہوں، کہ اس وقت کوئی دستور نہیں تھا۔ آج صورتحال اس سے بالکل مختلف ہے، آج دستور قابل عمل ہے۔ آج دستور نے فوجی وردی اتارنے کے لیے ایک اختتامی تاریخ (۳۱ دسمبر ۲۰۰۴ء) دے دی ہے۔ ایک خاص دفعہ موجود ہے اور اس کے بعد اگر آپ کہتے ہیں کہ وردی جاری رہ سکتی ہے تو یہ ایک بالکل مختلف چیز ہے۔

استحکام کے لیے افراد نہیں ادارے اہم ہیں

جناب والا! میں ایک آخری بات کر کے اپنی تقریر ختم کرنا چاہتا ہوں کہ دنیا میں کوئی فرد بھی ابدی نہیں ہوتا ہے۔ ہم سب فانی ہیں۔ اگر ملک میں استحکام پیدا ہو سکتا ہے تو اصول اور اداروں کی بنیاد پر ہو سکتا ہے اور اداروں سے ہٹ کر جس نے بھی اپنی ذات میں استحکام کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے، اس نے اپنے ساتھ اور قوم کے ساتھ کوئی انصاف نہیں کیا۔ سابق صدر جنرل ایوب کا دور اور کردار یاد کیجیے: جب انہیں دل کا دورہ ہوا تھا، اس وقت کس طرح سارا نظام ہل گیا تھا اور انہیں بیماری کے عالم میں بھی ویل چیئر پر بیٹھے ہوئے ٹی وی پر دکھایا گیا۔ جب وہ عوام کے احتجاج کی بنیاد پر رخصت ہوئے تو کیا ہوا کہ اپنے ہی بنائے ہوئے دستور کے مطابق انہوں نے کام نہیں کیا بلکہ فوج کو انتظام سنبھالنا پڑا۔

جناب والا! اس موقع پر میں وہ مشہور جملہ ایوان میں سنانا چاہتا ہوں جو پہلی جنگ عظیم کے بعد فرانس کے وزیر اعظم نے کہا تھا۔ اس سے کسی نے کہا کہ 'مسٹر جارج کلیمینسیو (Georges Eugene Benjamin Clemenceau) آپ فرانس کے لیے ناگزیر' ہو۔ جواباً اس نے کہا کہ 'میرے دوست ایسے ناگزیر افراد سے قبرستان بھرے پڑے ہیں اور کوئی فرد ناگزیر نہیں ہے'۔ اس لیے جناب والا! اگر استحکام آسکتا ہے تو صرف اصول کی بنیاد پر اور امانت کی بنیاد پر آسکتا ہے۔

جناب والا! میں اپنی گزارشات کو قرآن پاک کی آیات پر ختم کرنا چاہتا ہوں جنہیں ایس ایم ظفر نے پیش کیا ہے۔ انہوں نے سورۃ النحل کی آیت ۹۱ پڑھی ہے اور میں اس کے ساتھ آیت ۹۲ بھی پیش کرتا ہوں:

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۹۱﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا ؕ تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ؕ اِنَّمَا يَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ ؕ وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۹۲﴾ (سورۃ النحل ۱۶:۹۱-۹۲)

اللہ کے عہد کو پورا کرو جب کہ تم نے اس سے کوئی عہد باندھا ہو، اور اپنی قسمیں پختہ کرنے کے بعد توڑ نہ ڈالو جبکہ تم اللہ کو اپنے اوپر گواہ بنا چکے ہو۔ اللہ تمہارے سب افعال سے باخبر ہے۔ تمہاری حالت اس عورت کی سی نہ ہو جائے جس نے آپ ہی محنت سے سوت کاتا اور پھر آپ ہی اسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ تم اپنی قسموں کو آپس کے معاملات میں مکر و فریب کا ہتھیار بناتے ہو تاکہ ایک قوم دوسری قوم سے بڑھ کر فائدے حاصل کرے۔ حالانکہ اللہ اس عہد و پیمان کے ذریعہ سے تم کو آزمائش میں ڈالتا ہے، اور ضرور وہ قیامت کے روز تمہارے تمام اختلافات کی حقیقت تم پر کھول دے گا۔

جناب والا! اگر ہم سب اللہ سے عہد، قوم سے عہد، دستور سے حلف اور اس ملک کے سیاسی نظام کو ایک فرد کی انا، خواہش اور اقتدار کی ہوس کی خاطر پامال کرتے ہیں تو پھر مجھے ڈر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی گرفت سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکیں گے۔ خدا کرے کہ وہ برا وقت نہ آئے۔ اللہ تعالیٰ اس ملک کی حفاظت کرے۔ قیادت ہوش کے ناخن لے اور خود جنرل پرویز مشرف ہوش کے ناخن لیں، اپنی آنکھیں کھولیں اور ان حدود کے اندر رہنے کی کوشش کریں جو کہ دستور اور پارلیمنٹ نے ان کے لیے طے کی ہیں۔ اگر ان کا احترام نہیں کریں گے تو مجھے ڈر ہے کہ پھر یہ قوم غاصبوں اور ایسے ظالموں کو، جو دستور اور نظام کو تباہ کرنے کے درپے ہوں، کبھی گوارا نہیں کر سکتی۔

میں یہ بات بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اب ایک تحریک اٹھے گی اور وہ تحریک محض ایک فرد کے لیے نہیں ہو گی بلکہ وہ اس اصول کے لیے ہو گی، وہ جاری رہے گی جب تک فوج کا کردار ان حدود کے اندر نہیں آجاتا جو دستور نے طے کی ہیں اور سیاست میں مداخلت کا راستہ ہمیشہ کے لیے بند نہیں کیا جاتا۔ ہم اس کے لیے پر عزم ہیں اور ہم یہ جدوجہد اس وقت تک جاری رکھیں گے جب تک یہ مقاصد حاصل نہیں کر لیتے۔ میں یہ بھی واضح کر دوں کہ یہ تحریک پر امن ہو گی، جمہوری ہو گی اور قانون اور دستور کے مطابق ہو گی۔ یہ ایسی مؤثر تحریک ہو گی جس میں عوام کے احساسات، جذبات اور ان کے غصے کو کوئی روک نہیں سکے گا۔ خدا کرے کہ اس وقت سے پہلے ہوش کے ناخن لے لیے جائیں اور ہم ایک راستہ نکال لیں جس سے یہ ملک ترقی کے راستے پر چل سکے۔ (۲۹ اکتوبر ۲۰۰۴ء)

صدر مملکت کے دو عہدوں کے مجوزہ قانون کی منظوری

حکومت اور پارلیمانی جماعتوں کے مذاکرات: حقیقت یہ ہے کہ کل جس قانون کو پارلیمنٹ نے پاس کیا ہے کہ صدر پاکستان آرمی چیف کا عہدہ بھی ساتھ رکھ سکیں گے، اس نے ملک کی سیاسی زندگی کو ایک شدید مشکل سے دوچار کر دیا ہے۔ میں ایم ایم اے کے نمائندے کی

حیثیت سے یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ ہم نے حکومت کو اور جنرل مشرف کو ایک باعزت راستہ دیا تھا، اس کے لیے ہم نے ایک معاہدے کے تحت، ایک دستوری انتظام اس ملک میں لانے کی کوشش کی لیکن کل سینیٹ نے (دو عہدوں والا) بل پاس کر دیا اور مجھے افسوس ہے کہ ہمارے اس معاہدہ کی نشاندہی کرنے کے باوجود کہ معقولیت کا تقاضہ ہے اور دستور میں صدر کے حلف کا تقاضا ہے کہ، وہ اس کی منظوری نہ دے، لیکن ہمیں ڈر ہے کہ وہ اس کی منظوری دے دیں گے، اس کی منظوری دے دی گئی۔

ساتھ ہی میں خراج تحسین پیش کرنا چاہتا ہوں جناب ایس ایم ظفر کو کہ انہوں نے اپنے ضمیر کی آواز کو بر ملا بلند کیا، اپنے انداز میں کیا لیکن حق بات کا اظہار کیا کہ دستور کے مطابق (صدر کوئی منافع بخش عہدہ نہیں رکھ سکتا) اور تاریخ میں اپنا ایک مقام پیدا کر لیا۔ میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ مشاہد حسین صاحب کا رویہ بھی مثبت تھا، لیکن ایک طرف آپ مذاکرات کی بات کرتے ہیں اور دوسری طرف مذاکرات کا جو حشر آپ نے کیا، اسے آپ نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مذاکرات اسی وقت ہو سکتے ہیں جب زبان اور عہد کا اعتبار ہو۔ جب دونوں پارٹیوں کو یہ اعتماد ہو کہ مذاکرات کے نتیجے میں جو بات طے کی جائے گی، اس کا احترام کیا جائے گا۔ اگر آپ اس کا احترام نہیں کرتے تو اس کے بعد مذاکرات ایک مذاق ہے۔ مذاکرات ایک دھوکہ ہے، اور میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ۱۷ویں دستوری ترمیم اگر اس کا اصل تقاضا پورا نہیں کرتی تب بھی ایک موقع ہے۔ اور جیسے ایس ایم ظفر نے کہا ہے کہ اگر نیت اچھی ہے اور جنرل پرویز مشرف ۳۱ دسمبر سے پہلے پہلے چیف آف آرمی اسٹاف کا عہدہ چھوڑ دیتے ہیں تو یہ امید کی ایک کرن ہے، سرنگ کے اختتام پر یہ واحد روشنی ہے اس کے علاوہ کوئی روشنی موجود نہیں ہے، تاریکی ہی تاریکی ہے۔

میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ آپ اس نظام کو نہیں بچا سکتے۔ جنرل پرویز مشرف صاحب کو دونوں عہدے چھوڑنے ہوں گے۔ یہ ایک آخری موقع ہے کہ اس نظام کو جسے ہم اور آپ بچانے کی ایک کوشش کر رہے ہیں، بچایا جا سکے۔ ابھی وقت ہے، اسے بچانے کی

کوشش کر لیجیے، لیکن اگر آپ نہیں کرتے تو پھر آپ کی ذمہ داری ہو گی۔ تاریخ آپ کو جن الفاظ سے یاد کرے گی وہ اس ملک کو نقصان پہنچانے والے کے طور پر کرے گی۔ ہم نے قربانی دے کر جو راستہ آپ کو دیا تھا اس کو آپ بند کرنے والے ہیں۔ جو کچھ کیا گیا ہے (بیک وقت دو عہدوں کے قانون کی منظوری) اس پر ہم شدید احتجاج کرتے ہیں۔

میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ حزب اختلاف کی تمام جماعتیں مشورہ کر رہی ہیں کہ ہمیں آئندہ کیا لائحہ عمل اختیار کرنا ہے، پارلیمنٹ کے اندر اور پارلیمنٹ کے باہر، جب تک ہم اس چیز کو تیار نہیں کر لیتے، ہمارا احتجاج جاری رہے گا یہاں بھی اور باہر بھی۔ لیکن جو بات کہنے کی ہے وہ یہ ہے کہ (حکومت کا) اعتبار اور جواز دونوں تباہ ہو گئے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ کوئی مذاکرات اس وقت تک نہیں ہو سکتے، جب تک کہ قانونی جواز اور اعتبار دونوں موجود نہ ہوں اور یہ اس وقت موجود نہیں ہیں۔ اس کی پوری پوری ذمہ داری بد قسمتی سے جنرل مشرف اور ان کے ان چند ساتھی افراد پر ہے جو انہیں اس طرف لے جا رہے ہیں۔ ان ہی میں سے ایک صاحب نے کل اس ایوان میں یہ تک کہنے کی جسارت کی ہے کہ 'آرمی کا مستقل کردار ہونا چاہیے'۔ تاہم مجھے خوشی ہے کہ اپنے مخصوص انداز میں بہت ہی احترام کے ساتھ، دبے لہجے میں، وسیم سجاد صاحب نے کم از کم اتنی بات کہی کہ ہم اس کو عبوری دور کا انتظام سمجھتے ہیں۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ ہم عبوری انتظام کی باتیں کر کر کے ہی، دھوکے کھا کر آج ہم اس مقام پر آ گئے ہیں۔

نظریہ ضرورت: یہاں ایک بار حتمی طور پر یہ بات طے ہو جانی چاہیے کہ دو چیزوں پر اب کوئی مذاکرات نہیں ہونگے اور کوئی سمجھوتہ نہیں ہو گا۔ ایک یہ کہ ملک کے سول نظام میں، یعنی دستور کے نظام میں، فوج کا سیاسی کردار نہیں ہو گا۔ فوج دفاع کے لیے ہے اور دفاع سے آگے کوئی نظریاتی دفاع، کوئی سیاسی کردار کوئی نام نہاد استحکام، ترقی، یا دہشت گردی کے خلاف پالیسی، یہ اس کا کام نہیں۔ دہشت گردی کے خاتمہ کے لیے سول حکومت طے کرے گی، فوج کا کام ہے کہ اس کی اطاعت کرے۔ یہ بات کہنا کہ 'اگر وردی نہیں ہوتی تو دہشت

گردوں کی تحریک باہر نکل سکتی ہے'۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بڑی زیادتی فوج کے ساتھ نہیں ہو گی۔ اس لیے کہ آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ فوج اس ملک کے دستور، نظام اور اس ملک کی سیاسی قیادت کے تابع نہیں ہے۔ بلاشبہ خاص حالات میں ضرورت پڑنے پر فوج کو طلب کیا جاسکتا ہے۔ کیا اس سے پہلے ایسا نہیں ہوا جب شہباز شریف صاحب نے گھوسٹ اسکول کے لیے فوج کو استعمال کیا؟ کیا یہ نہیں ہوا کہ جب واپڈا کے لیے فوج کی ضرورت پڑی تو اسے استعمال کیا گیا؟ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ جب کراچی میں فوج کی ضرورت پڑی تو سول حکومت کے انتظام میں اس نے کام کیا؟ تو یہ جو پیغام آج آپ دے رہے ہیں یہ بڑا خطرناک ہے اور میں چاہتا ہوں کہ دوٹوک طور پر یہ بات طے ہو جائے کہ اب سول انتظام عوام کے نمائندے چلائیں گے اور فوج کا کوئی کردار نہیں ہو گا۔

دوسری بات یہ کہ نظریہ ضرورت جس نے ۱۹۵۴ء سے لے کر آج تک اس ملک کے سیاسی اور قانونی ارتقاء کو سبوتاژ کیا ہے، ہمیں اسے اتنا گہرا دفن کر دینا چاہیے کہ کوئی عدالت اور کوئی قیادت اسے باہر نہ نکال سکے۔ ان دونوں امور پر واضح فیصلہ کیے بغیر اس ملک میں صحیح سیاسی اور جمہوری ارتقاء اور عوام کے حقوق کا تحفظ ممکن نہیں ہے۔ حزب اختلاف ان تمام معاملات پر یکسو ہے اور ہم صاف کہنا چاہتے ہیں کہ ہم ہمیشہ مذاکرات کے لیے تیار ہیں۔ سیاست میں مذاکرت کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا، لیکن مذاکرات ان سے ہوتے ہیں جو اپنی بات اور عہد کا پاس کریں، جن کی بات پر اعتبار کیا جاسکے اور جس کے بارے میں یقین ہو کہ اگر کوئی بات طے ہو گی تو اس کا احترام کیا جائے گا۔ جو وعدے کر کے وعدے سے مکر جاتے ہیں اور عہد کر کے اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں، ان کی بات میں کوئی وزن نہیں ہوتا، ان سے مذاکرات بے معنی ہیں۔ (۲ نومبر ۲۰۰۴ء)

ایم ایم اے۔ مشرف حکومت معاہدے کا خاتمہ

جناب چیئرمین! میں آپ کے توسط سے سینیٹ، قومی اسمبلی اور پورے ملک کی توجہ

اس قومی معاہدہ کی طرف دلانا چاہتا ہوں جو ۳۱ دسمبر ۲۰۰۴ء کو دستور کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ایم ایم اے اور حکومت کے درمیان ہوا تھا اور جس کے تحت پرویز مشرف نے ٹی وی پر آکر پوری قوم اور پوری دنیا سے ایک عہد کیا تھا، اس عہد کی جس طرح خلاف ورزی کی گئی ہے اور فوج کی مداخلت، جس کے بارے میں طے ہو گیا تھا کہ اس کا باب ۳۱ دسمبر کو بند کر دیا جائے گا، اسے قطعاً غیر قانونی، غیر سیاسی اور غیر اخلاقی انداز سے جاری رکھنے کی کوشش کی گئی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس نے جنرل پرویز مشرف کا اعتبار اور ان کی بات کا وزن ختم کر دیا ہے۔ چنانچہ جو معاہدہ تھا وہ بدعہدی کی بنیاد پر اسی طرح ٹوٹ گیا ہے۔ جس طرح کسی معاہدے میں اگر اس کے مندرجات کو پورا نہ کیا جائے تو وہ اور اس کا جواز ختم ہو جاتا ہے۔ میں صاف کہنا چاہتا ہوں کہ دو عہدے جاری رکھنے کا جواز جو انہیں دستوری انحراف اور ایک عبوری صورت حال کی بنیاد پر دینے کی کوشش کی گئی تھی اسے انہوں نے پارہ پارہ کر دیا ہے۔ آج وہ قانونی جواز کے بغیر قابض صدر ہیں۔ بلکہ قانونی جواز کے ساتھ ان کی دوسری پوزیشن بھی اب باقی نہیں رہی۔ دونوں عہدے بلاجواز ہیں اور ۱۷ویں ترمیم بھی اس بدعہدی کی بنیاد پر اپنا جواز کھو چکی ہے۔ اس نے ملک کو ایک شدید بحران میں مبتلا کر دیا ہے۔

ہم اب بھی یہ چاہتے ہیں کہ دستور باقی رہے ہم اس کے لیے پارلیمنٹ میں اور پارلیمنٹ کے باہر تمام جمہوری اور قانونی ذرائع سے جدوجہد کریں گے اور جب تک ہم ملک کے دستور کی مکمل بحالی اور ملک کی شہری زندگی کو فوج کے قبضے سے آزاد کرانے میں کامیاب نہیں ہوتے ہم اپنی جدوجہد جاری رکھیں گے۔ میں واضح کرنا چاہتا ہوں کہ دفاع پاکستان کے لیے فوج ایک نہایت اہم ادارہ ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ وہ اس کام کے لیے مخصوص ہو لیکن وہ لوگ جو فوج کو سیاست میں لا رہے ہیں اور یوں فوج کے ذریعے سیاسی مسائل کو خراب کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، وہ دراصل اس ملک کے ساتھ کوئی خیر خواہی نہیں کر رہے۔ بلکہ میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ جس طرف ہم بڑھ رہے ہیں وہ فوج اور اس قوم کے درمیان تصادم

پیدا کرنے کی کیفیت ہے۔ اس میں سر فہرست دو عہدے رکھنا ہے۔ جب کہ جو کچھ (فوجی آپریشن) آج بلوچستان میں اور وانا میں کیا جارہا ہے اور جس کے اشارے اور مقامات سے بھی مل رہے ہیں یہ بڑے خطرناک لیکن اسی غیر آئینی مسئلہ سے جڑے معاملات ہیں۔ جناب چیئرمین! میں اس بات کو ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں کہ اپوزیشن اس صورت حال کو ہرگز قبول نہیں کرے گی اور ہم اپنی سیاسی جدوجہد جاری رکھیں گے، پارلیمنٹ کے اندر بھی اور پارلیمنٹ کے باہر بھی۔

جناب چیئرمین! وزیر پارلیمانی امور کو حق ہے کہ وہ جو رائے چاہیں رکھیں لیکن جتنا میں نے دستور اور قانون کا مطالعہ کیا ہے، میں پورے احساس ذمہ داری سے یہ بات کہتا ہوں کہ وہ دستور اور قانون کی غلط نمائندگی کر رہے ہیں۔ آرٹیکل ۴۱ اپنی تمام ترامیم کے ساتھ ایک مربوط آرٹیکل ہے اور اس کی آخری کلاز جس میں صدارت کے عہدے کے لیے جسے آرٹیکل ۲۶۰ میں واضح کر دیا گیا ہے ۶۳(۱)(ڈی) کو شامل کر کے حتمی طور پر اس کو صدر کے اوپر لاگو کیا گیا ہے۔[1] اسے ٹکڑے ٹکڑے نہیں کیا جاسکتا، اسے تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ وہ ایک مرکب چیز ہے۔ اور ۶۳(۱)(ڈی) کو وہاں لانے کا مقصد صرف ایک ہے کہ اب صدر اس دستور کی ترمیم کا پابند ہے۔ رہی یہ بات کہ اس میں قانون کا ذکر ہے اور اس میں استثنیٰ دیا جا سکتا ہے، اس کا کوئی تعلق ان عہدوں کے لیے نہیں ہے جنہیں دستور نے واضح کر دیا ہے۔ اس کا تعلق صرف عام انتظامی قسم کے عہدوں جیسے نمبردار وغیرہ یا ایسی ہی کوئی اور دستوری چیز سے ہے جسے واضح کر دیا گیا ہے۔ آرٹیکل ۲۶۰ کے اندر اس کو وہ لاگو نہیں کرتا۔ اور یہ

---

[1] آئین کی دفعہ ۶۳(۱)(ڈی) کے تحت کوئی بھی شخص مجلس شوریٰ کا رکن ہونے کے لیے نااہل ہے جو پاکستان کی ملازمت میں کسی منفعت بخش عہدے پر فائز ہو (جیسے جنرل پرویز مشرف صدر پاکستان رہتے ہوئے آرمی چیف کے عہدے پر فائز تھے) لیکن انہیں پارلیمنٹ نے حکومت اور اپوزیشن کے معاہدے کے تحت آئینی ترمیم کے ذریعے صدر پاکستان کے ساتھ ساتھ آرمی چیف کا عہدہ ۳۱ دسمبر ۲۰۰۴ء تک رکھنے کی اجازت دی اور ترمیم کے مطابق ۳۱ دسمبر ۲۰۰۴، تک آرمی چیف کا عہدہ انہوں نے نہیں چھوڑا تو اصولاً وہ آئین کی دفعہ ۶۳(۱)(ڈی) نااہل قرار پاتے ہیں۔

قانون کا ایک اصول ہے کہ معاہدہ جن بنیادوں پر ہوا اگر اس معاہدہ کی جو لازمی شرائط ہیں انہیں کوئی توڑتا ہے تو اس کے بعد معاہدہ باقی نہیں رہتا۔ اگر میں نے ایک چیز آپ سے خریدی ہے اور قبضہ لے لیا ہے لیکن قیمت مجھے اس کی ادا کرنی ہے دو مہینے کے بعد اگر میں قیمت ادا نہیں کرتا تو آپ کی وہ چیز واپس چلی جائے گی۔ یہ ہے قانون، یہ ہے ضابطہ۔

صدر نے ہمارے ساتھ الگ سے کوئی معاہدہ نہیں کیا بلکہ انہوں نے پوری قوم سے وعدہ کیا ہے اور دستوری فریضہ کی توثیق مزید کی ہے۔ اس اعلان کے بعد اس سے نکلنا اور اس بنیاد پر نکلنا کہ اسمبلی نے ایک قانون پاس کر دیا ہے ایک بے معنی بات ہے۔ میں انہیں بتانا چاہتا ہوں کہ دستوری قوانین کے اندر اسمبلی کو یہ اختیار نہیں کہ وہ سادہ قانون کے ذریعے کسی دستوری تقاضے کو یا وہ چیز جو دستور نے دی ہو اسے منسوخ کر دے۔ وہ قانون باطل ہے، دستور سے چمٹا ہوا غیر مرئی جرثومہ ہے، اس کی کوئی حیثیت نہیں اور یہ چیز آج نہیں دنیا کے سارے قانونی نظاموں کے اندر مسلّم ہے۔ (۲فروری ۲۰۰۵ء)

۱۷ویں آئینی ترمیم کے موقع پر
ایم ایم اے اور حکومتی مذاکراتی ٹیم کے درمیان سماجی معاہدہ

دونوں مذاکراتی ٹیمیں درج ذیل معاہدے پر رضامند ہوئی جس پر پاکستان مسلم لیگ (ق) کی جانب سے چوہدری شجاعت حسین اور جناب ایس ایم ظفر نے اور ایم ایم اے کی جانب سے مولانا فضل الرحمٰن، لیاقت بلوچ اور حافظ حسین احمد نے دستخط کیے۔

۱۔ آئینی ترمیم کے نتیجے میں صدر کو قومی اسمبلی کو تحلیل کرنے کا اختیار حاصل ہو گا بشرطیکہ سپریم کورٹ آف پاکستان ان کے فیصلے کی توثیق کر دے۔

۲۔ اس آئینی ترمیم میں قومی سلامتی کونسل کو کوئی تحفظ نہیں دیا جائے گا لیکن وہ ایک علیٰحدہ قانون کے ذریعے قائم کی جاسکتی ہے۔

۳۔ صدر مملکت اپنی صوابدید کے بجائے آرٹیکل ۲۴۳ کے تحت وزیر اعظم کے مشورے سے اپنے

اختیارات استعمال کریں گے۔

۴۔ چھٹے شیڈول کے آئٹم نمبر ۲، ۳۰، اور ۳۵ جن کے ذریعے صوبائی اسمبلیوں کا لوکل باڈیز آرڈیننس اور پولیس آرڈر میں ترمیم کا اختیار محدود کر دیا گیا ہے، آئینی ترمیم کی تاریخ سے چھ سال گزرنے کے بعد یہ پابندی خود بخود ختم ہو جائے گی۔

۵۔ اعلیٰ عدلیہ کے ججوں کی ریٹائرمنٹ کی عمر جیسا کہ دستور میں موجود ہے برقرار رکھی جائے گی۔

۶۔ آرٹیکل ۶۳(۱)(ڈی)، ۳۱ دسمبر ۲۰۰۴ء کو قابل عمل ہو جائے گا۔ آرٹیکل صدر مملکت کو دو عہدے رکھنے کی اجازت نہیں دیتا۔

۷۔ آئین میں ایک ترمیم کی جائے گی جس کے نتیجے میں صدر موجودہ الیکٹورل کالج سے اعتماد کا ووٹ لے سکیں گے۔ اس سلسلے میں آٹھویں ترمیم والا طریقہ اختیار کیا جائے گا۔

۸۔ ایل ایف او پارلیمنٹ میں دو تہائی اکثریت سے پاس کیا جائے گا۔ ۱۷ویں ترمیم اور اس کے متعلقات وغیرہ۔

۹۔ صدر مملکت کی جاری مدت اقتدار کو قانونی حیثیت دینے کے لیے ایم ایم اے ترمیم کی حمایت کرے گی۔ ایم ایم اے کے اراکین پارلیمنٹ میں صدر کی حمایت کے پابند نہیں ہونگے لیکن وہ صدر کے خلاف اپنے ووٹ استعمال نہیں کریں گے۔ ایم ایم اے کے اراکین پارلیمنٹ میں موجود رہیں گے اور کوئی احتجاج نہیں ہو گا۔

۱۰۔ معاہدے کے مطابق دونوں جماعتیں آئینی ترمیم تیار کرنے اور اسے پارلیمنٹ سے دو تہائی اکثریت سے منظور کرانے کی پابند ہوں گی۔

(بحوالہ: 17th Constitutional Amendment & Its Aftermath: The Role of Muttahidda Majlis-i-Amal (MMA) by Kamran Aziz Khan, Journal of Pakistan Vision, Published by Pakistan Study Centre, Punjab University, Lahore)

ایمرجنسی لگانے کی دستوری دفعہ کا استعمال

(۳نومبر ۲۰۰۷ء کے مشرف اقدام کے تناظر میں)

۳نومبر ۲۰۰۷ء کو جنرل پرویز مشرف نے ملکی دستور کو معطل کرتے ہوئے ہنگامی حالت کے نفاذ کا اعلان کر دیا۔ تمام ٹیلی ویژن چینلوں کو بند کر دیا گیا اور تمام اہم شاہراہوں اور مقامات پر فوج اور پولیس کو تعینات کر دیا گیا۔

ہنگامی حالت کے نفاذ کے بعد سپریم کورٹ کے ججوں سے کہا گیا تھا کہ وہ ایک عارضی آئینی حکم کے ذریعے ہنگامی حالت کو جائز قرار دیں ورنہ انہیں برطرف کر دیا جائے گا۔ ہنگامی حالت کے نفاذ کے فوراًبعد سپریم کورٹ کے گیارہ میں سے سات ججوں نے کورٹ روم میں عدالتی فیصلے کے ذریعے اس بنیاد پر ہنگامی حالت کے حکم کو مسترد کر دیا کہ یہ حکم آئین کی کسی دفعہ کے مطابق نہیں۔ اس کے بعد ملک میں مشرف کے مخالف گروپوں اور سیاسی جماعتوں نے ملک گیر احتجاجی مظاہروں اور ہڑتالوں کا اعلان کر دیا۔

پروفیسر خورشید احمد کی زیر نظر تقریر سینیٹ کی بحالی کے ۴۳دن بعد ۴فروری ۲۰۰۸ء کے اجلاس میں کی گئی۔

جناب چیئرمین! تین نومبر ۲۰۰۷ء کو ایمرجنسی کے نام پر دستور، جمہوریت، عدالت اور صحافت پر جو شب خون مارا گیا اور جس طرح ۴۳دن (۳نومبر تا ۱۵دسمبر) لاقانونیت یا جنگل کا قانون اس ملک پر مسلط رہا، اور پھر جس بھونڈے انداز میں پہلے چیف آف آرمی اسٹاف (جنرل پرویز مشرف) نے صدر (پرویز مشرف) کو ایمرجنسی ختم کرنے کا اختیار دیا جس کے مطابق ۱۵ دسمبر کو ایمرجنسی ختم کرنے کا یہ ڈرامہ کیا گیا۔ یہ پاکستان کی تاریخ کا

سیاہ ترین باب اور پوری دنیا میں پاکستان کے تصور کو تباہ کرنے اور بگاڑنے میں سب سے زیادہ خطرناک اقدام رہا۔ اس کی پوری ذمہ داری ان افراد پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے ۳نومبر کے ایمرجنسی کے نفاذ کا فیصلہ کیا جن میں جنرل پرویز مشرف، چیئرمین جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی، مسلح افواج کے سربراہان، اس وقت کا وزیراعظم، چار گورنرز، کور کمانڈرز اور وائس چیف آف آرمی اسٹاف شامل ہیں۔ یہ وہ نام ہیں جنہیں ایمرجنسی کی دستاویز میں مشیر اور فیصلہ کرنے والا قرار دیا گیا ہے، (جنرل مشرف نے اپنے ۳نومبر ۲۰۰۷ء کو قوم سے خطاب میں اس اجلاس کا ذکر کیا ہے جس میں ہنگامی حالت کے نفاذ کا فیصلہ کیا گیا) یہ افراد دستور کے قتل، عدالت کی تباہی، صحافت کو بیڑیاں پہنانے اور ملک اور بیرون ملک پاکستان کے تصور کو نقصان پہنچانے کے ذمہ دار ہیں۔

ایمرجنسی کب لگائی جاسکتی ہے؟

دوسری بات جناب والا! میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اسے ایمرجنسی کہنا ایک زبردستی، زیادتی اور ڈھونگ ہے، ایمرجنسی کا لفظ ایک دستوری لفظ ہے جسے دستور کی دفعہ ۲۳۲ کے تحت واضح کر دیا گیا ہے کہ ایمرجنسی کون لگائے گا، کب لگائے گا، اسے جاری رکھنے کے ضوابط کیا ہوں گے؟ ایمرجنسی کے لیے صرف دو ہی صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ کسی صوبے کی صورتحال ایسی ہو جائے کہ جہاں دستور کے مطابق حکمرانی کرنا ممکن نہ ہو اس صورت میں یہ کام کیا جاسکتا ہے۔

دوسرا اقتصادی بحران جس کے لیے یہ کام کیا جاسکتا ہے۔ لیکن جن چیزوں کو ۳نومبر کی ایمرجنسی کے لیے بنیاد بنایا گیا ہے ان کا ایمرجنسی سے کسی بھی اعتبار سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لیے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ دراصل ایک منی مارشل لاء تھا اور مضحکہ خیز صورت یہ ہے کہ جنرل پرویز مشرف چیف آف آرمی اسٹاف نے صدر جنرل پرویز مشرف کے خلاف مارشل لاء لگایا۔ ایمرجنسی کے نفاذ کا جو حکم صدر جنرل پرویز مشرف کی جانب سے جاری کیا گیا

اس کے ابتدائیہ میں آٹھ، نو نکات[1] کی صورت میں ان کے آٹھ سالہ دور کے کارناموں کو بیان کیا گیا ہے وہ ایک چارج شیٹ ہے۔ اور یہ چارج شیٹ صدر جنرل مشرف، وزیر اعظم شوکت عزیز، ان کی پارلیمنٹ اور اس پورے نظام کے خلاف ہے۔ یہ ایک مارشل لاء تھا جس کے لیے لفظ ایمرجنسی استعمال کیا گیا جو اس اصطلاح کا غلط استعمال ہے اور غیر آئینی، غیر قانونی اور غیر اخلاقی ہے۔

اگلی بات جناب والا! آپ ان دستاویزات کا تجزیہ کر لیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام باتیں محض خانہ پری اور دھوکہ دینے کے لیے ہیں، خواہ ان کا تعلق امن و امان سے ہو، فوجی آپریشن اور خودکش بمباری سے ہو، یہ ساری چیزیں پہلے بھی تھیں، اس زمانے میں بھی رہیں اور ایمرجنسی کے اختتام (Withdrawal) کے بعد بھی رہیں، ان کا کوئی تعلق ایمرجنسی کے نفاذ سے نہیں۔ اصل وجوہ کیا ہیں؟ جناب والا! اصل وجوہ صرف تین ہیں: ایک اپنی ذات کا تحفظ، شخصی آمریت کا قیام اور اس کا دفاع۔ ان میں سے ہر ایک دستوری نظام، قانون کی حکمرانی اور جمہوریت کی ضد ہے اور ساری خرابی کی جڑ یہی ہے۔ ایک فرد واحد (جنرل پرویز مشرف) یہ سمجھتا ہے کہ وہ عقل کل ہے، دستور کاغذ کا ایک پرزہ ہے، پارلیمنٹ اس کی نگاہ میں 'بدتمیز انسانوں کا ایک گروہ ہے' اور غیر مہذب ہے۔ قانون کی کوئی حیثیت نہیں، عدالت کو وہ اپنا مدمقابل سمجھتا ہے۔ پریس جو آمریت کو اپنا مکروہ چہرہ ایک آئینے کی شکل میں دکھاتا ہے 'اسے وہ دشمن سمجھتا ہے' تو یہ سارا معاملہ اس شخص کا ہے۔

جناب والا! ایک بات میں آپ کو یاد دلاؤں گا کہ کبھی فرانس کے لوئی سمن (فرانسیسی بادشاہ لوئیس چہاردہم (Louis XIV) جس نے فرانس پر ۷۲ سال حکومت کی (۱۶۳۸ء سے

---

[1] ان وجوہات کے مطابق ملک میں دہشت گردی بڑھ گئی ہے اور قانون نافذ کرنے والے اداروں اور ریاستی ڈھانچوں پر حملے ہو رہے ہیں جبکہ عدلیہ نہ صرف انتظامی کاموں میں رکاوٹ ڈال رہی ہے بلکہ دہشت گردی کے خلاف کارروائیوں کو تخریب کاروں کو رہا کر کے ناکام بنا رہی ہے بعض ججوں نے حدود پھلانگ کر انتظامی اختیارات سنبھال لیے ہیں۔ سپریم جوڈیشل کونسل کو غیر فعال کر کے ججوں کو احتساب سے مامون کر دیا گیا ہے۔ عدلیہ حکومتی پالیسیوں اور اقتصادی ترقی کے خلاف مداخلت کر رہی ہے اور ملک میں امن و امان اور معیشت کی صورت حال ابتر ہو گئی ہے۔

۱۷۱۵ء)[بحوالہ:hyperhistory.com] نے بھی یہ بات کہی تھی کہ میں ریاست ہوں، میں ہی بااختیار ہوں، یعینہ یہی رویہ پرویز مشرف کا ہے، نہ وہ بااختیار ہے، نہ وہ ریاست ہے لیکن اس نے ہر چیز کو محض اپنی ذات کی خاطر "بازیچہ اطفال" بنا رکھا ہے۔ پرویز مشرف نے یہ بات کہی کہ 'پہلے پاکستان'، لیکن اس سے بڑا جھوٹ کوئی اور نہیں، ان کی ساری پالیسیوں اور کارگزاریوں کا مرکز و محور 'سب سے پہلے میں' ہے، اور یہی چیز خرابی کی اصل جڑ ہے۔

پرویز مشرف دور کے بارے میں تین جائزے: اس سلسلے میں جناب والا! تین اہم سروے ہیں، یورپ کا سروے ہوا ہے، ایک امریکہ کا، جو ان کا بڑا سرپرست اور بااعتبار ادارہ ہے اس نے بھی ایک سروے کروایا ہے اور ایک تیسرا سروے پلڈاٹ کے تعاون سے ہوا ہے۔ تینوں کو آپ دیکھ لیجیے، ملک کی اسی فیصد آبادی امریکہ مخالف اور امریکہ کی چاکری میں جو پالیسی اختیار کی گئی ہے اس کے خلاف ہے۔ ۷۳ فیصد نے یہ کہا ہے کہ پرویز مشرف اس قوم کو بخش دیں، انہوں نے بہت کرم کر لیا، اب پاکستان کے بہترین مفاد میں یہ ہے کہ وہ اس کی جان چھوڑ دیں۔ ایک بڑا اہم سوال تھا اور وہ سوال یہ تھا کہ 'آپ کی نگاہ میں پرویز مشرف نے جو کچھ کیا ہے یہ پاکستان پہلے ہے یا پرویز مشرف پہلے ہے'۔ جناب چیئرمین! ۶۷ فیصد نے یہ بات کہی کہ پاکستان نہیں پرویز مشرف پہلے ہے، یہ وہ حقیقت ہے جسے سامنے رہنا چاہیے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی عرض کروں گا کہ فوج کے ۱۰۰ سابق افسران جو ماضی میں مختلف اہم ذمہ داریاں ادا کرتے رہے ہیں ان سب نے قومی مفاد میں ایک ہی بات کہی ہے اور وہ یہ ہے کہ اب چھوڑ دو اس ملک کو۔ ہم نے آپ کو بہت دیکھ لیا۔[1] اور یہ کم ظرفی ہے کہ انہیں ملازمت کے متلاشی اور اپنا جونیئر قرار دینے کی بات کی گئی۔

---

[1] ہنگامی حالت کے خاتمہ کے بعد متحدہ اپوزیشن کی ملک گیر عوامی تحریک کے نتیجے میں جب جنرل مشرف کے خلاف آئین معطل کرنے اور آئین سے انحراف کے الزامات کے تحت سنگین غداری کے مقدمات شروع ہوئے تو جنرل مشرف کی جانب سے بیان سامنے آیا کہ حکومت کی جانب سے ان پر بغاوت اور سنگین غداری کا مقدمہ قائم کرنے کے حوالے سے پوری فوج میں بے چینی پھیل گئی ہے۔

جواب میں پاکستان ایکس سروس مین سوسائٹی کے لیفٹننٹ جنرل حمید گل اور پاکستان ایکس سروس مین ایسوسی ایشن کے صدر لیفٹننٹ جنرل علی قلی خان نے ایک مشترکہ بیان میں جنرل مشرف کے اس تاثر کی تردید کی اور کہا کہ پاکستانی مسلح افواج کا ہنگامی حالت کے نفاذ سے کوئی تعلق نہیں اور یہ مشرف کا ذاتی فعل تھا اب جنرل مشرف کو قانون کی پیروی کرنی چاہیے اور عدلیہ کو اس مقدمہ کا فیصلہ میرٹ پر کرنے کا موقع دینا چاہیے۔

جناب والا! ان میں ایئر مارشل اصغر خان اور نور خان بھی ہیں، ان میں جنرل اسلم بیگ ہیں، جنرل حمید گل ہیں، ایڈمرل بخاری شامل ہیں۔ وہ افراد ہیں جنہیں عزت و احترام سے دیکھا جاتا ہے اور جن کا تعلق محض آرمی سے نہیں، تینوں افواج سے ہے۔ اس میں وہ بھی ہیں جو ان (جنرل مشرف) کے استاد رہے ہیں جن کو انہوں نے استاد کہا ہے اور ان کے احکام کے تحت انہوں نے کام کیا ہے۔

جناب والا! میں آپ کے علم میں یہ بھی لانا چاہتا ہوں کہ یہی بات تقریباً بڑے اچھے انداز میں اور بڑے واضح دلائل کے ساتھ علماء نے بھی کہی ہے اور یہ ملک کے ۳۱ ممتاز علماء ہیں۔ اگرچہ اس بات کو باقاعدہ مشتہر نہیں کیا گیا لیکن میں نے ان کا بیان پڑھا ہے۔ اس بیان میں مشترکہ مطالبہ یہ ہے کہ خدا کے لیے آپ ملک کو چھوڑ دیں، انہوں نے دس نکات پر ایک چارج شیٹ دی ہے اور اس کے بعد کہا ہے کہ پاکستان کا بہترین مفاد یہ ہے کہ شخصی آمریت اور اپنی ذات کو محور و مرکز بنائے رکھنے کا کھیل ختم کریں۔ ملک میں قانون اور دستور کی حکمرانی ہو۔ انہوں نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ ہمارے کوئی سیاسی عزائم نہیں ہیں اور نہ ہی ہم کسی پارٹی سے متعلق ہیں۔

ایمرجنسی کے اسباب، اہداف اور قانونی پوزیشن

ا۔ ذات کا تحفظ: جناب والا! پہلا سبب جس کی بنا پر یہ اقدام کیا گیا ہے وہ اپنی (جنرل مشرف کی) ذات کا تحفظ ہے، اپنے غیر منطقی، غیر قانونی انتخاب کو توسیع دینا ہے۔ انہیں صاف نظر آرہا تھا کہ انہوں نے ایک ایسی اسمبلی سے اپنا انتخاب کرایا ہے جو اپنا منشور اور مقصد کھو چکی ہے۔ یہ بات صاف طور پر واضح ہے کہ ایک انتخابی حلقہ ایک مدت کے لیے ہوا کرتا ہے وہ دو مدتوں کے لیے انتخاب نہیں کر سکتا۔ قومی اسمبلی، سینیٹ اور چاروں صوبائی اسمبلیاں انتخابی حلقے کی حیثیت رکھتی ہیں وہ صرف ایک بار، ایک مدت کے لیے، ایک شخص کو منتخب کر سکتی ہیں۔ جب یہ مسئلہ سپریم کورٹ میں آیا تو انہیں صاف نظر آرہا تھا کہ سپریم کورٹ ان کے خلاف فیصلہ دے گی۔ اس لیے ایمرجنسی کا یہ سارا کھیل اپنی ذات کے تحفظ اور اپنے اقتدار کو

برقرار رکھنے کے لیے ہے۔ اس کا کوئی تعلق ان دلائل سے نہیں جنہیں ہنگامی حالت کے ابتدائیہ میں دیا گیا ہے۔

۲۔ عدلیہ کی تباہی: جناب والا! دوسری چیز جو بڑی افسوس ناک اور تباہ کن ہے وہ عدلیہ کو تباہ کرنا ہے۔ عدل وانصاف کا نظام جس ملک میں نہ ہو وہ باقی نہیں رہ سکتا۔ کفر کی ناؤ چل سکتی ہے، ظلم کی ناؤ نہیں چل سکتی اور اگر عدل نہ ہو تو ظلم ہے۔ جناب والا! پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ یہ ہوا ہے۔ مجھے پتہ ہے اس سے پہلے آمروں نے بھی عدالتوں سے حلف لیے۔ لیکن درحقیقت ان چیزوں کو نظر انداز کیا جانا ہی اس بات کی وجہ بنا کہ آنے والے آمروں نے وہی راستہ اختیار کیا۔ لیکن جو کچھ اس شخص نے کیا اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ ۹۲ میں سے ۵۳ ججز نے اس کے خلاف بغاوت کی۔ سپریم کورٹ کی اکثریت، سندھ اور پشاور کی ہائی کورٹس، پنجاب کے ججوں کی رائے سامنے آچکی۔ اعلیٰ عدلیہ کے ۶۰ فیصد سے زائد نے اسے بیک بینی اور دو گوش نکال باہر کیا۔ قانونی برادری، پوری سول سوسائٹی، ساری سیاسی قوتیں، پوری دنیا کا پریس، تمام تھنک ٹینکس حتّٰی کہ وہ حکومتیں، جو ان کی پشت پناہی کر رہی ہیں، وہ سب چیخ رہی ہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ جس ملک میں اپنی ذات کی خاطر عدلیہ کو اس طریقے سے غیر مؤثر اور ختم کیا جائے، اس سے زیادہ تباہ کن اور سیاہ اقدام کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ تو دوسرا ہدف یہ تھا۔

۳۔ صحافت پر پابندیاں: جناب والا! تیسرا ہدف صحافت ہے، اس لیے کہ صحافت کی آزادی حقیقتاً جمہوریت کی جان ہے اور اس کے بغیر جمہوری عمل پنپ نہیں سکتا اور آمروں کو سب سے زیادہ ناگوار یہی گزرتا ہے۔ جناب والا! ہم پر بڑا احسان کیا جاتا ہے، جتایا جاتا ہے کہ میں نے آزادی دی۔ آپ آزادی دینے والے کون ہیں؟ صحافت کی آزادی ایک بنیادی حق ہے۔ دستور یہی ہے، آپ نے تو اس حق سے لوگوں کو محروم کیا ہے اور بلاشبہ آپ اکیلے نہیں ہیں۔ آپ کے پیش رو بھی ایسے تھے جنہوں نے یہ کام کیا ہے۔ وہ بھی غلط تھا، یہ بھی غلط ہے۔ آزادی کسی کو آپ نے خیرات میں نہیں دی۔ یہ کوئی صدقہ نہیں، یہ ان کا حق ہے۔ ہاں جو

کچھ آپ نے کیا ہے وہ یہ ہے کہ ایک طرف یہ احسان جتانے کے ساتھ ساتھ آپ نے صحافت کو بیڑیاں پہنادی ہیں۔

آپ نے ان کی زبان بندی کی ہے۔ پاکستان کی تاریخ میں، اس دور میں جتنے صحافی شہید کیے گئے ہیں اتنے کبھی نہیں ہوئے۔ اگر میری معلومات درست ہیں تو چوبیس یا پچیس افراد کو ان آٹھ سالوں میں شہید کیا گیا ہے۔ مختلف طریقے سے پابندیاں لگائی گئیں۔ ٹھیک ہے اشتہارات کو ماضی میں بھی استعمال کیا گیا، آپ نے بھی استعمال کیا ہے لیکن آپ نے تو ان کو اغوا کروایا ہے۔ آپ کے دور میں وہ شہید کیے گئے ہیں۔ آپ کے دور میں انہیں ملک چھوڑ کر جانا پڑا ہے اور اس کے باوجود بھی آپ کی زبان اور آپ کا ڈنڈا دونوں ان کے خلاف آج تک استعمال ہو رہے ہیں۔

ضیاء الدین ایک سینئر صحافی ہیں، ملک میں اور ملک کے باہر ان کی عزت ہے لیکن آپ نہ صرف ان کے ایک سوال پر برافروختہ ہو جاتے ہیں بلکہ فرماتے ہیں کہ ایسے لوگوں کی نہ صرف مخالفت کرو بلکہ ان کو دو چار ٹِکا بھی دو۔ یہ الفاظ بی بی سی ریڈیو پر ایک بار نہیں کئی بار ان کے اپنے الفاظ میں ساری دنیا نے سنے ہیں۔ پرائیویٹ ٹی وی چینلوں نے ان کی تصویر کے ساتھ ان کی آواز میں اس بات کو سنایا ہے اور اس کے بعد ان کے پریس ایڈوائزرز کی یہ ہمت اور جرأت بھی ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے ایسا نہیں کہا۔ یہ کیا کھیل ہے؟

ایمرجنسی کے تحت اقدامات کی اصل قانونی پوزیشن: تو جو کچھ آپ نے کیا ہے اس کی یہی تین بنیادی وجوہ ہیں۔ پہلی جو سب سے اہم ہے اپنی ذات کا تحفظ، دوسری عدلیہ کو غیر مؤثر کرنا اور اس سے نجات پانے کی کوشش اور تیسرا صحافت کا گلا گھونٹنا۔ باقی سب کچھ جو آپ نے کہا وہ ڈھونگ ہے، وہ دھوکہ اور خود فریبی ہے۔ کوئی اسے ماننے کو تیار نہیں۔ جتنے مطالعے میں نے کیے ہیں پاکستانی پریس، ورلڈ پریس حتّٰی کہ امریکہ کے ترجمان، یورپی یونین کے ترجمان، جن کا دعویٰ ہے کہ آپ ہی ان کے منظور نظر ہیں وہ سب پکار رہے ہیں کہ یہ ایک ذات کے تحفظ کے لیے کیا جارہا ہے۔

جناب والا! میں یہ حوالہ دیے بغیر نہیں رہ سکتا اور یہ بڑا ہی ہولناک اور پریشان کن ہے۔ ڈیووس (Davis) میں جو تقریریں اور انٹرویوز انہوں (جنرل مشرف) نے فرمائے ہیں ان میں بڑی ہی عجیب بات کی گئی ہے۔ ۲۴ جنوری ۲۰۰۸ء کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے جب ان سے یہ کہا گیا کہ آپ باہر آ گئے ہیں اور ملک کے یہ حالات ہیں تو ارشاد فرماتے ہیں:

Chief of Army Staff is loyal to me personally.

جناب والا! میں سارے مغربی پریس کے الفاظ کا حوالہ دے رہا ہوں جو پاکستانی پریس نے بھی شائع کیے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ فوج اس ملک کی اور اس کے دستور کے تحت ہے اور اس فوج کا سربراہ جس نے دستور کے تحت حلف لیا وہ ان کا ذاتی ملازم اور ذاتی وفادار ہے۔ جناب والا! یہ ہے وہ صورت حال جس کی بنا پر ہم یہ بات کہنے پر مجبور ہیں کہ ہنگامی حالت کا نفاذ غلط تھا۔ ہنگامی حالت کا سہارا لے کر جو بھی آرڈیننس آئے وہ سب غلط ہیں۔ دستور میں جو ترامیم کی گئی ہیں[1] وہ سب غلط اور ناقابل قبول ہیں، غیر آئینی ہیں اور خود بحالی کے بارے میں جو کچھ کیا گیا ہے وہ بھی غیر قانونی ہے۔ میری نگاہ میں اصل قانونی پوزیشن یہ ہے کہ یہ سارے اقدامات خلاف قانون ہیں۔ جو کچھ ہوا ہے وہ یہ ہے کہ عملاً ہمیں اپنی عدلیہ سے محروم کر دیا گیا۔ چالیس دن سے زیادہ عرصہ ہمیں اپنے دستور سے محروم رکھا گیا۔ یہ دن تاریک دن ہیں اور انہیں کوئی معاف نہیں کرے گا، قوم معاف نہیں کرے گی بلکہ قوم ان سے جو اس کے ذمہ دار ہیں، جواب لے گی۔ انہیں ایک دن جواب دینا پڑے گا۔ واضح رہے کہ اصل مسئلہ دستور کی بحالی نہیں ہے۔ میری نظر میں دستور نہ معطل ہوا، نہ کوئی معطل

---

[1] ۳ نومبر ۲۰۰۷ء سے ۱۵ دسمبر ۲۰۰۷ء کے دوران صدر جنرل مشرف نے درج ذیل آئینی ترامیم یا ماورائے آئین احکامات جاری کیے: ۱۔ ہنگامی حالت کا نفاذ (مجریہ ۳ نومبر ۲۰۰۷ء) ۲۔ عارضی آئینی حکم نمبر ا مجریہ ۲۰۰۷ء (ترمیم شدہ) جیسا کہ ۳ نومبر ۲۰۰۳ء کو جاری کیا گیا تھا۔ ۳۔ ججوں کے حلف نامے کا حکم (مجریہ ۱۵ نومبر ۲۰۰۷ء) ۴۔ عارضی آئینی ترمیمی حکم (مجریہ ۱۵ نومبر ۲۰۰۷ء) ۵۔ آئینی ترمیمی حکم ۲۰۰۷ء (۲۱ نومبر ۲۰۰۷ء)۔ (۳ نومبر ۲۰۰۷ء کے حکم کے تحت اسلام آباد ہائی کورٹ کا قیام) ۶۔ دوسرا آئینی ترمیمی حکم ۲۰۰۷ء۔ (۱۴ دسمبر ۲۰۰۷ء) ۷۔ اسلام آباد ہائی کورٹ کے قیام کا حکم ۲۰۰۷ء (۱۴ دسمبر ۲۰۰۷ء) ۸۔ ہنگامی حالت کے نفاذ کے حکم ۲۰۰۷ء کے خاتمے کا حکم (۱۵ دسمبر ۲۰۰۷ء)

کر سکتا ہے۔ دستور میں کوئی ترمیم نہیں ہوئی۔ جسے یہ ترمیم کہہ رہے ہیں اس کی کوئی وقعت، وزن اور حیثیت نہیں ہے۔ یہ محض ان کا اپنا واہمہ ہے کہ میں نے ترمیم کر دی ہے اور ترمیم کے ساتھ آئین بحال کیا ہے۔ یہ سب غیر آئینی ہے۔ ایک مرتبہ قوم کو یہی مؤقف لینا پڑے گا۔ ہم نے نظریہ ضرورت کے تحت بہت سے آمروں کو تحفظ دیا، بہت سے آمرانہ اقدامات کو تحفظ دیا گیا ہے اور میں اس بات پر افسوس کا اظہار کرتا ہوں کہ خود میں نے اور پارلیمنٹ کے اور ارکان نے محض جمہوریت کے لیے راستہ نکالنے کی خاطر عبوری مرحلے کے نام پر یہ کام کیا تاہم آئندہ کے لیے اب کم از کم اس دروازے کو بند ہونا چاہیے۔

میں صاف کہنا چاہتا ہوں کہ ۳ نومبر سے لے کر ۱۵ دسمبر تک جو کچھ ہوا وہ سب غیر آئینی ہے، وہ ناقابل قبول اور کالعدم ہے اور جو لوگ اس کے ذمہ دار تھے انہیں قرار واقعی، قانون اور دستور کے مطابق سزا ملنی چاہیے۔ اگر برطانیہ میں آج جمہوریت مستحکم ہے تو اس لیے کہ جنرل کرامویل (Oliver Cromwell) کو قبر سے نکال کر انہوں نے پھانسی دی اور یہ ثابت کر دیا کہ جس نے بھی پارلیمنٹ، نظام اور قانون کو توڑا ہے وہ سزا سے نہیں بچ سکتا[1]۔ جب تک یہ مثال آپ قائم نہیں کرتے ہیں، آپ ملک میں جمہوریت کو فروغ نہیں دے سکتے۔

حقیقی جمہوریت کیا ہے؟: جناب والا! جمہوریت محض انتخابی جمہوریت کا نام نہیں ہے، جمہوریت نام ہے ایک نظام سیاست کا جس میں دستور کی بالادستی، قانون کی حکمرانی اور عدلیہ آزاد ہو۔ ایک ایسا نظام جس میں پریس آزاد ہو، لوگوں کے بنیادی حقوق محفوظ ہوں اور جس میں وہ اپنی آزاد مرضی سے اپنی قیادت منتخب کریں اور بدلیں۔ یہ ہے جمہوریت۔ محض انتخابی

---

[1] جنرل اولیور کرامویل (Oliver Cromwell) جس نے پارلیمنٹیرینز کی جانب سے کنگ چارلس کی حامی افواج کے خلاف جنگ میں حصہ لیا۔ کرامویل کی فوجوں نے بادشاہ کی فوجوں کو شکست دی اور ملک پر قبضہ کر لیا (۱۶۴۹ء۔ ۱۶۵۰ء)

۱۶۵۳ء میں اس نے طاقت کے زور پر پارلیمنٹ کو تحلیل کر دیا اور اپنے نامزد ممبران کی اسمبلی قائم کر دی۔ ۱۶۵۸ء میں وہ طبعی موت مرا۔ ۱۶۶۰ء میں کنگ چارلس کے حامی جب دوبارہ برسر اقتدار آئے تو انہوں نے جنرل کرامویل کی قبر کھود کر اس کی لاش نکالی اور شہر کے چوراہے پر زنجیروں سے لٹکا دی بعد ازاں اس کا سر قلم کر دیا۔

سیاست جمہوریت نہیں ہے۔ آج جو تحریک اس ملک میں برپا ہے، ہم جس کا حصہ ہیں، وہ صرف انتخابات کے لیے نہیں، وہ اس لیے ہے کہ انتخابات بھی ہوں تو صحیح بنیادوں پر اور ایسے انتخابات ہوں جو فی الحقیقت عوام کے صحیح نمائندوں کو اوپر لا سکیں۔ جو ایسی حکومت کے تحت اور ایسے الیکشن کمیشن کے ذریعے ہوں جن پر اعتماد کیا جا سکے اور جو قواعد اور قوانین کی پابندی اور احترام کے ساتھ ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ جب تک دستور بحال نہیں ہوتا، اور اسے بالادستی حاصل نہیں ہوتی، جب تک فوج کا کردار دفاع تک محدود نہیں ہوتا اور سیاست سے فوج کی ہر مداخلت براہ راست یا بالواسطہ ختم نہیں کی جاتی، جب تک ۲ نومبر ۲۰۰۷ء والی عدلیہ کو بحال نہیں کیا جاتا جدوجہد جاری رکھنی ہوگی۔ آئینی طور پر تو آج بھی وہی جج ہیں اور وہی چیف جسٹس ہے جو ۳ نومبر سے قبل تھے لیکن جسمانی اور طبعی طور پر آئینی چیف جسٹس اور آئینی ججز کو عدالت سے باہر کر دیا گیا ہے۔ ہمیں انہیں ان کے اپنے مقام پر لا کر بٹھانا ہے۔ یہ ہے وہ جدوجہد۔ ہم سمجھتے ہیں کہ انتخابات ابھی بھی تبدیلی لانے کا صحیح طریقہ ہے لیکن انتخابات انتخابات ہوں، ڈھونگ، تماشہ اور فراڈ نہ ہوں، اور وہ اسی وقت ممکن ہے جب یہ تمام شرائط پوری ہوں۔

اس لیے جناب والا! ایمرجنسی کے ذیل میں، میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ اس کا لگنا اور اس کے دوران جو کچھ ہوا وہ غلط تھا، اور اب اس کا اٹھانا بھی بے معنی ہے۔ اصل چیز یہ ہے کہ دستور جیسا کہ وہ ۲ نومبر کو تھا اس کے مطابق نظام چلنا چاہیے۔ اور ان شاء اللہ جیسا کہ وہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو تھا، وہ ویسا ہی رہے گا لیکن یہ کام ہم پارلیمنٹ کے ذریعے کریں گے۔ عدلیہ جیسا کہ وہ ۲ نومبر کو تھی اس کو بحال ہونا چاہیے۔ اس کے بعد پھر ایک حقیقی نگراں حکومت جو کہ متفق علیہ ہو قائم ہو اور ایک نئے الیکشن کمیشن کے تحت انتخاب ہوں۔ اور یہ تمام آداب و ضوابط اور پریس کی مکمل آزادی اور بنیادی حقوق کے تحفظ کے ساتھ منعقد ہوں۔

یہ کیا بنیادی حقوق ہیں کہ پوری عدلیہ آج جیل میں ہے؟ آپ نے ان کے گھروں کو جیل خانہ بنا دیا ہے۔ اعتزاز احسن، جسٹس طارق محمود، علی احمد کرد اور سینکڑوں دوسرے

افراد دباؤ میں ہیں، ان کو دہشت زدہ کیا جارہا ہے۔ یہ سارے کا سارا عمل جمہوریت کی نفی ہے۔ جب تک یہ تمام چیزیں ختم نہیں ہوتیں اس ملک میں پائیدار جمہوری دور شروع نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ہمارے سامنے ایک سماجی وسیاسی عزم ہے یہ تحریک محض کسی خاص تاریخ پر انتخابات کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ تحریک اس ملک کے نظام کو درست کرنے کے لیے ہے۔

۱۸ فروری (الیکشن ۲۰۰۸ کا دن) آئے گا اور چلا جائے گا۔ اصل چیز اس ملک میں دستور، قانون، عدلیہ، پریس کی آزادی، حقیقی انتخابات اور عوام کی مرضی کے مطابق ایک ایسا نظام ہے جو دستور کے مطابق ہو۔ اس نظام کی چار بنیادیں ہیں۔ ہمارا دستور جو متفق علیہ ہے، پہلی بنیاد اس کی اسلام ہے، دوسری بنیاد پارلیمانی جمہوریت ہے، تیسری بنیاد حقیقی وفاق اور چوتھی بنیاد فلاحی معاشرہ، تاکہ عوام کی مشکلات حل ہوں، ان کی ضروریات پوری ہو سکیں۔ اس وقت ہم نے اشرافیہ کا نظام قائم کیا ہوا ہے۔ اس نظام سے ۵ سے ۱۰ فیصد آبادی فائدہ اٹھاتی ہے۔ ساری مراعات اس کے لیے ہیں اور عوام محروم ہیں۔ جب تک یہ چاروں چیزیں نہیں ہوں گی اس وقت تک یہ ملک مستحکم نہیں ہو گا۔

ہم اس ایمرجنسی کو رد کرتے ہیں اور یہ تصور کہ ایک فرد واحد نے دستور میں جو ترامیم کر لیں وہ دستور کا حصہ بن گئیں، یہ غلط ہے، یہ غلط ہے، یہ غلط ہے۔ یہ ناقابل قبول ہے۔ دستور جیسا کہ ۲ نومبر کو تھا، ہمارا وہی دستور ہے اور اس کے اوپر جو بھی ضرب لگائی گئی ہے، جو بھی اس کا مثلہ کیا گیا ہے، ہم اس کی نفی کرتے ہیں اور صاف کہتے ہیں کہ جو اس کے ذمہ دار ہیں، ان شاء اللہ انہیں قرار واقعی سزا دیں گے۔ یہ ہے ہمارا مطالبہ اور یہ کام ہم کسی سے خیرات مانگ کر نہیں بلکہ ایک عوامی تحریک کے ذریعے کریں گے۔ آل پاکستان ڈیموکریٹک موومنٹ اس کے لیے گھر گھر اور شہر شہر جارہی ہے، عوام کو متحرک کر رہی ہے۔ اس تحریک میں سول سوسائٹی، قانون داں اور طلباء، تاجر، علماء، سیاسی قائدین اور سابق فوجی سب مل کر کام کر رہے ہیں، یہ ہے وہ تبدیلی جو آرہی ہے۔ یہ ہے کل کا انقلاب اور اس انقلاب کی طرف ہم جارہے ہیں۔

سب کا احتساب: جناب والا! میں سمجھتا ہوں کہ جب تک کہ یہ تبدیلی نہیں آتی ہے محض جزوی چیزوں اور مفاہمتوں سے اور درمیانی راستوں کی باتیں کرنے سے ہم اس دلدل سے نہیں نکل سکتے۔ اب اس کا ایک راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ قانون ضرورت کو دفن کر دیا جائے۔ یہ جو توثیق کا چکر چلا ہے اسے ہمیشہ کے لیے ختم کیا جائے۔ دستور اور قانون کے مطابق سب برابر ہوں۔ میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ خواہ فوجی ہوں یا سیاسی ہوں، شہری ہوں اور وردی والے ہوں، سب کا احتساب ہونا چاہیے۔ جس نے ماضی میں یا آج قوم کی دولت کو لوٹا ہے، ان کا قانون کے مطابق احتساب ہونا چاہیے، کھلا کھلا ہونا چاہیے، کوئی اس میں سمجھوتہ نہیں ہونا چاہیے۔ میں اپنے آپ کو سب سے پہلے پیش کرتا ہوں۔ لیکن احتساب کے نام پر سیاسی انتقام یہ غلط ہے اور سیاسی انتقام کے نام پر احتساب سے بھاگنا یہ بھی غلط ہے۔

ہمیں اب لازماً حالات کو درست کرنا ہو گا اور وہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم سب اس قوم اور ملک کو بچانے کے لیے جو اصولی پوزیشن ہے اس کے مطابق کام کریں۔ آج اگر اصول فاتح ہوتا ہے تو ان شاء اللہ پاکستان ہمیشہ قائم رہے گا ان شاء اللہ قائم رہے گا لیکن اس کے لیے ہمیں اپنا فرض ادا کرنا ہو گا۔

(۴ فروری ۲۰۰۸ء)

دستور میں ۱۸ویں ترمیم: پس منظر و پیش منظر

۱۹۷۳ء میں پاکستانی پارلیمنٹ میں موجود سیاسی جماعتوں نے ایک متفقہ آئین تشکیل دیا۔ تاہم بعد ازاں جناب ذوالفقار علی بھٹو، جنرل محمد ضیاء الحق اور جنرل پرویز مشرف کے ادوار میں آئین میں ترامیم ہوئیں جس کے نتیجہ میں آئین کا وفاقی، اسلامی اور جمہوری کردار متاثر ہوا۔ جنرل مشرف کی حکومت کے خاتمہ کے بعد سیاسی جماعتوں نے پارلیمانی کمیٹی کی سفارشات کی روشنی میں آئین میں ایک جامع ترمیم [۱۸ویں ترمیم] کی جس میں نہ صرف آئین کی اصل شکل و صورت کو بحال کیا گیا اس کے ساتھ ہی گزشتہ چالیس برسوں میں قومی و بین الاقوامی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں اور مسائل کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ۱۸ویں آئینی ترمیم کے لیے بننے والی کمیٹی میں پروفیسر خورشید احمد بھی بطور رکن شریک تھے۔ کمیٹی کے ایک فعال رکن کی حیثیت سے وہ کمیٹی میں ہونے والی بحث اور اس ماحول کا بھی براہ راست حصہ تھے جس میں ۱۸ویں ترمیم کے لیے تجاویز پر اتفاق ہوا۔ زیر نظر تحریر میں انہوں نے ۱۸ویں ترمیم کے حوالہ سے پس منظر اور پیش منظر پر جو تبصرہ کیا ہے وہ اس پورے ماحول اور اس میں طے کی گئی ترجیحات کی حکمت کو سمجھنے میں مددگار ہے۔

جناب چیئرمین! ہم اس وقت ایک نہایت ہی اہم دستوری ترمیم پر غور کر رہے ہیں جسے صرف ترمیم کہنا اس کی اہمیت کم کرنا ہے۔ جیسا کہ میرے اور ساتھیوں نے بھی کہا کہ ۱۹۷۳ء کے بعد یہ ایک غیر معمولی موقع ہے کہ زیر بحث ترمیم کے ذریعہ دستور میں اس کے بنیادی ڈھانچے کی حفاظت کرتے ہوئے تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ ان تبدیلیوں کے نتیجہ میں دستور میں جو بھی مشکلات اور بدصورتیاں مختلف وجوہ سے آگئی تھیں، ان کی اصلاح کی گئی ہے اور ۳۷ سال میں جو مسائل، ضروریات اور تقاضے سامنے آئے ہیں، بڑی حد تک ان کا احاطہ

کرتے ہوئے دستور کو آج کے حقائق سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ بڑی ضروری کوشش تھی اور میں پارلیمانی کمیٹی برائے دستوری اصلاحات اور خصوصیت سے اس کے چیئرمین میاں رضا ربانی کو ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کی قیادت میں اس کمیٹی نے ایک تاریخی خدمت انجام دی ہے لیکن یہ سمجھنا غلط ہے کہ اس ترمیم کے ذریعے ہمارے سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔ جن مشکلات سے ملک بھرا ہوا ہے ان سے ہم نکل جائیں گے اور جو خطرات منڈلا رہے ہیں، ہم ان سے آسانی سے نجات پالیں گے۔ اس لیے میں اپنی گفتگو کو ان چند مسائل تک محدود کروں گا جو اس ترمیم سے منسلک ہیں نیز اس کے تقاضے کیا ہیں؟ اور قوم کے سامنے اب آئندہ ایجنڈا کیا ہے؟

اتفاق رائے کی اہمیت: پہلے میں یہ بات عرض کروں گا کہ دستور میں ترمیم کا معاملہ بڑا نازک ہے اور میری نگاہ میں ۱۹۷۳ء کے دستور کی جو دو بنیادی کامیابیاں ہیں ان میں پہلی یہ ہے کہ اس وقت کی سیاسی قیادت نے، جس میں جناب ذوالفقار علی بھٹو اور اپوزیشن کی جماعتیں ہدیہ تبریک کی برابر کی مستحق ہیں، اپنے اختلافات کو نظر انداز کر کے قومی اتفاق رائے پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اکتوبر ۱۹۷۲ء میں دستور سے متعلق ایک معاہدہ کیا جاتا ہے (معاہدے کا خلاصہ مضمون کے آخر میں دیا گیا ہے) اور اس میں پچیس اصول طے کیے جاتے ہیں، پھر کمیٹی بنائی جاتی ہے جو ان کی روشنی میں خلاصہ تیار کرتی ہے اور یہ پورا زمانہ بڑی پریشانی کا زمانہ ہے۔ بڑے اختلافات ہوتے ہیں، بعض اوقات بائیکاٹ بھی ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ لوگ ہمت نہیں ہارتے۔ قومی اتفاق رائے پیدا کرنے کے لیے قربانی بھی دیتے ہیں اور راستہ نکالتے ہیں حتّٰی کہ دستور کی خواندگی شروع ہو جانے کے بعد بھی اپوزیشن کے اصرار پر سات ترامیم قبول کی گئیں۔ بھٹو صاحب نے خود اپنی تقریر میں کہا ہے کہ ہم نے ڈھانچہ بنایا تھا اس میں ۴۰ فیصد تبدیلیاں حزب اختلاف کے کہنے پر کی گئی ہیں۔ تو یہ افہام و تفہیم اس پورے عمل کا ایک بنیادی حصہ تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ اسی جذبے کے تحت آج ۲۰۱۰ء میں جو ترامیم آرہی ہیں، وہ بھی سارے اختلافات کے باوجود اور بڑے بنیادی امور پر مذاکرات، حتّٰی کہ بعض

اوقات رخنہ پڑ جانے کے بعد بھی کمیٹی بحیثیت مجموعی اتفاق رائے کے ساتھ تجاویز دے رہی ہے۔

دستور پاکستان کے چار بنیادی ستون: دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس دستور کے چار بنیادی ستون ہیں۔ اس کا اسلامی کردار، اس کا پارلیمانی اور جمہوری ہونا، اس کا وفاقی ڈھانچہ اور اس میں فلاحی مملکت کا تصور۔ یہ چاروں اصول اس کا جزو لازم ہے۔ جناب چیئرمین! اگر آپ مجھے اجازت دیں تو اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، ذوالفقار علی بھٹو صاحب نے ۱۹۷۳ میں بحیثیت چیئرمین پیپلز پارٹی اور خود قومی اسمبلی کے قائد ایوان کی حیثیت سے جو بات کہی تھی، اس کو یہاں آپ کی خدمت میں ریکارڈ کے لیے پیش کروں۔ ان کا کہنا تھا کہ:

(ترجمہ): ”مجھے یقین ہے کہ آج کا دن مستقبل کے لیے ایک نیک شگون ہے۔ ہم ۲۵ سالوں میں بہت سے تنازعات اور جھگڑوں کے بعد اس مقام پر پہنچے جہاں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا ایک بنیادی قانون ہے۔ ہمارے پاس ایک آئین ہے اور کوئی بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ یہ آئین پاکستانی عوام کی آرزوؤں اور امنگوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ کوئی بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ جمہوریہ کی کسی بھی تعریف کے مطابق یہ آئین ایک جمہوری آئین ہے۔ کوئی بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ یہ وفاقی آئین ہے۔ کوئی بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ خود مختاری کی حدود کا تصفیہ موجود ہے اور اس کے لیے خدا کا شکر ہے۔ کوئی بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ یہ اسلامی آئین ہے۔ اس میں پاکستان کے ماضی کے کسی بھی آئین کے مقابلے میں اور مسلم ممالک کے کسی بھی دوسرے آئین سے زیادہ اسلامی دفعات موجود ہیں“۔

یہ چار اصول جو میں نے آپ کو بتائے ہیں، یہ پہلے دن سے اس دستور کے چار بنیادی ستون ہیں اور ہم نے ان کے اندر رہ کر کام کیا ہے۔ اس پہلو سے میں سمجھتا ہوں کہ اسی جذبے اور انہی بنیادوں کی حفاظت اور ان پر مزید تعمیر کا کام (موجودہ) کمیٹی نے کیا ہے۔

آئینی ترامیم پر بحث کی اہمیت اور نوعیت: اب میں اگلے مسئلے کی طرف آتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ دستور کا بنانا ہو یا ترمیم، پارلیمنٹ کی یہ ذمہ داری ہے کہ اس پر کھل کر بحث کرے۔ سارے پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے تمام نقطہ ہائے نظر اور تمام پارٹیوں کو پورا پورا موقع دیا جائے۔ اس میں ناشائستہ جلد بازی ایک جرم بلکہ گناہ ہے۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ ۱۹۷۳ء کے آئین کا بل ۲۔ فروری ۱۹۷۳ء کو پیش ہوا تھا اور ۱۰۔ اپریل ۱۹۷۳ء کو منظور ہوا تھا۔ اس وقت سینیٹ نہیں تھی، اسمبلی میں دو مہینے اور سات دن اس پر بحث کرنے کے بعد نتیجے پر پہنچے۔

آئین کی وہ ترمیم جس میں مسلمان کی تعریف کی گئی ہے[1]، وہ بھی ایک قسم کی خاص دستوری ترمیم ہے اور نشانِ منزل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ترمیم ایوان میں ۳۰۔ جون ۱۹۷۴ء کو پیش ہوئی ہے اور ۷۔ اکتوبر ۱۹۷۴ء کو منظور ہوئی ہے۔ اس پر تین مہینے لگائے گئے۔ ایک آئینی ترمیم جو جنرل ضیاء الحق کے زمانے میں ہوئی ۱۹۸۵ء کی اسمبلی نے کی، آپ دیکھیں کہ اس میں قومی اسمبلی نے ۳۷۔ دن لیے۔ وہ ترمیم ۸ ستمبر ۱۹۸۵ء کو پیش ہوئی ہے اور ۱۶۔ اکتوبر ۱۹۸۵ء کو منظور ہوئی ہے اور سینیٹ نے اس کے بعد مزید چار دن اس کو بہتر کرنے کے لیے صرف کیے۔

۱۷ویں ترمیم اس کے برعکس، چار دن میں اسمبلی سے اور دو دن میں سینیٹ سے پاس ہوئی۔ اس مرتبہ قومی اسمبلی اسمبلی نے چار دن کے اندر ۱۰۲۔ دفعات جو ۹۵ آرٹیکلز کو متاثر کر رہی ہیں، نکال دی ہیں۔ میں اس رویہ پر کوئی گرفت نہیں کرنا چاہتا لیکن ریکارڈ کے لیے یہ بات کہنا چاہتا ہوں اور آپ کو اور قائد ایوان کو شاباش دیتا ہوں کہ سینیٹ نے جلد بازی کا وہ

---

[1] آرٹیکل ۲۶۰(۳)(الف) ''مسلم'' سے کوئی ایسا شخص مراد ہے جو وحدت و توحید قادر مطلق اللہ تبارک و تعالیٰ، خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ کی ختم نبوت پر مکمل اور غیر مشروط طور پر ایمان رکھتا ہو اور پیغمبر یا مذہبی مصلح کے طور پر کسی ایسے شخص پر نہ ایمان رکھتا ہو نہ اسے مانتا ہو جس نے حضرت محمد ﷺ کے بعد اس لفظ کے کسی بھی مفہوم یا کسی بھی تشریح کے لحاظ سے پیغمبر ہونے کا دعویٰ کیا ہو یا جو دعویٰ کرے۔

راستہ اختیار نہیں کیا اور ہم نے کہا کہ کھلے دل سے بحث کریں گے، سب کو موقع دیں گے، خواہ اس میں تین، چار یا پانچ دن لگیں۔ دستوری ترامیم پر بحث کی یہی روح ہونی چاہیے۔ لیکن اس وقت ان دستوری ترامیم کے سلسلے میں ایوان صدر (اس وقت جناب آصف علی زرداری صدر پاکستان تھے) سے جو آوازیں آرہی ہیں وہ ہمارے لیے تشویش کا باعث ہیں۔ کہا جارہا ہے کہ تاریخ میں یہ پہلی مرتبہ ہو رہا ہے کہ اختیارات صدر سے منتقل ہو رہے ہیں۔ میں متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ سٹریٹ کارنر تقریر اور چیز ہوتی ہے لیکن جب معاملات دستور کے ہوں تو انہیں حقائق کی بنیاد پر زیر بحث آنا چاہیے۔

جناب چیئرمین! فروری ۲۰۰۸ء کے انتخابات کا میری پارٹی نے بائیکاٹ کیا لیکن جنہوں نے شرکت کی ان کے منشور اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ چارٹر آف ڈیموکریسی (زیر نظر تحریر کے آخر میں خلاصہ دیا گیا ہے) مئی ۲۰۰۶ء میں اس بنیاد پر بنا ہے کہ دستور کو ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کی صورت پر واپس لایا جائے گا۔ اس کی روشنی میں اختیارات کی یہ منتقلی کوئی خیرات نہیں ہے۔ عوام نے یہ فیصلہ دیا کہ جو اختیارات ہتھیائے گئے تھے وہ واپس آنے چاہییں۔ کوئی اپنے اختیارات کو واپس نہیں کر رہا اور جو صدر بنا ہے اس کو معلوم تھا کہ کس مینڈیٹ پر یہ پارلیمنٹ منتخب ہو کر آئی ہے۔ ہمیں دکھ اس بات کا ہے کہ دو سال ہم نے ضائع کر دیے۔ تقریباً پندرہ مہینے کے بعد کمیٹی بنی اور کمیٹی نے نو مہینے محنت کر کے ایسی ترامیم پیش کی ہیں جس پر ہم فخر کر سکتے ہیں۔ چنانچہ یہ سمجھنا اور کہنا کہ یہ کوئی اختیارات کی بھیک دی جارہی ہے یہ بات غلط ہے۔

یہ بھی آپ جان لیجیے کہ جنرل ضیاء الحق کے دور میں آٹھویں دستوری ترمیم کے ضمن میں پارلیمنٹ میں ۵۸(۲)(بی) پر بہت بحث ہوئی۔ لیکن ذرا غور کیجیے کہ اس وقت کی اسمبلی میں لڑکر ڈکٹیٹر سے یہ حق چھینا گیا کہ ۵۸(۲)(بی)[1] کے تحت اگر صدر کوئی اقدام کرتا ہے تو

[1] ۵۸(۲)(بی) صدر مملکت کو یہ اختیار دیتی تھی کہ مناسب وجوہات کی بناء پر وہ قومی اسمبلی کو تحلیل کر سکتا تھا۔

اس کو کورٹ میں چیلنج کیا جا سکتا ہے۔ بعد ازاں صدر نے جو بھی اقدامات کیے ان میں سے کم از کم دو ایسے ہیں جن کو سپریم کورٹ غلط کہا۔ مشرف کا بھی یہی معاملہ تھا کہ انہوں نے سول اختیارات لے لیے لیکن پھر اسمبلی نے ۱۷ویں ترمیم کے اندر اس بات کی کوشش کی کہ سپریم کورٹ کو یہ اختیار دیا جائے کہ اگر صدر اسمبلی پر شب خون مارتا ہے تو پندرہ دن کے اندر اندر سپریم کورٹ میں جایا جا سکتا ہے اور ایک مہینے کے اندر اندر وہ طے کرے گی۔ ایسا نہیں ہے کہ اسمبلی نے اپنے حق کو حاصل کرنے کے لیے جدوجہد نہیں کی۔

احساس ملکیت: جناب والا! اگلی چیز جو میری نگاہ میں بہت اہم ہے اور جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا وہ 'ملکیت کا احساس' ہے۔ ۱۹۷۳ء کا دستور پارلیمنٹ نے بنایا۔ اس کے بعد پارلیمنٹ نے پہلی سات ترامیم کیں۔ آٹھویں اور ۱۷ویں ترمیم غیر معمولی حالات میں ہوئیں۔ ان ترامیم کے ذریعے جنرل ضیاء الحق اور جنرل پرویز مشرف کے ماورائے آئین اقدامات کو سند جواز عطا کیا گیا۔ یہ مارشل لاء یا سول مارشل لاء کا دور تھا اور بلاشبہ اس سے نکلنے کے لیے مخصوص راستہ اختیار کیا گیا۔ ان ترامیم کی ابتداء پارلیمنٹ سے باہر ہوئی اور پارلیمنٹ نے اس میں ترامیم کر کے کچھ تھوڑا بہت آگے بڑھایا اور کچھ پیچھے ہٹے۔ ۱۸ویں ترمیم کا سب سے بڑا حاصل یہ ہے کہ ان تمام چیزوں کو جنہیں پارلیمنٹ درست نہیں سمجھتی تھی نکال دیا گیا ہے۔ جنہیں ٹھیک سمجھتی تھی انہیں رکھا گیا ہے۔ اب اس دستور میں جو کچھ ہے یہ پارلیمنٹ کا حصہ ہے، یہ قوم کی ملکیت ہے، اس کا قانونی جواز ہے اور اب اس کے بارے میں کوئی یہ بات کہنے کا حق نہیں رکھتا کہ فلاں چیز فلاں نے ڈالی، فلاں چیز فلاں نے نکالی اب یہ پارلیمنٹ کے منظور شدہ دستور کا مقدس حصہ ہے۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

منزل نہیں سنگ میل: اس کے ساتھ ایک اور بنیادی چیز یہ ہے کہ اس ترمیم کے ذریعے سے دستور کا ایک ارتقائی عمل نظر آ رہا ہے کہ دستور ایک جامد چیز نہیں ہے ایک متحرک چیز ہے۔ اس بنا پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس ارتقائی عمل کو سامنے رکھتے ہوئے ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ ۱۸ویں ترمیم سنگ میل ہے منزل نہیں۔ جو کچھ اس وقت حاصل کیا جا سکتا تھا، جتنا

ممکن تھا کی بنیاد پر اسے ہم نے حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہم اعتراف کرتے ہیں کہ اس میں کمزوریاں ہیں، ہم اعتراف کرتے ہیں کہ مختلف امور میں پارٹیوں کا اصولی مؤقف اس سے مختلف بھی تھا اور ہے اور وہ اس پر قائم ہیں۔ وہ اس کے لیے کام کر رہے ہیں۔ ہم اپنی اپنی پوزیشن سے دستبردار نہیں ہو رہے لیکن ہم یہ ضرور کہنا چاہتے ہیں کہ یہ ایک سنگ میل ہے اور اسی حیثیت سے یہ سنگ میل ہماری تاریخ کا حصہ بھی بنے گا اور جمہوری ارتقاء میں اپنا کردار ادا کرے گا۔

صوبہ سرحد کے نام کا مسئلہ: یہاں پر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس وقت صوبہ سرحد کے نام کے معاملے میں جو مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس پر ہمیں ٹھنڈے دل سے ملک، دستور اور جمہوریت کے مفاد میں غور کرنا چاہیے۔ میری پارٹی کا مؤقف یہ رہا ہے کہ نام سے زیادہ اہم چیز کام ہے۔ لیکن نام بھی ایک ضروری چیز ہے۔ ایک صوبے کے عوام اگر اس نام سے مطمئن نہیں ہیں۔ دوسرا نام چاہتے ہیں، وہ ان کا حق ہے۔ البتہ یہ کام جمہوری عمل کے ذریعے افہام و تفہیم سے ہونا چاہیے۔ کمیٹی نے اسی بات کی کوشش کی اور ہمیں یہ تاثر ملا کہ اب جو نام طے ہوا ہے، یعنی 'خیبر پختونخوا' اس پر بڑی حد تک اتفاق رائے ہے۔

اس سلسلے میں جناب چیئرمین! میں آپ کے سامنے یہ بات رکھنا چاہتا ہوں کہ ہم لسانی بنیاد پر صوبوں کے نام یا ان کی حدود کا تعین پسند نہیں کرتے۔ یہ ملک ایک اعلیٰ نظریے کے لیے حاصل ہوا ہے۔ اسلام کی بنیاد پر حاصل ہوا ہے۔ صوبے انتظامی ڈھانچہ ہیں۔ وہ کوئی مقدس نہیں ہیں۔ ان میں تبدیلی ہو سکتی ہے اور مشورے سے تبدیلی کا راستہ کھلا رہنا چاہیے، نام تو معمولی چیز ہے لیکن یہ اتفاق رائے سے رکھنا چاہیے۔ میری جماعت نے یہ بات کی کہ جس نام پر سب لوگ متفق ہو جائیں گے ہم اس کا ساتھ دیں گے۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ 'پختونخوا' کے ساتھ 'خیبر' کا لگانا ایک بہت ہی مثبت پیش رفت ہے۔ اس لیے کہ 'خیبر' محض ایک جگہ یا درّے کا نام نہیں ہے بلکہ خیبر نبی پاک ﷺ کے دور میں آخری بڑا معرکہ ہے۔ یہ

اسلام کی فتح و سربلندی کی علامت ہے اور یہ وجہ تھی کہ جب اس درّے سے مسلمان آئے تو انہوں نے اس کا نام درّہ خیبر رکھا۔ یہ پس منظر تھا جس کی بنا پر ہم نے اس بات کو پسند کیا اور جس پر اتفاق رائے ہو گیا ہے اسے ہمیں آگے بڑھانا چاہیے۔

میں اپنے تمام ساتھیوں سے پوری دردمندی کے ساتھ یہ اپیل کرنا چاہتا ہوں کہ جو صورتحال صوبے میں ہے، اسے نظر انداز نہ کیا جائے۔ اس کا سیاسی نوٹس لیں، لوگوں سے مل کر بات چیت کریں، سیاسی بات چیت کے بغیر کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ اسے قوت سے حل کرنے یا دبانے کی کوشش کی جائے گی تو وہ نقصان دہ ہو گا اور جو محنت ہم نے کی ہے اس کے متاثر ہونے کا خطرہ ہے۔ میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ اب بھی اگر باہم مشاورت سے کوئی تبدیلی ہوتی ہے تو ہم اس پر بھی غور کرنے کے لیے تیار ہیں۔ ہم اس معاملے میں ہرگز رکاوٹ نہیں بنیں گے لیکن ہماری خواہش یہی ہے کہ یہ معاملہ افہام و تفہیم اور مذاکرات سے حل کیا جائے۔ اس کے لیے قوت کا استعمال صحیح نہیں ہے اور نہ اسے سیاست بازی کے لیے استعمال ہونا چاہیے۔

دستور میں اہم تبدیلیاں: جناب والا! اس (۱۸ویں) دستوری ترمیم کے ذریعے وہ باتیں جن کی طرف میرے دوستوں نے اشارہ کیا ہے، وہ بالکل صحیح ہیں۔ یعنی نمبر ایک، اس میں ہم نے بنیادی حقوق کو دو بار دیکھا ہے۔ یہ عوام کے فائدے کی چیز ہے اور اس میں تعلیم کا حق پہلی مرتبہ پاکستان کے دستور میں ایک بنیادی حق کے طور پر آیا ہے اور یہ مفت اور لازمی تعلیم ہے۔ ہماری خواہش یہ تھی کہ اس میں وقت بھی دیا جائے کہ زیادہ سے زیادہ دس سال کے اندر اندر اسے مکمل طور پر نافذ کر دیا جائے گا لیکن ہم اس میں کامیاب نہیں ہو سکے لیکن تعلیم کا حق کی حیثیت سے آجانا یہ بجائے خود ایک بہت بڑی کامیابی ہے۔ اطلاعات تک رسائی کا حق، سیاسی تنظیم سازی کا حق، اس کے ساتھ ساتھ شفاف عدالتی کارروائی اور پھر دستور کے آرٹیکل ۶ کی

ترامیم، میری نگاہ میں بڑی اہم تبدیلیاں ہیں[1]۔

صحیح پارلیمانی نظام کی تشکیل: دوسری جانب جناب والا! جسے صدر کے اختیارات کی وزیر اعظم کو منتقلی کا کہا جارہا ہے، وہ اپنی جگہ بالکل صحیح ہے۔ لیکن میں ایک نکتہ کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں جس کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔ ہمارے سامنے ہرگز یہ نہیں تھا کہ صدارتی نظام کو ہم ایک غیر متوازن پارلیمانی وزارتی نظام بنادیں۔ یہ بہت بڑا المیہ ہوتا۔ بلاشبہ ہم پارلیمانی نظام چاہتے ہیں اور پارلیمان کا لیڈر وزیر اعظم ہے۔ لیکن وزیر اعظم مطلق اختیار نہیں رکھتا۔ اس لیے آپ یہ دیکھیں گے کہ بڑی احتیاط سے اس میں ترامیم کی گئی ہیں ان ترامیم کے نازک فرق کو سمجھنا ضروری ہے۔ مثلاً آپ دیکھیں گے کہ ترمیم میں ہم نے صدر کی جگہ وفاقی حکومت رکھا ہے، گورنر کی جگہ صوبائی حکومت رکھا ہے۔ وزیر اعظم کی جگہ ہم نے کابینہ رکھا ہے اور کابینہ کے بعد وزیر اعظم اور وزراء کو لائے ہیں۔ یہ وہ ساری تبدیلیاں ہیں جس سے ہم ایک صحیح پارلیمانی نظام بنانا چاہتے ہیں۔

اسی طرح آپ یہ دیکھیے کہ وزیر اعظم کے اختیارات کو بھی ہم ادارتی ڈھانچے کی مشاورت کی طرف لائے۔ تمام معاملات تو نہیں لا سکے لیکن جہاں ممکن تھا، ہم لائے۔ مثال کے طور پر الیکشن کمیشن کا مسئلہ بڑا ہی بنیادی مسئلہ ہے اور جو تبدیلیاں اس میں کی گئی ہیں ان پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ہم نے پہلی تبدیلی یہ کی ہے کہ اس

---

[1] آرٹیکل ۶۔ سنگین غداری: (۲)(۱) کوئی بھی شخص جو طاقت کے استعمال یا طاقت سے دیگر غیر آئینی ذریعے سے دستور کی تنسیخ کرے، تخریب کرے یا معطل کرے یا التواء میں رکھے یا اقدام کرے یا تنسیخ کرنے کی سازش کرے یا تخریب کرے یا معطل یا التواء میں رکھے سنگین غداری کا مجرم ہوگا۔

(۲) کوئی شخص جو شق (۱) میں مذکورہ افعال میں مدد دے گا یا معاونت کرے گا یا شریک ہوگا اسی طرح سنگین غداری کا مجرم ہوگا۔

(۲)(الف) شق (۱) یا شق (۲) میں درج شدہ سنگین غداری کا عمل کسی بھی عدالت کے ذریعے بشمول عدالت عظمیٰ اور عدالت عالیہ جائز قرار نہیں دیا جائے گا۔

(۳) مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) بذریعہ قانون ایسے اشخاص کے لیے سزا مقرر کرے گی جنہیں سنگین غداری کا مجرم قرار دیا گیا ہو۔

وقت توجہ کا مرکز الیکشن کمشنر تھا صرف وہی کل وقتی تھا۔ باقیوں کے لیے فہرست وزارت کو جاتی تھی۔ ہم نے اسے باقاعدہ الیکشن کمیشن بنایا۔ بلاشبہ اس کا چیئرمین وہی ہے لیکن اس کے باقی چار ارکان ہیں وہ بھی اب مستقل اور کل وقتی رکن ہیں۔ پھر نہ صرف چیف الیکشن کمشنر بلکہ پورے کمیشن کا انتخاب ہم نے وزیر اعظم کی صوابدید پر نہیں چھوڑا بلکہ اس میں اپوزیشن لیڈر کو شامل کیا۔ اگر اتفاق رائے نہ ہو تو پھر ہم نے پارلیمنٹ کی نگرانی رکھ دی اور پارلیمنٹ کی نگرانی کو سینیٹ اور اسمبلی میں ایک تہائی، دو تہائی کے تناسب پر رکھا ہے۔ یہ بڑا ہی اہم اقدام ہے نیز اس کا دورانیہ تین تا پانچ سال رہے گا۔ دیکھیے وزیر اعظم کے اختیار کو بھی ہم نے صوابدیدی اور مطلق یا من مانا نہیں رکھا بلکہ اسے ادارتی شکل دی۔ اسی طرح ججوں کا معاملہ ہے۔ ہم تو چاہتے تھے کہ اور جگہوں پر بھی ایسا ہو لیکن ہم اس سمت میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ اس لیے اب پارلیمان کی بالادستی ہے محض وزیر اعظم کی نہیں اور وزیر اعظم پارلیمان کے سامنے جوابدہ ہے۔

صوبائی خود مختاری: ایک اور پہلو جس کی طرف میں آپ کی توجہ دلاؤں گا جناب چیئرمین! وہ صوبائی خود مختاری ہے۔ یہ بڑا خاردار مسئلہ تھا اور میں ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں اپنے سارے ساتھیوں کو کہ سب نے سر جوڑ کر حل نکالنے کی کوشش کی۔ ہم نے جو تصور قائم کیا ہے وہ یہ ہے کہ وفاق اور صوبے شراکت دار ہیں، حریف نہیں ہیں، اس لیے مشترکہ ملکیت، مشترکہ کنٹرول، مشترکہ نگرانی اور ایسے ادارتی انتظامات شامل ہیں جس کے ذریعے سے یہ دونوں مشترکہ تعامل کے ذریعے فیصلے اور قانون سازی کر سکیں۔ یہ ایک مختلف نمونہ ہے۔

اس موقع پر یہ بات بھی کہنا چاہتا ہوں، جناب چیئرمین! کہ اب ہمیں وفاقی ذہن سے اس دوسرے ذہنی رویے کی طرف آنا پڑے گا۔ یہ ایک مختلف نمونہ ہے اور اس کے لیے غیر معمولی کام کی ضرورت ہے۔ پارلیمنٹ بھی آزمائش میں ہے، وفاقی حکومت کا بھی امتحان ہے لیکن ساتھ ساتھ صوبائی حکومتوں اور سیاسی جماعتوں کی بھی آزمائش ہے۔

بلا تمثیل میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جب پاکستان قائم ہوا ہے تو ایک بہت بڑا چیلنج تھا کہ

تقسیم ہند کے جو اثاثے اور خدمات تھیں یا ادارے اور وسائل تھے، تین مہینے کے اندر پاکستان کو، ان سب کو سنبھالنا پڑا اور نظام چلانا پڑا۔ اس وقت جو ہم نے تصور دیا ہے اس کے نتیجے میں میری نگاہ میں ۱۵ سے زیادہ وزارتیں مرکز میں ختم ہو کر صوبوں کو منتقل ہو جائیں گی۔ درجنوں ادارے تحقیق کے ہیں۔ کارپوریشنز اور اتھارٹیز ہیں، ان سب کو دوبارہ دیکھنا ہو گا۔ ان میں سے بہت سے منتقل ہوں گے۔ پچاس ہزار سے زیادہ سرکاری ملازمین فالتو ہو جائیں گے لیکن اس سے بیروزگاری پیدا نہیں ہونی چاہیے بلکہ آپ کو دیکھنا ہو گا کہ انہیں کس طرح صوبوں میں ضم کیا جائے۔ صوبوں میں وسعت اور مہارت پیدا کرنی چاہیے اور یہ ذمہ داری ملنے کے بعد پیدا ہو گی۔ ان سب کاموں کو ہمیں سوچ سمجھ کر کرنا پڑے گا۔ اس ضمن میں ہم نے کم از کم تجویز دی ہے کہ ۵ ادن کے اندر اندر ایک منتقلی کمیشن قائم کیا جائے اور یہ کمیشن ایسا ہونا چاہیے کہ جیسی قیادت اس پارلیمانی کمیٹی کو میسر آئی اسی نوعیت کی قیادت ہو تاکہ ذمہ داری، محبت، شراکت اور اعتماد کے ساتھ کام ہو سکے۔ یہ تمام کام کرنے کے لیے ایک انتظامی، ادارتی اور مالیاتی منصوبہ بنانا ہو گا۔

وفاق اور صوبوں میں توازن: اسی ضمن میں دوسری بات یہ ہے کہ آپ کو اپنی سروسز پوری طرح سے منظم کرنا پڑیں گی۔ اس لیے ہم نے سفارش کی ہے کہ وفاقی پبلک سروس کمیشن، صوبائی پبلک سروس کمیشن اور سروسز کے ڈھانچوں کی تشکیل نو ہو۔ تنخواہوں اور پنشن کے بارے میں جو رپورٹ آ رہی ہے، وہ بھی ان ہی تمام چیزوں سے تعلق رکھتی ہے۔ جناب والا! یہ بہت بڑا چیلنج ہے اور اس کے لیے ادارتی پالیسی کے نفاذ اور تربیت کے بہت سارے کام کرنے ہوں گے۔

یہاں میں یہ بات بھی کہہ دوں کہ جو تنقید کچھ حلقوں سے آئین کی متفقہ فہرست کے بارے میں ہو رہی ہے میرے خیال میں وہ غلط فہمی کی بناء پر ہے۔ بلاشبہ یہ آئٹم اس سے پہلے صوبے اور مرکز دونوں کا حصہ تھے۔ ہم نے کوشش کی کہ ان میں سے پانچ، سات جن میں ہم آہنگی ناگزیر ہے، اسے ہم وفاقی لسٹ میں شامل کریں۔ لیکن بیشتر آرٹیکل ۱۴۲، اور پھر

وفاقی فہرست کا حصہ دوم محض مرکز کے ہاتھ میں نہ ہوں بلکہ صوبے اور مرکز مل کر ان کی پالیساں بنائیں، ان کی نگرانی بھی کریں اور ان کی بنیاد پر قانون سازی کریں۔ یہ بہت ہی اہم چیز ہے۔ ساتھ ہی ہم نے یہ بھی رکھا ہے کہ جب تک کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، تمام قوانین میں تسلسل نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد صوبائی اسمبلیاں اپنے دائرہ اختیار کے اندر ترمیم کر سکتی ہیں لیکن ساتھ یہ بھی گنجائش ہے کہ اگر کسی صوبے کی صلاحیت نہیں ہے تو وہ مرکز کو یہ اختیار دے سکتا ہے۔ اس طرح ہم نے ایک توازن قائم کیا ہے اور اس بنیاد پر یہ کہنا کہ اس فہرست کے ختم ہونے سے خدانخواستہ کوئی افراتفری پیدا ہو جائے گی، یہ صحیح نہیں ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ ہمیں کام کرنا ہو گا اور کام کے بغیر بات نہیں بنے گی۔

وہ کام جو ابھی کرنے ہیں: جناب والا! اس کے بعد میں واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ابھی ہمارا ایجنڈا ختم نہیں ہوا ہے۔ سب سے اہم پہلو اس پر عمل ہے۔ عمل اس طرح کہ لفظی و معنوی ہو اور بنیادی حقوق، آزاد عدلیہ، پارلیمنٹ کی بالادستی، صوبائی خود مختاری اور فلاحی مملکت کے مقاصد حاصل ہو سکیں۔

اگر اس کو ہم نے نظر انداز کیا تو اس وقت ملک میں توانائی کی جو کیفیت ہے جو معاشی بدحالی، بے روزگاری اور مہنگائی ہے یہ سب چیزیں بحران کی شکل اختیار کر سکتی ہیں۔ دوسری جانب آئی ایم ایف کے دباؤ ہیں کہ مثلاً انہوں نے آپ کے اوپر یہ پابندی لگا دی کہ آپ یکم جولائی سے پہلے پہلے یہ سب کریں جبکہ پارلیمنٹ کی کمیٹی اور فیڈرل بورڈ آف ریونیو والے کہہ رہے ہیں کہ ہم اس پوزیشن میں نہیں ہیں لیکن وہ کہتے ہیں کہ نہیں! ہمارا حکم ہے اور اس کے ساتھ زر تلافی ختم کرو۔ توانائی کی قیمتیں بڑھاؤ اور بجلی کی قیمتیں بڑھاؤ۔ یہ خلفشار کی طرف ہمیں لے کر جا رہے ہیں۔ جناب چیرمین! مجھے یہ کہتے ہوئے دکھ ہوتا ہے کہ ہم اپنی آزادی سے عملاً محروم ہو چکے ہیں۔ اس صورت حال سے نکلنے کے لیے ہمیں جنگی بنیاد پر کام کرنا ہوں گے۔

منتقلی کمیشن کا قیام: میری نگاہ میں فوری طور پر جو کام کرنے کے ہیں ان میں منتقلی کمیشن کا قیام

نہایت اہم ہے۔ آپ یہ دیکھیں کس طرح عوام کو زیادہ سے زیادہ حق دے سکتے ہیں اور ان کے مسائل کو حل کر سکتے ہیں۔

جناب والا! یہاں میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ جماعت اسلامی اور مسلم لیگ کی طرف سے تعلیم کے حوالہ سے الگ الگ تجاویز تھیں جنہیں ہم منظور نہیں کرا سکے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ وقت ہے کہ میں آن ریکارڈ آپ کے سامنے اس کا ذکر کروں کہ میری اور جماعت اسلامی کی تجویز یہ تھی کہ:

(ترجمہ):"ریاست دستور میں اس دفعہ کے شامل ہونے کے بعد دس برس کے اندر اندر پاکستان کے تمام باشندگان کے لیے غربت اور ناخواندگی کے خاتمے اور تحفظ صحت کی سہولت مہیا کرنے کو یقینی بنائے گی اور اس دفعہ میں مقررہ وقت کے اندر اندر اس مقصد کے حصول کے لیے اقدامات کا تعین کرے گی۔ حکومت ۲۰۱۹ء تک تمام پاکستانی باشندوں (عورت یا مرد) لازمی اور مفت تعلیم کو یقینی بنانے کے لیے قانون سازی کرے گی"۔

اس تجویز کو ہم منظور نہیں کرا سکے لیکن دستور کے آرٹیکل ۳ کے اندر اس کے لیے بنیاد موجود ہے۔ آنے والے دنوں میں ہمیں لازماً ان بنیادی حقوق پر آنا پڑے گا تاکہ یہاں ہر شخص عزت کی زندگی گزار سکے اس کے پاس رہنے کے لیے مکان اور کھانے کے لیے روٹی ہو، یہ ضروری ہے۔

اسلامی دفعات: جناب والا! ہماری خواہش یہ تھی کہ اسلامی دفعات کو مزید مضبوط کیا جائے۔ چند چیزیں اس ترمیم کے اندر ہوئی ہیں لیکن ابھی اس پر مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسلامی نظریاتی کونسل نے اور سیاسی جماعتوں نے اس پر سفارشات دی ہیں، ان پر کام ہونا چاہیے اور آئندہ دستور اور پالیسی دونوں سطح پر ان چیزوں کو کرنے کی ضرورت ہے۔ جناب والا! اسی ضمن میں ہم نے اس بات کا مطالبہ کیا تھا کہ صدر کی طرف سے رحم کے

حقوق سے متعلق جو آرٹیکل ۴۵ ہے[1]، یہ انصاف کے مطابق نہیں ہے۔ جو فیصلہ عدلیہ کرتی ہے وہ فائنل ہونا چاہیے۔ ایگزیکٹو کو اس میں دخل اندازی کا اختیار نہیں ہونا چاہیے۔ جہاں تک حدود کا تعلق ہے اس معاملے میں اسلام بالکل واضح ہے کہ کسی انسان کو یہ حق نہیں ہے کہ حدود کے معاملے میں مداخلت کرے لیکن یہ تسلیم نہیں ہو سکا۔ بہر حال یہ ہمارا ایجنڈا ہے اور ہم اس کے لیے کوشش جاری رکھیں گے۔

اہم عہدوں پر تقرریوں کی مدت: جناب والا! ہم نے یہ تجویز بھی رکھی تھی کہ سروسز چیفس اور جتنی بھی اہم تقرریاں ہیں ان تقرریوں کا عرصہ متعین ہونا چاہیے، یہ قابل توسیع نہیں ہونا چاہیے۔ ہندوستان میں آپ دیکھیے کہ ۱۹۴۷ء سے آج تک کوئی ایک ایسی مثال نہیں ہے کہ سروسز چیف کو توسیع ملی ہو اور ہمارے ہاں پہلے سروسز چیف کو توسیع کا مسئلہ پیدا ہوا اور اس کے بعد سے ہم آج تک مصیبت بھگت رہے ہیں۔

پارلیمانی بالادستی: ہماری خواہش ہے کہ یہ تبدیلی آئے۔ دستوری کمیٹی میں ہم نے یہ بھی رکھا تھا کہ اہم کارپوریشنز، پبلک باڈیز، پبلک اتھارٹیز، نان پروفیشنلز سفارت کاروں، ڈپلومیٹس ان سب کے لیے پارلیمانی نگرانی ہو۔ میری نگاہ میں پارلیمنٹ کی بالادستی کے لیے بھی اور ان اداروں کو عوام کے سامنے جوابدہ بنانے کے لیے یہ بہت ضروری چیز ہے۔ اسی طرح ہم نے یہ بھی کہا تھا کہ جتنے بھی بین الاقوامی معاہدے، موتمر اور میثاق ہیں ان کو پارلیمنٹ میں آنا چاہیے یا کم از کم سینیٹ میں آنا چاہیے۔ ساتھ ہی ہم نے یہ بھی کہا تھا کہ اور حقیقی بات بھی یہی ہے کہ وزراء، پرائم منسٹر، صدر، ججز اور گورنرز سب حلف لیتے ہیں لیکن جو مشیر مرکز یا صوبوں میں مقرر کیے جاتے ہیں اور انہیں تمام اختیارات حاصل ہوتے ہیں حتّٰی کہ ان کے پاس گورنمنٹ کے سارے خطوط آتے ہیں، یہ کابینہ میں شریک ہوتے ہیں، یہ پارلیمنٹ میں شریک ہوتے ہیں، یہ فیصلہ کرتے ہیں لیکن ان کے لیے کوئی حلف نہیں ہے۔ یہ

---

[1] صدر کا معافی وغیرہ دینے کا اختیار: آرٹیکل ۴۵ صدر کو کسی عدالت ٹریبیونل یا دیگر ہیئت مجاز کی دی ہوئی سزا معاف کرنے، ملتوی کرنے اور کچھ عرصہ کے لیے روکنے اور اس میں تخفیف کرنے اور اسے معطل یا تبدیل کرنے کا اختیار ہو گا۔

نہایت ہی بڑا سقم ہے۔ یہ چیزیں ہم اپنے ساتھیوں سے منظور نہیں کرا سکے لیکن ظاہر ہے ہم نے یہ تجویز دی تھی ان کے لیے بھی حلف ہونا چاہیے۔ ہم آئندہ بھی اس کے لیے کوشش کریں گے۔

فاٹا کا مسئلہ: ایک اور اہم مسئلہ جو ہم نے اٹھایا تھا وہ قبائلی علاقوں (فاٹا) کا مسئلہ ہے۔ جو ظلم اب تک فاٹا میں ہو رہا ہے۔ یعنی دور غلامی کے قوانین چل رہے ہیں۔ ایف سی آر پر عمل ہو رہا ہے انہیں تبدیل کرنے کی ضرورت ہے[1]۔ موجودہ حکومت نے اقتدار میں آتے ہی اعلان کیا تھا کہ ایف سی آر میں بنیادی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ آج تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ فاٹا کے عوام کی حیثیت کیا ہے؟ وہ گورنر اور صدر کے ہاتھوں میں محصور ہیں۔ ہم نے یہ بات اٹھائی ہے کہ ان کے لیے بھی وہ سب حقوق ہونے چاہییں جو باقی شہریوں کے لیے ہیں۔ آپ نے انہیں اسمبلی اور سینیٹ میں نمائندگی دی ہے لیکن وہاں کوئی نظام نہیں ہے۔ تو ہم اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ وہاں کے لوگوں کے لیے ان کی مرضی کے مطابق نظام بنایا جائے، ان کو قومی دھارے سے جوڑا جائے۔ ان کو تمام حقوق بھی حاصل ہوں اور تمام سہولتیں بھی حاصل ہوں تاکہ وہ ملکی معاملات میں مساوی کردار ادا کر سکیں۔

اسلام آباد میں بلدیاتی نظام: جناب چیئرمین! ایک اور چیز جو بہت ضروری ہے وہ اسلام آباد میں بلدیاتی نظام کا قیام ہے۔ اسلام آباد اس وقت بیوروکریسی کے رحم و کرم پر چلتا ہے۔ ہم نے اسلام آباد میں ہائی کورٹ بنا دی لیکن اسلام آباد کی کوئی مقامی حکومت نہیں ہے۔ یہاں پر بلدیاتی نظام قائم ہونا چاہیے جو اس وقت دنیا کے سارے اہم شہروں میں ہوتا ہے۔ مگر

---

[1] شمال مغربی سرحدی علاقوں کے آزاد قبائلی علاقوں کو ۱۸۶۷ء میں برطانوی ہند کے حکمرانوں نے زیر انتظام لیا۔ ان علاقوں میں خطرناک جرائم سے نمٹنے کے لیے ۱۸۷۳ء میں خصوصی قانون جاری کیے گئے جن کا خلاصہ یہ ہے کہ فرنٹیئر کرائم ریگولیشنز (ایف سی آر) کے تحت نہ اپیل، نہ وکیل، نہ دلیل، یعنی کسی بھی سزا پر نظر ثانی کے لیے کسی عدالت میں درخواست کرنے کا حق نہیں نہ قانونی نمائندگی (وکیل) کا حق ہے اور نہ ہی کسی گواہی یا استدلال کو پیش کرنے کے حق ہے۔
پروفیسر خورشید احمد کی یہ تقریر ۲۰۱۰ء کی ہے۔ بعد ازاں ۲۰۱۸ء میں فاٹا (FATA) عارضی حکمرانی قوانین کے ذریعے ایف سی آر کو ختم کیا گیا اور فاٹا کو خیبر پختونخواہ میں شامل کرتے ہوئے صدارتی حکمرانی میں دے دیا گیا۔

اسلام آباد میں یہ موجود نہیں ہے۔

ہم چاہتے ہیں کہ مذکورہ تمام امور اور ان سے جڑے دوسرے مسائل کو لیا جائے تاکہ دستور اور پالیسی دونوں کے تحت اہم مقاصد یعنی اسلام کا نظام انصاف، سماجی عدل، پارلیمانی جمہوریت، فیڈریشن اور فلاح وخوشحالی حاصل کرنے کے لیے پوری پوری کوششیں کی جاسکیں۔ (۱۳؍اپریل ۲۰۱۰ء)

وزارتوں کی صوبوں کو منتقلی اور اس کے مسائل[1]

۱۸ویں ترمیم کے تحت جو وزارتیں صوبوں کو منتقل کی گئی ہیں، یہ ہر طرح سے ایک بڑا اہم اور تاریخی اقدام ہے۔ لیکن عملدرآمد کے نقطۂ نظر سے اس وقت دو مسئلے ہیں۔ ایک یہ کہ جو افراد ان وزارتوں میں یہاں پر کام کر رہے تھے، ان کی کھپت کیسے ہو اور اس میں یہ بات بھی سامنے رہے کہ اس ادارے کی مہارت اور معلومات ان ہی لوگوں کے پاس تھیں۔ جبکہ یہ ادارے صوبوں کو منتقل ہو رہے ہیں، اس بات کی ضرورت تھی کہ صوبے ان افراد سے فائدہ اٹھا سکیں لیکن بظاہر یہ معلوم ہو رہا ہے کہ صوبوں نے ان افراد کو لینے سے انکار کر دیا ہے اور حکومت کو انہیں سرپلس پول میں ڈالنا پڑ رہا ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ ان کو بے روزگار نہیں کرنا چاہیے لیکن سوال یہ ہے کہ ان سے فائدہ کیسے اٹھایا جائے؟ اس میں صوبوں کے تعاون اور اتفاق رائے سے عبوری مرحلہ طے ہونا چاہیے۔ میری نگاہ میں یہ بہت بڑا مسئلہ ہے کہ اگر صوبوں میں وہ مناسب صلاحیت موجود نہیں ہوگی تو اختیارات کی منتقلی کے جو فوائد ہونے چاہیں وہ نہیں ہو سکیں گے۔ اگر وہ نئی ابتداء کرتے ہیں تو اس سے مسائل پیدا ہوں گے۔ میں جاننا چاہوں گا کہ اس کے بارے میں حکومت نے کیا حکمت عملی اختیار کی ہے اور اس میں صوبوں کی شمولیت کیسے ہے، اس لیے کہ کوئی چیز یکطرفہ نہیں ہو سکتی۔

---

[1] پروفیسر خورشید احمد نے ۱۸ویں ترمیم پر عملدرآمد کے حوالہ سے یہ مختصر تقریر 'توجہ دلاؤ نوٹس' کے ذیل میں ترمیم کی منظوری کے ۸ ماہ بعد کی۔

کوشش ہونی چاہیے کہ فریقین کی شمولیت کے ساتھ کوئی متفقہ و مشترکہ چیز تیار کی جائے۔

جناب چیئرمین! میں اس نکتہ کی جانب آپ کو متوجہ کرنا چاہوں گا کہ اس توجہ دلاؤ نوٹس کے اسپانسرز پر اگر آپ نگاہ ڈالیں، تو اس میں حکومت اور اپوزیشن اور ہر پارٹی اور ہر صوبے سے لوگ شریک ہیں۔ اس پہلو سے یہ ایک منفرد تحریک ہے، آپ کو بھی اور حکومت کو بھی اسے غیر معمولی توجہ دینی چاہیے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ۱۸ویں ترمیم کی کمیٹی میں، میں تھا، ایس ایم ظفر صاحب اور برادرم وسیم سجاد بھی تھے، وہ گواہی دیں گے کہ ہم نے یہ سارے معاملات وہاں بھی اٹھائے تھے کہ بلاشبہ ہم ذمہ دار بھی ہیں اور آرزومند بھی کہ اختیارات نچلی سطح پر منتقل ہوں۔ لیکن یہ اختیارات و فرائض صوبوں کو دینے کے بعد جو معیار کا مسئلہ اور انتظامی چھتری اور یکسانیت کا مسئلہ ہے اس پر غیر معمولی توجہ کی ضرورت ہے۔ اس میں قانون کا پیشہ بھی آتا ہے، حساب کتاب، تعلیم و صحت، ادویات غرض اسی طرح کے بہت سے معاملات شامل ہیں۔

ان کے لیے ہمیں جلد از جلد کوئی نہ کوئی راستہ نکالنا چاہیے۔ صرف مشترکہ مفادات کونسل کو یہ اتھارٹی ہونی چاہیے کہ نمبر ا۔ صوبوں میں وہ ماہرین پر مشتمل ادارے بنائے۔ ان اداروں کو وسائل ملیں اور ساتھ ہی یہ باہم مربوط ہوں تاکہ معیارات اور ضوابط کار میں مسائل نہ پیدا ہوں۔ بدقسمتی سے ہماری اس کوشش کو اس وقت قبولیت حاصل نہ ہوئی۔ بعد ازاں جب میں (سینیٹر پروفیسر خورشید) نے ۱۸ویں ترمیم پر تقریر کی، اس میں ایک بار پھر کہا کہ آپ نے جو ایک سال کا وقت اختیارات کی منتقلی کا رکھا ہے، خدا کے لیے اس میں اس بات کی بھی کوشش کیجیے کہ صوبوں میں تضاد پیدا نہ ہو جائے یہ بہت ضروری ہے۔

اس وقت صورتحال یہ ہے کہ بیوروکریسی چند چیزوں کو اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتی ہے اور باقی صوبوں پر ڈال دیا ہے اس اہتمام کے بغیر کہ وہ وہاں ان کا حق ادا کر سکیں۔ یہ دراصل تباہی کا راستہ ہے اس لیے اس مسئلے کو سنجیدگی سے لیں۔ صوبوں کو پورے اختیارات ملنے چاہییں، وہاں ادارے بننے چاہییں، قواعد و ضوابط بننے چاہییں، ذمہ دار ادارے ہوں اور

ساتھ ساتھ چاروں صوبوں کا باہم رابطہ ہو تا کہ دنیا کے سامنے ہمارا ایک معیار رہے۔ اگر اس پر توجہ نہ دی گئی تو یہ عدم توازن بھی ہو گا کہ جو زیادہ ترقی یافتہ صوبے ہیں وہ بہت آگے بڑھ جائیں گے اور جو تھوڑے ذرا پیچھے ہیں وہ اور پیچھے چلے جائیں گے۔ تو ہمیں اس بات کی کوشش بھی کرنی ہے کہ تمام صوبوں کے درمیان ہم آہنگی اور یکسانیت بھی ہو، اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اس پر آپ کو بھی اور حکومت کو بھی پوری توجہ دینی چاہیے۔

(۳۱جنوری، ۲نومبر ۲۰۱۱ء)

ضمیمہ: ۱۹۷۳ء کے دستور کے بنیادی خدوخال پر پیپلز پارٹی اور اپوزیشن کے معاہدہ کا خلاصہ

۱۶دسمبر ۱۹۷۱ء کو سقوط مشرقی پاکستان کے بعد ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو جنرل یحییٰ خان نے مغربی پاکستان سے قومی اسمبلی میں اکثریتی پارٹی پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئر مین جناب ذوالفقار علی بھٹو کو بطور مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر (سویلین) اقتدار منتقل کیا۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو نے کچھ عرصہ بطور مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر حکمرانی کے بعد سیاسی جماعتوں سے مذاکرات کر کے قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کیا جس میں ایک عبوری دستور منظور کیا گیا جس میں صدارتی نظام قائم کیا گیا تھا۔ بعد ازاں قومی اسمبلی میں موجود سیاسی جماعتوں نے مستقل دستور بنانے کے لیے ۲۰ ۔اکتوبر ۱۹۷۳ء کو پاکستان کے مستقل دستور کے بنیادی معاملات پر رہنما خطوط کا تعین کر کے ایک معاہدہ پر دستخط کیے۔ اس تاریخی معاہدے کی رو سے پاکستان میں دوایوانی پارلیمنٹ قائم کرنے، قومی اسمبلی اور سینیٹ کے اراکین کی تعداد، انتخاب کے طریقہ کار، وزیر اعظم کے انتخاب کے طریقہ کار، اس کے خلاف تحریک عدم اعتماد کا طریقہ کار، بالغ رائے دہی کی بنیاد پر عام انتخابات، آبادی کی بنیاد پر قومی اسمبلی کے نشستوں کی تقسیم، سینیٹ میں تمام صوبوں کو مساوی نمائندگی، صوبائی خود مختاری کی حدود، وفاق اور صوبوں میں اختیارات کی تقسیم، مشترکہ مفادات کونسل کا قیام، قانون سازی کا طریقہ کار، سینیٹ اور قومی اسمبلی کے دائرہ کار کا تعین اور دستور کی اسلامی دفعات کا تعین کیا گیا۔ جس کے مطابق ریاست کا مذہب اسلام ہو گا۔ ریاست کا سربراہ مسلمان ہو گا۔ ریاست کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان ہو گا۔ کوئی قانون قرآن و سنت کے خلاف نہیں بنایا جائے گا، عدلیہ اور الیکشن کمیشن آزاد ہوں گے۔

اس معاہدے پر جناب ذوالفقار علی بھٹو سمیت تمام پارلیمانی جماعتوں کے سربراہوں نے دستخط

کیے۔ بعد ازاں ایک پارلیمانی کمیٹی نے ۱۹۷۳ء کے دستور کا مسودہ تیار کیا جسے بعد میں قومی اسمبلی میں پیش کر کے منظوری حاصل کی گئی۔

ضمیمہ: خلاصہ میثاق جمہوریت

۱۵ مئی ۲۰۰۶ء کو میثاق جمہوریت پر پاکستان پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ن) نے دستخط کیے۔ ۱۶ مئی ۲۰۰۲ء کے روزنامہ ڈان میں اس کا متن شائع ہوا ہے۔

میثاق جمہوریت مئی ۲۰۰۶ء کو لندن میں پاکستان پیپلز پارٹی کی چیئر پرسن محترمہ بے نظیر بھٹو اور مسلم لیگ (ن) کے سربراہ جناب محمد نواز شریف کے دستخط سے ہوا۔ اس میں فوجی آمریت سے ملک کو پہنچنے والے نقصان کا تذکرہ کیا گیا اور پاکستان اور جمہوریت سے اپنی محبت کا اعادہ کرنے کے بعد طے کیا گیا کہ ۱۹۷۳ء کے دستور کو ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو فوجی انقلاب سے پہلے کی پوزیشن پر بحال کیا جائے گا۔

آئندہ مسلح افواج کے سربراہان، چیف جسٹس سپریم کورٹ آف پاکستان اور گورنروں کا تقرر ملک کے منتظم اعلیٰ یعنی وزیر اعظم کریں گے۔ اٹارنی جنرل اور اعلیٰ عدلیہ کے ججوں کے تقرر کے لیے ایک متفقہ طریقہ کار طے کیا گیا اور طے پایا کہ آئندہ کوئی جج عبوری آئینی حکم کے تحت حلف نہیں اٹھائے گا تمام خصوصی عدالتوں کو ختم کر دیا جائے گا۔

آئینی مسائل کے لیے ایک وفاقی آئینی عدالت قائم کی جائے گی۔ دستور سے وفاقی فہرست ختم کی جائے گی۔ نئے مالیاتی ایوارڈ کا اعلان کیا جائے گا۔ قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں خواتین کی مخصوص نشستیں پارٹیوں کو ان کے ووٹوں کی تعداد کے مطابق دی جائیں گی۔ اقلیتوں کو نمائندگی دینے کے لیے سینیٹ کی نشستوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے گا۔ فاٹا کو صوبہ خیبر پختونخواہ میں شامل کیا جائے گا۔ شمالی علاقہ جات کو خصوصی حیثیت رکھتے ہوئے ترقی دی جائے گی۔ بلدیاتی انتخاب جماعتی بنیادوں پر صوبائی الیکشن کمیشن کی نگرانی میں ہونگے۔ قومی سلامتی کونسل تحلیل کر دی جائے گی، مسائل کے حل اور حقائق کی تلاش کے لیے ایک سچائی اور مصالحتی کمیشن قائم کیا جائے گا۔

نیب کی جگہ ایک آزاد احتساب کمیشن قائم کیا جائے گا۔ پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا کو آزادی دی جائے گی۔ پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کا چیئرمین قائد حزب اختلاف نامزد کرے گا۔ ایک مؤثر کمانڈ اینڈ کنٹرول سسٹم کابینہ ڈیفنس کمیٹی کے تحت قائم کیا جائے گا۔ کشمیر کا مسئلہ اقوام متحدہ کی قرار دادوں کی روشنی میں حل

کیا جائے گا۔ اچھی حکمرانی قائم کی جائے گی۔ کسی بھی منتخب حکومت کو غیر آئینی طور پر ہٹانے کی کوشش نہیں کی جائے گی۔ کوئی سیاسی قوت کسی بھی فوجی حکومت کا حصہ نہیں بنے گی۔ فلور کراسنگ سے بچنے کے لیے اوپن ووٹنگ سسٹم اختیار کیا جائے گا۔ پارلیمنٹ کے اراکین کی طرح تمام فوجی و عدالتی افسران کو سالانہ اثاثے ظاہر کرنے کا پابند کیا جائے گا۔

ملک میں جمہوری ثقافت کے فروغ کے لیے ایک قومی جمہوری کمیشن قائم کیا جائے گا۔ دہشت گردی اور انتہا پسندی کی مذمت کی گئی۔ ایک آزاد و خود مختار الیکشن کمیشن کی زیر نگرانی آزادانہ و شفاف الیکشن کرائے جائیں گے۔ عام انتخابات آزادانہ و شفاف کرانے کے لیے ایک غیر جانبدار نگراں حکومت قائم کی جائے گی تمام فوجی و سیکورٹی ادارے جیسے آئی ایس آئی، ایم آئی، وزارت دفاع کے ذریعے وزیر اعظم کو جوابدہ ہوں گے۔ وفاقی بجٹ پارلیمنٹ میں پیش کیا جائے گا۔ قومی زمینوں کی الاٹمنٹ اور کنٹونمنٹ کے معاملات وزارت دفاع کی نگرانی میں آئیں گے۔ ملک میں پارلیمانی نظام کی بہتری کے لیے قواعد بنائے جائیں گے۔

ججوں کی تقرری میں پارلیمنٹ کا کردار
(۱۹ویں آئینی ترمیم)

پاکستان میں ججوں اور عدلیہ کا کردار اکثر زیر بحث رہا ہے۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی میں منتخب اسمبلی توڑنے کے فیصلے کی حمایت میں نظریہ ضرورت کے تحت جسٹس منیر کے فیصلے نے اہل دانش کی توجہ نظام عدل اور ججوں کی تقرری اور کردار پر مرکوز کر دی جس سے یہ بات سامنے آئی کہ ججوں کی تقرری میں اکثر اوقات اقربا پروری اور سیاسی تعلقات کار فرما رہے ہیں جس کے نتیجے میں عدالتی ساکھ اور فیصلے متاثر ہوئے۔ پاکستانی پارلیمنٹ نے طویل تجربات کی روشنی میں اعلیٰ عدلیہ میں ججوں کے تقرر کے طریقہ کار کو بہتر بنانے کے لیے ۱۹ویں آئینی ترمیم سے حدود قیود متعین کیں جس کے نتیجے میں توقع کی گئی کہ آئندہ زیادہ بہتر لوگ ان مناصب پر فائز ہوں گے۔ پروفیسر خورشید احمد نے ترمیم کے موقع پر جو خطاب کیا اس میں ترمیم کی ضرورت، حکمت اور اس ضمن میں سامنے آنے والے ردعمل سے متعلق حقائق کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

دستور سپریم ہے

جہاں تک دستور کی ۱۹ویں ترمیم کا تعلق ہے، میں چاہوں گا کہ سب سے پہلے اس بات کو واضح کروں کہ ملک میں اداروں کے درمیان تصادم کی ایک فضا بن رہی تھی۔ اس لحاظ سے سپریم کورٹ کا ۲۱ اکتوبر ۲۰۱۰ء کا فیصلہ ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔[1] اس کے نتیجے میں اس تصادم کو راہ پانے کا کوئی موقع نہیں دیا گیا، بلکہ ملک میں دستور، دستوری

---

[1] فیصلے کا تعلق ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے ججوں کے تقرر میں سپریم جوڈیشل کونسل اور ججوں کے تقرر کے حوالہ سے پارلیمانی کمیٹی کے اختیارات اور طریقہ کار سے متعلق ہے۔

اداروں اور اختیارات کے تقسیم ثلاثہ کو، جو سیاسی استحکام کے لیے ضروری ہے، بڑے مؤثر انداز میں تقویت دی گئی۔ اس لیے میں سپریم کورٹ کو اس کی دانشمندی اور حقیقت پسندی پر خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔ اس فیصلے کی رو سے یہ بات متعین ہو گئی ہے کہ پاکستان کا دستور سپریم ہے اور دستور میں جہاں تک قانون سازی، پالیسی سازی اور دستور کی ترامیم کا تعلق ہے، یہ حق صرف پارلیمنٹ کا ہے۔

بھارت کی سپریم کورٹ کے فیصلوں کی وجہ سے وہاں آئین کے حوالہ سے دو اصول تسلیم کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ دستور کا ایک بنیادی ڈھانچہ ہوتا ہے جسے عام دستوری ترمیم کے طریقے سے تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ دوسرا اصول سپریم کورٹ کا یہ اختیار ہے کہ وہ دستور کی کسی بھی ترمیم کو دستوری ڈھانچہ کی بنیاد پر غلط قرار دے سکتی ہے۔ پاکستان کے دستوری فیصلوں میں اس کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اس تناظر میں، میں سمجھتا ہوں کہ سپریم کورٹ نے اپنے فیصلے میں دستوری ڈھانچے کی جو بات کی، وہیں یہ اصول بھی واضح کر دیا ہے کہ اس ڈھانچے کا اہتمام اور تحفظ بھی پارلیمنٹ کی ذمہ داری ہے۔ اس اصول کو سامنے رکھتے ہوئے عدالت نے اس بنیاد پر کوئی مداخلت نہیں کی۔ اب یہ اصول محکم ہو گیا ہے کہ یہ صرف پارلیمنٹ کا اختیار ہے کہ وہ دستور میں ترمیم کر سکتی ہے۔ یہاں میں آپ کی اجازت چاہوں گا کہ جس فیصلے کا سپریم کورٹ نے حوالہ دیا ہے (یعنی حاکم خان والا مقدمہ ۱۹۹۲ء) میں اس کا ایک پیراگراف ریکارڈ پر لاؤں تاکہ یہ اختلافی بحث ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ:

> (ترجمہ): ''اس لیے، موجودہ کیس میں، اگر ہائی کورٹ سمجھتی ہے کہ آئین کی دفعہ ۴۵ بعض حوالوں سے اسلام کے اصولوں کے خلاف ہے تو اسے بغرض اصلاح پارلیمنٹ کے نوٹس میں لانا چاہیے جو آئین میں ترمیم کرنے کی اہل ہے اور پارلیمنٹ ہی اس دفعہ کو اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھالنے کے لیے مناسب قانون سازی کر سکتی ہے''۔

دستور میں ترمیم کے اختیار کے سلسلہ میں اس اصول کا تسلیم کیا جانا ایک بہت بڑی کامیابی ہے۔ جناب والا ! دوسری بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ۱۸ویں ترمیم میں بھی اور ۱۹ویں ترمیم میں بھی، عدلیہ کی آزادی ایک بڑا ہی مرکزی خیال ہے۔ جمہوریت اور اسلام دونوں کا یہ مسلمہ اصول ہے اور دور خلافت راشدہ میں بھی نظام قضاء کو جس اصول پر قائم کیا گیا ہے وہ یہی تھا۔ اس دور میں بلاشبہ قاضی کا تقرر خلیفہ کرتا تھا لیکن تقرر کے بعد قاضی آزاد ہوتا تھا اور قضاء کا پورا نظام اس کی ہی نگرانی میں کام کرتا تھا۔ ہماری پوری تاریخ میں عدلیہ کی آزادی اسلامی قضاء کی روایات کا ایک مرکزی تصور رہی ہے۔

جج کی اہلیت اور کردار: میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ آزادی کا تعلق جج کی صلاحیت اور اس کے کردار سے ہے۔ بلاشبہ تقرر کے طریقہ کار کا بھی اس میں ایک حصہ ہے اور یہاں آپ مجھے اجازت دیں کہ میں بھارتی سپریم کورٹ کا ایک حوالہ آپ کی خدمت میں پیش کروں، یہ وہاں کے ایک چیف جسٹس ہدایت اللہ نے اپنی کتاب Constitutional Law of India میں صاف الفاظ میں رقم کیا ہے:

> (ترجمہ):''جج کی تقرری کا طریقہ نہیں بلکہ یہ جج کا کردار ہی ہے جو عدلیہ کی آزادی کو یقینی بناتا ہے۔ چیف جسٹس نے کہا کہ عدلیہ کی آزادی کا براہ راست تعلق اس شخص کے کردار سے ہے جو جج مقرر کیا جاتا ہے اور حلف اٹھانے کے بعد جج سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ آزادانہ طور پر کام کرے گا''۔

یہ بات ہمیں اپنے سامنے رکھنی چاہیے کہ عدلیہ کی آزادی کا آغاز ججوں کے صحیح تقرر سے ہوتا ہے لیکن بالآخر اس کا انحصار جج کے کردار پر ہے۔

جناب والا! دوسری بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ججوں کی تقرریوں کے سلسلے میں جو قانون اور روایات ہمارے ملک میں رہی ہیں، وہ کوئی اچھی مثال پیش نہیں کرتیں۔ اس بات سے آپ بھی واقف ہیں کہ برطانیہ کے دور سے چیف ایگزیکٹو، چیف جسٹس کے مشورے سے

ججوں کی تقرری کیا کرتا تھا۔ یہ سلسلہ ۱۹۵۰ء تک جاری رہا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اس دور میں ججوں کا تقرر بالعموم اہلیت کی بنیاد پر ہوا اور یہی وجہ ہے کہ اس وقت عدلیہ آزاد تھی، اس میں دیانت اور کردار بھی نظر آتا تھا۔ انہوں نے بالعموم اپنی ذمہ داریوں کا حق ادا کیا لیکن بد قسمتی سے، جسٹس منیر کے دور سے حالات بدلنے لگے۔ ایوب خان کے زمانے میں تقرریوں کے لیے جو طریقہ اختیار کیا گیا اس میں، اقرباء پروری، جانب داری اور سیاسی وفاداریوں کا لحاظ رکھا گیا اور پھر مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ اس معاملے میں ہماری تاریخ میں پچھلے چالیس سال خاصے تاریک رہے ہیں۔ آپ معروف پاکستانی قانون داں حامد خان صاحب کی کتاب ''پاکستان کی دستوری و سیاسی تاریخ'' کو دیکھیں جس میں نام لے لے کر ایک ایک واقعہ دیا گیا ہے کہ کس طریقے سے ججوں نے جو تجاویز دیں وہ بھی جانب داری کا شکار تھیں اور بار بار اہلیت کے مقابلے میں رشتہ داریاں غالب رہیں اور پھر سیاستدانوں نے بھی اپنے اپنے دور میں بد قسمتی سے یہی کام کیا۔

میں نام نہیں لینا چاہتا لیکن جن حضرات کی نگاہ سے ہمارے محترم سابق سینیٹر جسٹس (ریٹائرڈ) عبد الرزاق تھہیم کی کتاب ''Judiciary and Judges'' گزری ہے، وہ گواہی دیں گے کہ اس میں پوری داستان ہے کہ ماضی میں ججوں کے تقرر کے سلسلے میں کیا کچھ کیا جاتا رہا ہے۔ جسٹس سجاد علی شاہ کی خود نوشت پڑھیے آپ سر پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں کہ کس طریقے سے اس وقت کی وزیر اعظم (بے نظیر بھٹو) نے اپنے شوہر آصف علی زرداری کو ان سے یہ بات کرنے کے لیے بھیجا کہ حکومت دو ججوں کو نظر انداز کر کے ان کو چیف جسٹس بنانا چاہتی ہے لیکن مطالبہ یہ تھا کہ پہلے وہ وزیر اعظم کو اپنا استعفیٰ لکھ کر دے دیں جس پر کوئی تاریخ درج نہ ہو، تاکہ جب چاہیں وہ ان کو نکال سکیں معاملہ خواہ سیاستدانوں کا ہو یا ججوں کی سفارش کا، دونوں کی مثالیں اچھی نہیں ہیں۔ یہ وہ پس منظر ہے جس میں ہم نے ۱۸ویں اور ۱۹ویں ترمیم کے ذریعے کچھ بنیادی تبدیلیاں کرنے کی کوشش کی ہے۔

ترمیم کا ہدف: پہلا کام یہ ہے کہ ججوں کی تقرری کے سلسلے میں کسی کو صوابدید حاصل نہیں

ہے، نہ چیف جسٹس کو اور نہ ہی چیف ایگزیکٹو کو۔ نمبر دو یہ کہ تقرریوں کے طریقہ کار کو اداروں سے مشاورت کی شکل دی گئی ہے تا کہ کسی ایک گروہ کو بالادستی حاصل نہ ہو، ہر معاملہ کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لے کر سفارش مرتب کی جائے جو دو چھلنیوں سے گزرے، ایک عدالتی کمیشن اور دوسری پارلیمانی کمیٹی۔ اس طرح تفصیلی بحث کی بنیاد پر جو فیصلے ہوں گے قوی تر امکان یہی ہے کہ میرٹ پر ہوں گے۔

ترمیم میں پارلیمنٹ کا کردار: اگلی چیز یہ ہے کہ اس میں عدلیہ اور پارلیمنٹ دونوں کا کردار ہو گا محض ایک کا نہیں۔ اس پر بہت سے اعتراضات کیے گئے ہیں اور مجھے دکھ سے یہ بات کہنی پڑتی ہے کہ بہت سے وکلاء نے جو لائق بھی ہیں اور محترم و معتبر بھی، اپنے بیانات کے اندر اور خصوصیت سے میڈیا ٹاک شوز میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ دنیا میں کہیں بھی پارلیمنٹ کا کردار نہیں پایا جاتا۔ ان نامزدگیوں کو خالص عدلیہ کی تجویز پر منحصر ہونا چاہیے۔ یہ بات امر واقعہ کے خلاف ہے۔(Parliaments of the World)''دنیا کے پارلیمان'' کی جلد دوم کا آخری باب اس موضوع سے متعلق ہے۔ اس کی رو سے دنیا کے ان ۷۰ ممالک میں جن کے جمہوری نظام کی تفصیلات اس میں دی گئی ہیں، ۳۲ ایسے ہیں جہاں پر پارلیمنٹ کا کوئی کردار ہے۔ مثلاً جرمنی، اٹلی، فرانس اور ہالینڈ میں پارلیمنٹ باقاعدہ ججوں/عدلیہ کو منتخب کرتی ہے۔ دنیا کی دو بڑی جمہوریتوں، امریکہ اور برطانیہ کی پوزیشن یہ ہے کہ امریکہ میں سینیٹر حضرات صدر کو نجی طور پر نام تجویز کرتے ہیں اور پھر باضابطہ طور پر صدر نام تجویز کرتا ہے جسے سینیٹ منظور کرتی ہے۔ اسی طرح ججوں کے محاسبے کا بھی سینیٹ ہی کو اختیار ہے۔ برطانیہ کی مثال لیجیے، برطانیہ میں صدیوں سے لارڈ چانسلر جو ایک سیاسی دفتر ہے اور جو دار الامراء کا سپیکر ہوتا ہے وہ ساری تجاویز و سفارشات دیا کرتا تھا۔ انگلستان میں ۲۰۰۵ء میں نیا دستوری ایکٹ منظور کیا گیا ہے جس کے تحت اب یہ اختیار ایک عدالتی کمیشن کو سونپا گیا ہے۔ اس کمیشن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ:

> It will consist of 9 legal members, 3 senior judges, one circuit judge, one lay magistrate, one district

judge, one tribunal member, one barrister, one solicitor and 6 lay[1] members and the chair would be not a judge but a lay member.

عملاً اس کمیشن کی جو پہلی جج بنی ہے اس کا نام Baroness Usha Prashar ہے اور یہ دار الامراء کی ممبر ہے، کوئی جج نہیں ہے۔ اس طرح اس میں پارلیمنٹ کی بھرپور نمائندگی موجود ہے۔ یہاں پر یہ بات بھی مجھے نظر آئی کہ یہ کمیشن ججوں کے ناموں کی تجویز لارڈ چانسلر کو کرے گا اور لارڈ چانسلر کمیشن کی کسی تجویز کو مسترد کر سکتا ہے یا نظر ثانی کرنے کے لیے بھیج سکتا ہے۔ دوبارہ غور کرنے کے بعد یہ نام دوبار آسکتا ہے لیکن اگر مسترد کرتا ہے تو کمیشن دوبارہ وہی نام نہیں بھیج سکتا۔ اس کو دوسرا نام بھیجنا پڑے گا البتہ یہ ضروری ہے کہ لارڈ چانسلر دو سے زیادہ نام مسترد نہیں کر سکتا۔ تیسرا نام اسے قبول کرنا ہوتا ہے۔

ان تمام معلومات کی روشنی میں، میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ اصل اصول یہ ہے کہ تمام عدالتی تقرریاں اہلیت اور صلاحیت کی بنیاد پر ہونی چاہییں۔ صوابدیدی نہ ہوں اور اس میں عدلیہ اور پارلیمنٹ دونوں کا کردار ہو۔ ہم نے ۱۹ویں ترمیم میں ان اصولوں کا اہتمام کیا ہے اور ۱۸ویں ترمیم کے مجوزہ نظام میں عدالت عظمیٰ کی تجاویز کی روشنی میں، جو خامیاں رہ گئی تھیں ان کی اصلاح کر دی گئی ہے لیکن اصولوں پر ہم نے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ میری نگاہ میں یہ ایک تاریخی پیش رفت ہے۔

(۳۰ دسمبر ۲۰۱۰ء)

[1] برطانیہ کے قانونی نظام میں lay members سے مراد وہ مقامی لوگ ہیں جو قانون کے شعبہ میں کسی رسمی تعلیمی سند اور اہلیت کے حامل نہ ہوں لیکن انہیں عدالتی نظام میں کوئی کردار دیا جائے۔

آئین توڑنے پر مقدمہ

سینیٹ میں پیپلز پارٹی کے قائد ایوان جناب رضا ربانی نے پوائنٹ آف آرڈر پر خطاب کرتے ہوئے ۱۸ جنوری ۲۰۱۲ء کے دی نیوز اخبار کے حوالے سے بتایا تھا کہ جنرل مشرف کے ایک قابل اعتماد شخص رضا بخاری (جو آج کل پنجاب اسمبلی میں پاکستان تحریک انصاف کے رکن ہیں) نے امریکی کانگریس کے تین سابق اراکین کے نام ایک خط میں ان سے درخواست کی کہ امریکی حکومت سے یقین دہانی حاصل کریں کہ جب جنرل مشرف پاکستان آئیں تو انہیں گرفتار نہ کیا جائے۔ پاکستان کی سرزمین پر ان کی زندگی کو خطرہ نہ ہو۔ ان کا نام ایگزٹ کنٹرول لسٹ پر نہ ڈالا جائے اور اگر بالفرض جنرل مشرف کو گرفتار کر لیا جائے تو امریکہ کی وزیر خارجہ اس گرفتاری کے خلاف اقدامات کریں۔ اس کے بعد جناب رضا ربانی نے جنرل پرویز مشرف کے خلاف آرٹیکل ۶ کے تحت مقدمہ قائم کرنے کا مطالبہ کیا۔ اس موقع پر سینیٹر مولانا عبدالغفور حیدری نے کہا کہ جنرل مشرف کے خلاف آئین توڑنے پر آرٹیکل ۶ کے تحت مقدمہ قائم کرنے کے حوالے سے ان کی تحریک التواء کو زیر بحث لایا جائے۔ انہوں نے کہا کہ مشرف نے قومی سلامتی کے خلاف پاکستانی ہوائی اڈے غیر ملکی افواج کے حوالے کر کے سنگین غداری کی ہے۔ مسلم لیگ (ن) کے سینیٹر راجہ ظفر الحق نے بھی جنرل مشرف کے خلاف آئین کے آرٹیکل ۶ کے تحت ایف آئی آر درج کرنے کی حمایت کی۔ اسی طرح سینیٹر حاصل بزنجو نے وزیر داخلہ رحمٰن ملک سے سوال کیا کہ وہ ایوان کو بتائیں کہ وہ جنرل مشرف کے خلاف مقدمہ درج کرنے کو تیار ہیں یا نہیں؟

وزیر داخلہ سینیٹر رحمٰن ملک نے جنرل مشرف کے خلاف آئین کے آرٹیکل ۶ کے تحت مقدمہ درج کرنے کے لیے تین مطالبات کیے۔ ۱۔ چونکہ جنرل مشرف نے مسلم لیگ (ن) کی حکومت برطرف کی تھی اور اس کے ساتھ ہی غیر دستوری کچھ اقدامات کیے تھے وہ اس پر ایک تحریری بیان دے۔ ۲۔ جنرل مشرف کے مارشل لاء سے چونکہ سپریم کورٹ براہ راست متاثر

ہوئی تھی اس لیے چیف جسٹس از خود ایکشن لیں اور اس وقت کے واقعات بتائیں۔
۳۔ پارلیمنٹ ایک قرارداد کے ذریعے جنرل مشرف کے خلاف کاروائی کا مطالبہ کر کے حکومت کو سپورٹ مہیا کرے۔

اس پس منظر میں پروفیسر خورشید احمد نے اظہار خیال کرتے ہوئے درج ذیل مطالبہ کیا۔

جناب چیئرمین! میاں رضا ربانی اور دوسرے تمام ساتھیوں کی تائید کرتے ہوئے ہمارا مطالبہ ہے کہ مشرف کے خلاف الزامات کی جو فہرست ہے اس پر کارروائی ہونا چاہیے لیکن آرٹیکل ۶ کے جس پہلو کی طرف میں آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے جیسا کہ خورشید شاہ نے کہا ہے کہ یہ صرف وفاقی حکومت کی ذمہ داری ہے۔ اسے یہ ذمہ داری ادا کرنی چاہیے اور جنرل مشرف کے یہاں آنے کا انتظار نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ مقدمہ درج کرنے کے بعد اس کے لیے وارنٹ جاری کریں، ریڈ وارنٹ جاری کریں۔ اسے انٹرپول کے ذریعے سے بلائیں۔ وہ از خود آئے یا نا آئے، آپ اس کو لائیں تاکہ وہ قوم کے سامنے جوابدہی کرے اور اسے قرار واقعی سزا تک پہنچائیں۔

(۱۸ جنوری ۲۰۱۲ء)

نگراں حکومت کا قیام اور الیکشن کمیشن کی نامزدگی

(۲۰ویں آئینی ترمیم ۲۰۱۲ء)

۲۰ویں آئینی ترمیم کا تعلق پارلیمان کی مدت مکمل ہونے پر نگراں حکومت کے قیام اور الیکشن کمیشن کے چیئرمین اور اراکین کی تقرری سے ہے۔ پاکستان میں کم و بیش تمام ہی انتخابات کے حوالہ سے یہ الزام سامنے آتا رہا ہے کہ قبل از انتخابات دھاندلی سمیت دھاندلی کے معاملات میں نگراں حکومت اور الیکشن کمیشن بھی کردار رہا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ سیاسی جماعتوں نے ان دونوں موضوعات کو اہمیت دی اور ۲۰ویں آئینی ترمیم کے ذریعے نگراں حکومت کے قیام اور الیکشن کمیشن کی نامزدگی کا نیا طریقہ کار طے کیا گیا۔

ترمیم کی منظوری سے قبل پروفیسر خورشید احمد کی زیر نظر تقریر میں مجوزہ ترمیم میں موجود خلاء اور اس کے منفی پہلوؤں پر تبصرہ کرتے ہوئے مثبت طور پر اسے بہتر بنانے کے لیے تجاویز دی گئی ہیں۔

جناب چیئرمین! یہ ایک اہم بل ہے۔ ہر دستوری ترمیم بڑی اہم ہوتی ہے لیکن یہ کئی اعتبار سے غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے اس لیے کہ اس میں حکومت وقت اور الیکشن کمیشن دونوں نے مختلف اوقات میں دستور کی جو خلاف ورزی کی ہے اس کی تلافی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس ترمیم کا اصل مقصد یہی تلافی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ نگراں حکومت مقرر کرنے کے لیے ۱۸ویں ترمیم میں ایک خاص طریقہ کار طے کیا گیا تھا۔ چونکہ حکومت نے قائد حزب اختلاف سے مشورے کے دستوری، قانونی تقاضے پورے نہیں کیے اور وہ راستہ اختیار کیا جس سے مشاورت بے معنی

ہو گئی، اس لیے اس بات کی ضرورت تھی کہ اس مشاورت کو متعین کیا جائے۔ اس پہلو سے اس بل میں بہت ہی واضح راستہ اختیار کیا گیا ہے۔ میری نگاہ میں یہ بہتری اور ایک مثبت پیش رفت ہے۔ لیکن اس مثبت پیش رفت میں ضروری احتیاط نہیں برتی گئی اور جو تجاویز دی گئی ہیں، میری نگاہ میں ان میں نقصانات اور خطرات زیادہ ہیں اور فوائد کم ہیں۔

جناب والا! تیسری بات یہ کہ اس ترمیم میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ ۱۸ویں ترمیم کے باوجود الیکشن کمیشن کے بارے میں جو کمزوریاں تھیں ان کو دور کیا جائے تاکہ الیکشن کمیشن مضبوط ہو سکے اور وہ غیر جانبدار اور شفاف انتخابات کا اہتمام کر سکے۔ یہ تین تبدیلیاں اس میں کی گئی ہیں۔ میں ان میں سے نمبر دو کی اصولاً تائید کرتا ہوں۔ نمبر تین کو بہت بڑا اور مثبت اقدام سمجھتا ہوں لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایوان جلد بازی میں کوئی ایسی مثال قائم نہ کرے جو آئندہ لوگوں کے لیے خطرات کا باعث ہو۔

مجھے خوشی ہے کہ وزیر اعظم تشریف لائے ہیں اور میں چاہوں گا کہ وہ میری ان باتوں پر اچھی طرح غور فرمائیں۔ جناب والا! میرا پہلا نکتہ یہ ہے کہ ۱۸ویں ترمیم جو اپریل ۲۰۱۰ء میں نافذ ہو گئی تھی حکومت نے اس کی روشنی میں فوری طور پر الیکشن کمیشن کی تشکیل نو نہیں کی، جس کے نتیجے کے طور پر الیکشن کمیشن نے دستوری تقاضے پورے کیے بغیر ۲۸ افراد کے انتخابات کروائے۔ جب یہ معاملہ عدالت میں آیا تو عدالت نے دو باتیں بہت واضح طور پر کہیں، پہلی یہ کہ جو الیکشن ہوئے ہیں وہ قانون اور دستور کے مطابق نہیں ہیں، یعنی آئین کی خلاف ورزی ہوئی ہے اور پھر اس کے لیے انہوں نے حکومت کو موقع دیا کہ اصلاح کر لے۔

دوسری بات یہ کہ جو افراد منتخب ہوئے تھے عدالت نے ان کو معطل کر دیا۔ اب اس کمی کو پورا کرنے کے لیے یہ ترمیم لائی جا رہی ہے۔ میں اس پر یہ اصولی اعتراض کرتا ہوں کہ ہم نے پچھلے ۶۵ سالوں میں بار بار یہ روش اختیار کی کہ دستور کو پہلے توڑ دو اور اس کے بعد تلافی کر دو، یہ وہ طریقہ ہے جس کے سبب اس ملک میں آئینی روایت و حکمرانی کو فروغ دینے

میں سب سے بڑی رکاوٹ رہی۔ درحقیقت یہی وجہ ہے کہ ۳ نومبر ۲۰۰۷ء کے واقعہ (صدر جنرل پرویز مشرف کی جانب سے ہنگامی حالت کا نفاذ) کے سلسلے میں سپریم کورٹ نے فوری طور پر اور اس کے بعد اپنے تفصیلی فیصلوں میں یہ اصول طے کیا ہے کہ نظریہ ضرورت کو دفن کر دیا جائے۔ دستور کا احترام ہو اور اگر دستور کی خلاف ورزی ہوتی ہے تو اس کے نتائج کو بھگتنا جائے۔

نظریہ ضرورت کی طرف مراجعت: جناب والا! مجھے خدشہ ہے کہ ہم دوبارہ نظریہ ضرورت کی طرف جا رہے ہیں۔ ان ۲۸ افراد کو نااہل ہونا چاہیے۔ بے شک از سر نو انتخابات میں وہی جیت کر آجائیں، لیکن دستور کے تقاضے پورے کیے جائیں۔ آپ اس ترمیم کے ذریعے سے دوبارہ وہی تلافی اور عبوری آئین پر حلف کی جو منحوس روایت ہے، اسے بحال کر رہے ہیں۔ اصولی طور پر میری نگاہ میں یہ تباہ کن ہے، مجھے دکھ ہوتا ہے کہ ہمارے قانون ساز، قانون کے ضروری تقاضوں کو پورا نہیں کرتے۔

آپ بلاشبہ ایک ترمیم لائے ہیں، لیکن میری نگاہ میں وہ ترمیم اس ضرورت کو پورا نہیں کرتی، جسے آپ پورا کرنے کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ یہ بل آج سینیٹ میں آرہا ہے اور سینیٹ کی منظوری کے بعد صدر صاحب اس کی منظوری دے دیتے ہیں جو انہیں دینی چاہیے تو یہ فوری طور پر نافذ العمل ہو جائے گا۔ نفاذ کے معنی یہ ہیں کہ اس کا نفاذ اس تاریخ سے ہو گا، جس تاریخ سے اس کو منظوری ملے گی، یہ مؤثر بہ ماضی نہیں ہو سکتا اور آپ نے جس غیر قانونی، غیر دستوری عمل کو تحفظ دینے کی کوشش کی ہے وہ قانون کی زبان میں مستقبل کے لیے تو شاید جائز ہو، لیکن ماضی سے معتبر نہیں ہو سکے گا۔ ایسے میں اگر کوئی بھی شخص عدالت میں چلا جائے اور دوبارہ چیلنج کرے تو عدالت یہ کہنے کے لیے مجبور ہو گی کہ آپ نے جو ترمیم کی ہے وہ ترمیم دستوری ضرورت کو پورا نہیں کرتی۔ میں آپ کو پڑھ کر سناتا ہوں، اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

(ترجمہ): بشرطیکہ اس وقت تک، جب تک آئین کے (۱۸ویں ترمیم) ایکٹ

۲۰۱۰ء کے تحت آرٹیکل ۲۱۸ کی شق (۲) کے پیراگراف (بی) کے مطابق کمیشن کے ممبران مقرر ہوں اور اپنا دفتر سنبھالیں، کمشنر اس آرٹیکل کے پیراگراف (اے)، (بی) اور (سی) میں درج شدہ فرائض انجام دیں گے"۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ مؤثر بہ ماضی کا جواز نہیں ہے، اگر مؤثر بہ ماضی ہوتا تو آپ کو یہ کہنا چاہیے تھا کہ:

The Commissioner would be deemed to have been

(کمشنر سمجھا جائے گا)

لیکن آپ نے یہ نہیں کہا، اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ یہ ماضی پر نافذ العمل نہیں ہو سکتا۔ عدالت میں جا کر ان ۲۸ افراد کا مستقبل اسی طرح معلق رہے گا جو اس سے پہلے تھا تو میری نگاہ میں نمبر ایک، تلافی کا راستہ اختیار نہ کیجیے اور نمبر دو، جو راستہ آپ نے اختیار کیا ہے وہ بڑا بھونڈا ہے، قانونی اعتبار سے نقص زدہ ہے اور آپ کا اس سے اپنا مقصد حاصل نہیں ہوتا۔

نگراں حکومت کا تقرر: جناب والا! دوسری بات میں عبوری حکومت کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں۔ یہ بات ریکارڈ پر آنی چاہیے کہ وزیراعظم اور قائد حزب اختلاف میں مشاورت کا جو لفظ دستور میں استعمال ہوا ہے اس کی تشریح سپریم کورٹ نے واضح الفاظ میں کی ہے۔ اس کے مطابق مشاورت کو بامعنی، بامقصد اور متفقہ ہونا چاہیے۔ اس کے بعد پھر ایک ہی راستہ تھا کہ وزیراعظم اور قائد حزب اختلاف میں اتفاق رائے ہو دونوں مل کر یہ بات کریں۔ اگر اس پر عمل کر لیتے تو کسی بے قاعدگی کی کوئی ضرورت نہیں تھی، لیکن آپ نے مشاورت کے معنی کو الٹ دیا جس کے نتیجے کے طور پر مسئلہ پیدا ہو گیا۔

اب آپ راستہ یہ اختیار کر رہے ہیں کہ اگر وزیراعظم اور قائد حزب اختلاف میں اتفاق رائے پیدا نہ ہو تو وہ دو، دو نام ایک کمیٹی کو دیں گے لیکن جناب چیئرمین! میں آپ کی

توجہ مبذول کراؤں گا کہ اس کمیٹی کو بڑا ہی مبہم رکھا گیا ہے۔ اس لیے کہ اس سے پہلے دستور میں خواہ جج کا تقرر ہو یا الیکشن کمیشن کا تقرر ہو، بہت وضاحت سے اصول طے کر دیے گئے ہیں کہ پارلیمنٹ کی ایک ایسی کمیٹی ہو گی جس میں دو تہائی افراد اسمبلی سے اور ایک تہائی سینیٹ سے ہوں گے۔ اپوزیشن اور حکومت کو مساوی حیثیت حاصل ہو گی اور اس کے فیصلے تین چوتھائی اکثریت سے ہوں گے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو آپ نے اس سے پہلے طے کی ہیں اور اسی پر عمل کیا جانا چاہیے تھا۔

جناب! یہاں مجوزہ ترمیم میں آپ یہ کہہ رہے ہیں:

(ترجمہ):"اگر برخواست ہونے والی قومی اسمبلی میں وزیر اعظم اور قائد حزب اختلاف قومی اسمبلی کی تحلیل کے تین دن کے اندر کسی بھی شخص کو نگران وزیر اعظم کے طور پر مقرر کرنے پر متفق نہیں ہوں گے تو وہ دو، دو نامزد امیدواروں کے نام ایک کمیٹی کے پاس بھیج دیں گے یہ کمیٹی قومی اسمبلی کے اسپیکر فوری طور پر تشکیل دیں گے جو سبکدوش ہونے والی قومی اسمبلی یا سینیٹ کے آٹھ ممبران پر مشتمل ہو گی"۔

اب یہ بڑا ہی مبہم معاملہ ہے کہ کتنے اراکین قومی اسمبلی سے لیے جائیں گے، کتنے سینیٹ سے لیے جائیں گے، یہاں پر 'یا' کا استعمال ہوا ہے جس کے معنی یہ بھی لیے جاسکتے ہیں کہ سارے کے سارے اسمبلی سے لیے جائیں۔ حالانکہ پوزیشن یہ ہے کہ جب اسمبلی تحلیل ہو گئی تو پرائم منسٹر اور سپیکر تو رہیں گے لیکن ممبرز باقی نہیں رہتے ہیں اور قائد حزب اختلاف کی حیثیت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ یہ واضح ہونا چاہیے کہ کس ایوان میں سے کتنے ممبر ہوں گے لیکن آپ نے اسے غیر واضح چھوڑا ہے۔ یہ سب مل کر فیصلہ کیسے کریں گے اس کو بھی آپ نے غیر واضح چھوڑا ہے۔

اس کے بعد تیسری بات آپ نے کی ہے کہ اگر یہ کمیٹی بھی طے نہ کر سکے تو آپ نے

اس کیس کو الیکشن کمیشن کے حوالے کیا ہے۔ میں واضح کرنا چاہتا ہوں کہ یہ الیکشن کمیشن کا کام نہیں ہے۔ دستور کے تحت الیکشن کمیشن کا صرف ایک کام ہے اور وہ انتخابات کرانا ہے، عام انتخابات بھی اور ضمنی انتخابات بھی۔ یہ اس کا کام ہے ہی نہیں کہ وہ نگراں وزیر اعظم کو اس فہرست میں سے نامزد کرے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ اپنی حدود کار، کردار اور دستوری پوزیشن سے ہٹ جاتا ہے۔

یہ بات بھی محل نظر ہے کہ الیکشن کمیشن کا کام شفاف الیکشن کرانا ہے، نگراں حکومت اور الیکشن کمیشن، اگر ان میں تصادم ہوتا ہے تو آپ کے انتخابات عوام کے اعتماد سے محروم رہیں گے۔ پھر اگر آپ صوبوں کے مسئلے کو لیں تو وہاں اور بھی مشکل ہے کہ اگر صوبے میں قائد حزب اختلاف موجود نہیں ہے، جیسے اس وقت بلوچستان کی صورت ہے کہ وہاں کوئی حزب اختلاف نہیں ہے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ان حالات میں برسر اقتدار حکومت اپنے مقصد کے نگراں بنائے گی اور اس طرح شفاف انتخابات کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ اس لیے میں صاف الفاظ میں کہنا چاہتا ہوں کہ یہ طریقہ بہت سے خدشات اور مضمرات سے بھرا ہوا ہے، یہ اختیار نہ کیجیے۔ میری نگاہ میں دو ہی راستے ہیں کہ یا تو پارلیمنٹ کے اندر ہی فیصلہ کر لیجیے، اس صورت حال میں پارلیمانی کمیٹی کو آخری اختیار دیجیے کہ وہ طے کر دے، ور نہ زیادہ بہتر یہ ہے کہ عدلیہ کو بھیجا جائے کہ چیف جسٹس چار سینئر ترین ججوں کی مشاورت سے، چار ناموں میں سے کسی ایک نام کو طے کر دے، لیکن الیکشن کمیشن کو اس میں شامل کرنا میری نگاہ میں نہایت نقصان دہ ہے۔

اس لیے جناب چیئر مین ! میں آپ کے توسط سے حکومت سے اپیل کروں گا کہ دستور کے معاملات کو سہل انگاری سے نہ لیا جائے، اس کے سارے مضمرات کو سامنے رکھا جائے اور وہ راستہ اختیار کیا جائے جس سے فی الحقیقت انتخابات بھی شفاف ہو سکیں اور غیر جانبدار نگراں حکومت بھی وجود میں آسکے اور وہ مفوّضہ فرائض ادا کر سکے۔

اس کے ساتھ ہی میں یہ بات کہوں گا کہ جہاں تک الیکشن کمیشن کے اراکین کی مدت

کا تعلق ہے یا ان کے تقرر، رتبہ اور حلف یا سبکدوشی کا معاملہ ہے، ان تمام پر مجھے پورا اتفاق ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اس بل کا بڑا ہی مثبت پہلو ہے لیکن اس کی یہ قیمت آپ ہم سے نہ لیں کہ ایک طرف آپ نظریہ ضرورت کے مردے کو قبر سے نکال کر ایک بار پھر ہمارے اوپر مسلط کریں اور دوسری جانب یہ کوشش کریں کہ پارلیمنٹ کے فیصلے پارلیمنٹ میں نہ ہوں، یہاں اتفاق رائے نہ ہو اور الیکشن کمیشن کو اس میں شامل کیا جائے جو اس کے دائرہ کار کو ان حدود میں لے جانے کے مترادف ہے جس کا وہ نہ اہل ہے اور نہ اس کے بعد پھر وہ اپنے فرائض منصبی ادا کر سکے گا۔

اس تناظر میں جلدی نہ کریں، میں نے اس میں ترامیم پیش کی ہیں، ان پر غور کریں اور کوشش کریں کہ ہم اس بل کو ایک ایسی شکل دے دیں کہ جو مشکل ہے اس سے نکلا جاسکے۔ لیکن اگر وہ مشکل نہ صرف یہ کہ باقی رہے بلکہ اور مشکلات پیدا ہو جائیں، تو یہ راستہ اختیار کرنا میری نگاہ میں بڑا خطرناک اور خسارے کا سودا ہے۔ میری خواہش ہو گی کہ یہ ایوان پارٹی وفاداریوں سے بالا ہو کر دلیل کی بنیاد پر دستور میں ترمیم کے معاملات پر غور کرے، یہ وقت کا تقاضا ہے۔ اگر ہم نے یہ مثال قائم کی تو اس پارلیمنٹ کی عزت بڑھے گی اور اگر ہم نے یہ مثال قائم نہ کی تو مجھے ڈر ہے کہ اس طرح پارلیمنٹ کی بے توقیری ہو گی اور میں چاہتا ہوں کہ ہم اس سے بچیں۔

آرٹیکل ۲۱۹ میں ترمیم

جناب چیئرمین! میں آپ کی، اس ایوان کی اور خصوصاً وزیر اعظم کی توجہ آرٹیکل ۲۱۹ میں جو تبدیلی کی گئی ہے، اس کی طرف مبذول کراؤں گا۔ دستوری ترمیم کا اصول یہ ہوتا ہے کہ اس کے ایک ایک لفظ حتّٰی کہ فل اسٹاپ، کومہ، ایک ایک چیز کو احتیاط سے کیا جاتا ہے۔ کیونکہ سب ہی جانتے ہیں کہ ایک کومہ کے فرق سے معنی میں زمین و آسمان کا فرق پڑ جاتا ہے لیکن یہاں غیر ذمہ داری اور سہل انگاری کا یہ حال ہے کہ ۲۱۹ کا جو اصل عنوان تھا،

کمشنر کے فرائض، آپ نے تمام متن میں تبدیلی کی ہے اور یہ متن شروع ہوتا ہے کہ:

The Commission shall be charged with the duty of so and so

یوں یہ متن سارے کمیشن کے بارے میں ہے لیکن اس کے عنوان میں وہی کمشنر کے فرائض لکھا ہوا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ جو اختیارات آپ نے کمشنر سے واپس لیے ہیں، عنوان میں آپ نے ساری بات کمشنر کے لیے چھوڑ دی۔ چنانچہ میں نے اس لیے تجویز کیا ہے کہ اس میں کمشنر کے لفظ کو کمیشن سے تبدیل کیا جائے اس طرح کم از کم یکساں ہو جائے گا اور مسودہ دستوری زبان کے مطابق ہو گا۔ اس لیے یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے لیکن بہر حال قانون کے اعتبار سے یہ ایک اہم نکتہ ہے کہ مسودہ نگار نے اور وزارت قانون اور قومی اسمبلی نے اس چھوٹی سی بات کو بھی نوٹ نہیں کیا اور متن تبدیل کر دیا، لیکن عنوان تبدیل نہیں کیا جو نئے متن کے ساتھ بے جوڑ ہے۔ اس لیے میں درخواست کروں گا کہ انا کا مسئلہ نہ بنائیں بلکہ دستور کا مسودہ، دستور کی صورت، دستور کے الفاظ، دستور کے عنوانات، سب صحیح ہونے چاہییں۔ اس لیے یہ تصحیح آپ قبول کریں۔ (۲۰ فروری ۲۰۱۲ء)

عبوری حکومت کی تشکیل اور الیکشن کمیشن کے اختیارات

جناب چیئرمین! میری سب سے اہم ترمیم یہی ہے، میں اس کے ذریعے سے اس میں بنیادی تبدیلی چاہ رہا ہوں، میں نے پورے ۲۲۴۔(اے) پیراگراف کو بدل دیا ہے میرے بنیادی طور پر دو ہی نکات ہیں۔ میرا اس پر پہلا اعتراض ہے کہ جو پارلیمانی کمیٹی بنائی گئی ہے بلکہ جو کمیٹی بنائی گئی ہے، وہ کمیٹی بے حد مشکوک ہے۔ یہ تو کہہ دیا گیا ہے کہ آٹھ افراد ہوں گے لیکن کون سے آٹھ افراد؟ قومی اسمبلی یا سینیٹ یا دونوں کے فارغ ہونے والے اراکین۔ اس میں اسپیکر کو غیر معمولی صوابدید دی گئی ہے۔ میری نگاہ میں اتنی صوابدید دینا غلط ہے۔ دوسری جانب ایک اور اہم نکتہ یہ ہے کہ جب اسمبلیاں تحلیل ہو گئیں تو تحلیل ہونے کے بعد تحلیل شدہ اسمبلی کے اراکین کو یہ اختیار دینا، میری نگاہ میں سیاسی و اخلاقی طور

پر درست نہیں ہے۔ یہ اختیار ان کے پاس ہونا چاہیے جو اپنے آپ کو آزاد رکھتے ہیں اور اپنا کوئی آئینی وجود رکھتے ہیں۔ اس معاملے کو میری نگاہ میں دستور میں ۱۸ویں ترمیم نے بڑی خوبصورتی سے طے کر دیا تھا، اس لیے آپ وہاں دیکھیے کہ آرٹیکل ۱۷۵۔(اے) جو ۱۸ویں ترمیم کا بڑا معرکتہ الارا اور اصل کارنامہ ہے۔ اس میں یہ بات واضح کر دی گئی ہے:

میں چاہوں گا آپ اس لفظ پر خاص طور پر غور کریں کہ ایک مثال دستور میں پہلے ہی موجود ہے کہ:

(ترجمہ):بشرطیکہ جب قومی اسمبلی تحلیل ہو جائے تو پارلیمانی کمیٹی کے تمام ارکان صرف سینیٹ کے ممبروں پر مشتمل ہونگے۔ پیرا گراف (۱) میں مذکور ہے اور مذکورہ آرٹیکل کا اطلاق ہو گا۔

ہم نے ایک اصول بھی طے کر دیا ہے کہ جب اسمبلی تحلیل ہو تو سینیٹ ایک مستقل اور ناقابل تحلیل ادارہ ہے، اسے پارلیمنٹ کے اختیارات حاصل ہیں، اس صورت میں یہ کمیٹی سینیٹ سے بننی چاہیے۔ اس صورت میں یہ آٹھ لوگ کون ہوں۔ اس میں مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہے اور یہ بات بالکل ٹھیک ہے کہ ۴۔ افراد حکمراں پارٹی سے اور ۴ افراد اپوزیشن سے لیں۔ اس طرح سینیٹ کے ۸ افراد کی کمیٹی یہ طے کر سکتی تھی۔ میری نگاہ میں یہ فیصلہ کن نکتہ ہو سکتا ہے کہ اس کمیٹی کا فیصلہ حتمی ہو اور یہ اکثریت رائے سے طے کر لیں۔ اس لیے کہ میرے علم میں دنیا کے کسی دستور میں یہ بات نہیں ہے کہ نگراں حکومت کو بنانے کے لیے اگر قائد ایوان اور قائد حزب اختلاف میں اختلاف ہو تو جو سابقہ اراکین ہیں ان کو اختیار دیا جائے۔ پھر یہاں تو یہ بھی واضح نہیں ہے کہ کتنے سابق اراکین اسمبلی سے ہوں گے اور کتنے سینیٹ سے ہوں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ سینیٹ سے صرف ایک لیں اور اسمبلی سے سات لیں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ سینیٹ سے ایک بھی نہ لیں۔ میری نگاہ میں یہ ایک بہت ہی مبہم چیز ہے، اس صوابدیدی اختیار سے غلط روایات قائم ہوں گی اور بدعنوانی کے امکانات زیادہ ہوں گے۔

دوسرا پہلو یہ تھا کہ اگر جیسا کہ اس دفعہ میں ہے کہ یہ کمیٹی طے نہ کر سکے تو پھر ایک تیسری لائن بھی آپ نے بنانی ہے۔ میں میاں رضا ربانی کا ممنون ہوں کہ انہوں نے اس کے لیے بڑا صحیح قانونی لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ 'آخری تدبیر' ہے 'آخری تدبیر' کو سابقہ لائن پر بالادستی ہو گی۔ آپ کا یہ کہنا غلط ہے کہ ہم نے پارلیمنٹ کے اختیارات کو ختم نہیں کیا۔ آپ نے کیا ہے اور آپ نے ایک غیر منتخب وجود الیکشن کمیشن کو جو بالکل ایک دوسرے مقصد کے لیے قائم کیا گیا ہے، یعنی انتخابات کی فہرستیں بنانا، جو وہ نہیں بنا سکا۔ انتخابات قانون کے مطابق کرانا، جو وہ نہیں کرا سکا، آپ اس کو یہ کام سونپ رہے ہیں، یہ ماورائے پارلیمان ہے۔ میری نگاہ میں معاملات کو پارلیمنٹ کی کمیٹی میں طے ہو جانا چاہیے۔

چیف جسٹس کے بارے میں افراد کی ذاتی آراء مختلف ہو سکتی ہیں، ہم اداروں کی بات کر رہے ہیں، افراد کی نہیں اور ایسے معاملات میں جہاں تک میرے علم میں ہے کہ جہاں کہیں بھی کوئی ایسا مسئلہ آتا ہے تو وہاں پھر آخری دروازہ سپریم کورٹ ہے، وہ دستوری قوت ہے، وہ کوئی 'کانگرو کورٹ' نہیں ہے، اس لیے اس کی عزت و مقام اور ایسے معاملات میں آخری تدبیر کا ادارہ الیکشن کمیشن نہیں بلکہ سپریم کورٹ ہے۔ جیسا کہ انڈیا میں بھی ہے کہ چیف جسٹس سینئر ججوں کی مشاورت سے ایسے امور میں فیصلہ کا ذمہ دار بنایا گیا ہے۔ مشاورت کے لیے کہیں، کہیں تین اور کہیں چار کی تعداد متعین کی گئی ہے۔

میں نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ اگر یہ کرنا ہی ہے تو پھر چیف جسٹس آف پاکستان سپریم کورٹ کے چار سینئر ترین ججوں کی مشاورت اور صوبوں کی صورت میں چیف جسٹس آف ہائی کورٹ، ہائی کورٹ کے تین سینئر ترین ججوں کی مشاورت سے اس بات کو طے کریں۔ بلا شبہ وہ ان چار ناموں میں سے ہی طے کریں گے جو قائد ایوان اور قائد حزب اختلاف نے دیئے ہیں۔ یہ ایک قابل عمل متبادل ہے اور اگر کسی چیز کو آپ 'آخری تدبیر' بنانا چاہتے ہیں، جس کی ضرورت پیدا ہو سکتی ہے تو خدا کے لیے وہ ایک ایسے ادارے کو نہ بنائیں جو عدالتی کام نہیں کر رہا ہے۔ یہ ایک منصفانہ، غیر جانبدارانہ اور عادلانہ فیصلہ ہونا چاہیے۔

الیکشن کمیشن تو الیکشن میں مصروف ہے، اگر اسی کو آپ یہ اختیار دے دیتے ہیں کہ وہ نگراں وزیر اعظم بنائے تو میری نگاہ میں اس میں بڑے خطرات ہیں۔

متبادل تجاویز: جناب والا! اس پس منظر میں اپنی متبادل تجاویز دے رہا ہوں۔ میں پڑھ کر سنا دوں کہ:

(ترجمہ): میں موجودہ ۲۲۴(الف) کو دوسرے کے ساتھ کس طرح بدلنا چاہتا ہوں، میں پڑھ رہا ہوں۔

۱۔ کمیٹی یا جوڈیشل کمیٹی کے ذریعے قرار داد (۱) قومی اسمبلی تحلیل ہونے کے تین دن کے اندر اگر سبکدوش ہونے والی قومی اسمبلی کے وزیر اعظم اور قائد حزب اختلاف کسی بھی فرد کی بطور نگراں وزیر اعظم تقرری پر اتفاق نہیں کرتے تو وہ دونوں قومی اسمبلی کے اسپیکر کے ذریعے سینیٹ چیئرمین کی مشاورت سے فوری طور پر تشکیل دی گئی کمیٹی کو دو، دو نام نگراں وزیر اعظم کے چناؤ کے لیے بھیجیں گے۔ یہ کمیٹی سینیٹ کے آٹھ ممبران پر مشتمل ہو گی۔ جس میں حزب اختلاف اور سرکاری بنچوں کی مساوی نمائندگی ہو گی۔ ان ممبران کو قائد ایوان اور قائد حزب اختلاف نامزد کریں گے۔

۲۔ کلاز (۱) کے تحت قائم ہونے والی کمیٹی معاملہ کی حوالگی کے تین دن کے اندر نگراں وزیر اعظم کے نام کو حتمی شکل دے گی۔

اگر یہ کمیٹی متعینہ دنوں کے اندر فیصلہ نہیں کر پائے تو نامزدگیاں چیف جسٹس آف پاکستان کو حتمی فیصلے کے لیے بھیج دی جائیں گی جو سپریم کورٹ کے چار سینئر ترین ججوں سے مشاورت کے بعد دو دن کے اندر فیصلہ کرے گا۔

۳۔ اگر سبکدوش ہونے والی صوبائی اسمبلی کے وزیر اعلیٰ اور قائد حزب اختلاف

اسمبلی تحلیل ہونے کے تین دن کے اندر کسی ایک فرد کو نگراں وزیر اعلیٰ مقرر کرنے پر متفق نہیں ہوتے تو وہ دونوں صوبے کے ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کو دو، دو نام ارسال کریں گے جو صوبائی ہائی کورٹ کے تین سینئر ترین ججوں سے مشاورت کے بعد دو دن کے اندر نگراں وزیر اعلیٰ کی تقرری کے لیے نام کا حتمی فیصلہ کرے گا۔

۴۔ موجودہ وزیر اعظم اور وزیر اعلیٰ اس وقت تک اپنے عہدے پر فائز رہیں گے جب تک نگراں وزیر اعظم اور نگراں وزیر اعلیٰ (جو بھی صورت ہو) کا تقرر نہیں ہو جاتا۔

جناب والا! آپ نے ایک فرق دیکھا ہو گا کہ مرکزی اسمبلی کے لیے تو میں نے سینیٹ کی پارلیمانی کمیٹی رکھی، صوبوں میں نہیں رکھی ہے، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اگر اپوزیشن کی مساوی نمائندگی نہ ہو تو پھر یہ ایک کھوٹ ہی رہ جاتی ہے۔

اب میں آپ کے سامنے بلوچستان کا مسئلہ رکھتا ہوں وہاں پر غالباً ۶۴، ۶۵۔ اراکین میں سے ۶۲ یا ۶۳ وزیر ہیں، ایک سپیکر اور ایک ڈپٹی سپیکر ہے اور ایک رکن اسمبلی کا نام اپوزیشن میں آتا ہے، وہاں آپ ایسی کمیٹی کیسے بنائیں گے۔ سندھ ہمارا بڑا صوبہ ہے، تعداد میں بھی بڑا ہے لیکن ہمیں نظر آرہا ہے کہ وہاں پر قائد حزب اختلاف موجود نہیں ہے اور آپ نے خود اسی بنا پر یہ رکھا ہے کہ اگر کہیں اپوزیشن میں تین یا چار افراد نہ ہوں تو جو بھی ہو گا وہ ممبر بن جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ یہ معاملات کو طے کرنے کے لیے بڑا ہی روا روی کا طریقہ ہے۔ اس لیے صوبہ کی صورت میں درخواست کرتا ہوں کہ اگر اتفاق رائے نہیں ہوتا تو پھر چیف جسٹس آف ہائی کوٹ، ہائیکورٹ کے تین سینئر ترین ججوں کی مشاورت سے اس کو طے کریں گے۔

جناب والا! بلاشبہ یہ حفاظتی راستہ ہم نے رکھا ہے آپ نے بھی رکھا ہے، میں نے بھی

رکھا ہے لیکن مجھے توقع ہے کہ اس حفاظتی راستہ کی وجہ سے وزیر اعظم اور قائد حزب اختلاف اور چیف منسٹر اور قائد حزب اختلاف اتفاق رائے پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اس لیے کہ انہیں یہ پتا ہے کہ اگر وہ اتفاق نہیں کرتے تو یہ چیز کہاں جارہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک سدراہ بھی ہو گا۔ ٹھیک ہے اگر یہ بحران سے باہر نکلنے کا راستہ بنتا ہے تو یہ ایک بچت کا راستہ ہے لیکن یہ بحران سے بچنے کا ایک بڑا مؤثر ذریعہ بھی ہو گا وزیر اعظم اور قائد حزب اختلاف دونوں کے سامنے یہ بات ہو گی کہ اگر ہم نے اتفاق نہیں کیا تو دونوں کو عدالت تک جانا ہو گا۔

جناب والا! یہ بڑی اہم ترمیم ہے اور اگر آپ اس ایک چیز کو ٹھیک کر لیں۔ تو پھر میری نگاہ میں آپ کی جو ۲۰ ویں ترمیم ہے، یہ میرے لیے بھی اور میری طرح سوچنے والوں کے لیے بھی قابل قبول ہو جائے گی، ورنہ ہم دکھ اور افسوس کے ساتھ آخری وقت تک اس کی مخالفت کریں گے۔

میں میاں رضا ربانی کا بڑا ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے کسی مشکل میں نہیں ڈالا۔ میں اپنی اس ترمیم کے حشر سے خائف نہیں۔ میں نے جانتے ہوئے اس کو پیش کیا ہے، لیکن قبل اس کے کہ آپ اس پر ووٹ لیں میں دو تین باتیں ضرور عرض کروں گا۔ پہلی بات یہ ہے کہ یہ کہا گیا ہے کہ یہ ترمیم کے دائرہ سے باہر ہے۔ میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ پھر ترمیم کا مقصد کیا ہے؟ اس کلاز کا اصل مقصد یہ ہے کہ نگراں حکومت بنانے کا ایک طریقہ طے کیا جائے۔ اصل تجویز میں سہ پہلوی طریقہ دیا گیا ہے، میں نے اسی ڈھانچے کو سامنے رکھتے ہوئے اسی میں ترمیم کے ذریعے ایک تین مرحلوں کا طریقہ پیش کیا ہے۔ یہ ہر اعتبار سے، فنی طور پر ایک ترمیم ہے اور یہ کہنا کہ یہ ترمیم کے دائرہ سے دور چلی گئی ہے میری نگاہ میں قانونی اور ادبی اعتبار سے صحیح نہیں۔

دوسری بڑی عجیب بات پارلیمنٹری کمیٹی کے بارے میں کہی گئی ہے۔ جناب چیئرمین! پارلیمنٹ کے ممبر اس وقت تک پارلیمنٹ کے ممبر ہیں جب تک کہ پارلیمنٹ تحلیل نہیں

ہوتی۔ جس لمحے میں پارلیمنٹ تحلیل ہو جاتی ہے اراکین اسمبلی کی حیثیت عام شہری کی ہو گی۔ ان کا کوئی پارلیمانی کردار باقی نہیں رہتا۔ آپ ان افراد کو جو اب پارلیمنٹ کے اراکین نہیں ہیں، یہ اختیار دے رہے ہیں کہ وہ مستقبل کی نگراں حکومت بنائیں۔ نگراں حکومت بنانا تحلیل شدہ اسمبلی کے ارکان کا کام نہیں ہے۔ ان کو اس کے اندر شامل کرنا میری نگاہ میں ایک بااثر عامل کو ایک پارلیمانی عمل پر مسلط کرنا ہے۔

اس کی جگہ میں یہ بات کہہ رہا ہوں کہ پارلیمنٹ کے دو حصے ہیں، ایک قومی اسمبلی اور دوسرا سینیٹ۔ دونوں میں سے سینیٹ موجود ہے، ٹھیک ہے وہ بالواسطہ منتخب ہے لیکن صوبائی اسمبلیاں براہ راست منتخب ہیں جنہوں نے اس کو منتخب کیا۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ نامزد ہیں۔ یہ پارلیمنٹ کا حصہ ہیں۔ جب یہ پارلیمانی عمل موجود ہے تو یہ کہنا کہ ہم فارغ ہونے والے اراکین کی کمیٹی بنائیں گے سمجھ سے بالاتر ہے۔ آپ اس کو پارلیمانی کمیٹی اس لیے نہیں کہہ رہے کہ اب ان کا کوئی تعلق پارلیمنٹ سے نہیں لیکن اس کے باوجود آپ ان کو ایک ایسے فیصلے میں شریک کر رہے ہیں جس کا مستقبل کی پارلیمنٹ اور الیکشن پر ایک بہت بڑا اثر پڑنے والا ہے۔

صوبوں میں اسی لیے میں نے یہ دوسرا مرحلہ نہیں رکھا کہ وہاں کوئی دوسرا مرحلہ نہیں ہے۔ اسمبلی تحلیل ہونے کے بعد وہاں کوئی منتخب یا اسمبلی کا ایسا عضو موجود نہیں تھا جسے یہ کام سونپا جا سکے۔ پھر میں نے آپ کے سامنے آئین کی ۱۷۵۔(اے) جو دفعہ ہے، اسے پیش کیا ہے کہ بعینیہ ایسی ہی صورت حال میں ہم نے یہ راستہ اختیار کیا ہے کہ اگر اسمبلی تحلیل ہو تو جو غیر تحلیل شدہ ایوان [سینیٹ] ہے کمیٹی اس ایوان کے اراکین پر مشتمل ہو گی، میں تو پارلیمنٹ کی بالادستی اور پارلیمنٹ کے معاملات کو پارلیمنٹ میں رکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ آپ پارلیمنٹ کے معاملات کو ایسے افراد کے سپرد کر رہے ہیں جو پارلیمنٹ کے اراکین رہے ضرور ہیں لیکن جس وقت ان کو کمیٹی میں لایا جا رہا ہے اس وقت ان کی کوئی ذمہ داری نہیں اور وہ کسی حلف کے تحت نہیں ہیں۔ جبکہ سینیٹ کا ہر ممبر حلف کے تحت ہے کہ وہ دستور

کا پابند ہو گا۔ جب آپ قومی اسمبلی کے رکن نہیں رہے تو آپ حلف سے باہر آ گئے اب آپ ایک عام شہری ہیں۔ ایک ایسے فیصلے کو جسے پارلیمنٹ میں ہونا چاہیے۔ گلی محلے میں لے جا رہے ہیں اس لیے میں چاہوں گا کہ اس پر آپ ذرا ٹھنڈے دل سے غور کریں، جذباتی انداز میں غور نہ کریں۔

تیسری بات وہ ہے جس کی میں میاں رضا ربانی جیسے قانون کے ماہر رفیق کار سے توقع نہیں رکھتا تھا کہ یہ کوئی عدالتی مسئلہ نہیں ہے۔ عدالتی مسئلہ کیا ہے؟ چار ناموں میں کسی ایک نام کو طے کرنا۔ بلاشبہ یہ کوئی عدالتی مسئلہ نہیں ہے لیکن چونکہ ایک گرہ پڑ گئی ہے، راستہ نکل نہیں رہا، اس لیے جو اعلیٰ ترین عدالت آپ کے پاس موجود ہے، جن کی فراست اور راستی پر ہم اعتماد کرتے ہیں، اسے ہم یہ اختیار دے رہے ہیں۔ مقصد بھی یہ ہے کہ ایک غیر جانبدار، منصفانہ نگراں وزیر اعظم یا وزیر اعلیٰ وجود میں آ جائے۔ ان صورتوں میں فیصلہ آپ گلیوں سے طے کروائیں گے یا آپ ایک اعلیٰ ترین عدالتی کمیٹی سے کروائیں گے؟ جو بات میری سمجھ میں نہیں آئی وہ عجیب و غریب بات ہے کہ ایک طرف آپ یہ کہتے ہیں کہ اگر سپریم کورٹ کا چیف جسٹس ان چار میں سے کسی ایک کا انتخاب کرتا ہے تو وہ اس کا نامزد ہو گیا اور نامزد بھی ایسا کہ اگر وہ قانون کی کوئی خلاف ورزی کرے تو پھر اس کو وہ زیر غور نہیں لا سکتے۔ میں پوچھتا ہوں کہ پرائم منسٹر اپنے نامزد کو مقرر کرتا ہے اور وہ نامزد اگر غلط رویہ اختیار کرتا ہے، دستور، قانون اور قواعد و ضوابط کو توڑتا ہے تو کیا پرائم منسٹر اس بنا پر کہ اس کا وہ نامزد تھا، اسے اس نے مقرر کیا تھا، اس کا احتساب نہیں کرے گا؟ عدلیہ ججز کو مقرر کرتی ہے لیکن آرٹیکل ۲۰۹ کے تحت وہی عدلیہ ان کا احتساب بھی کرتی ہے اور ان کو سبکدوش بھی کر سکتی ہے تو عدالتی مسائل اور چیز ہے، یہ ایک انتظامی فیصلہ، پارلیمانی کمیٹی کے کسی فیصلے پر نہ پہنچنے کی صورت میں ہم اس کو تفویض کر رہے ہیں۔

ایک اور بڑی عجیب بات کہی گئی ہے کہ کمیٹی کی ہیئت کے سلسلے میں جو اعتراضات میں نے کیے ہیں، وہ قواعد و ضوابط سے طے ہو سکتے ہیں۔ جناب والا نمبر ایک، اس ترمیم میں

کہیں یہ بات لکھی ہوئی نہیں ہے کہ جو کمیٹی بنے گی وہ اپنے قواعد وضوابط کو طے کرے گی۔ یہ کہیں لکھا ہوا نہیں ہے، کوئی اختیار نہیں ہے۔ قواعد وضوابط کمیٹی بننے کے بعد طے ہوا کرتے ہیں، پہلے نہیں۔ میرا سوال یہ ہے کہ کتنے افراد اسمبلی سے ہوں گے؟ یعنی سابقہ اراکین میں سے ہوں گے اور کتنے سینیٹ میں سے ہوں گے؟ کیا اس کا تعین کمیٹی کی تشکیل کے بعد ہو گا؟

جناب چیئرمین! یہ قواعد کا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ یہ مسئلہ تو وہ ہے جسے آپ کو یہاں طے کرنا چاہیے تھا، جسے آپ نے طے نہیں کیا اور میں آپ کی مدد کر رہا ہوں کہ آرٹیکل ۱۷۵۔(اے) کی مثال کو سامنے رکھتے ہوئے وہی طریقہ آپ یہاں استعمال کریں۔ ایک منتخب ایوان بالا موجود ہے، وہ سیاسی ادارہ ہے، پارلیمنٹ کا حصہ ہے، اس کی کمیٹی یہ کام انجام دے۔ اس لیے رولز آف بزنس کے بارے میں جو بات آپ نے کی ہے وہ ناقابل فہم ہے۔

صوبوں کے جن موروثی تضادات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، کم از کم میں اس کو سمجھنے سے قاصر ہوں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ صوبائی اسمبلیوں میں کوئی دوسرا ایوان نہیں ہے، صوبائی اسمبلیوں کے حقائق کو سامنے رکھ کر خود آپ نے اپنی ترمیم میں یہ کہا ہے کہ اگر چھ افراد وہاں سے کمیٹی میں لینے ہیں، اور تین افراد نہ ہوں، اگر ایک بھی ہے تو اس کو لیا جائے گا۔ یعنی آپ ایک راستہ نکال رہے ہیں۔ میں یہی کہنا چاہتا ہوں کہ صوبوں کے حالات موجودہ صورت میں مختلف ہیں۔ وہاں دو ایوان بھی نہیں ہیں اور وہاں اگر اپوزیشن کے اتنے اراکین نہ ہوں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ چیف منسٹر اپنی مرضی کی نگراں حکومت بنائے گا جس کے نتیجے میں الیکشن آلودہ ہوں گے، ان پر اعتماد نہیں ہو گا اور پھر آپ جمہوریت کو فروغ نہیں دے سکیں گے۔ اس لیے میری نگاہ میں میری تجاویز کے خلاف دیے گئے پانچوں دلائل بڑے کمزور اور بودے ہیں۔ ٹھیک ہے آپ کے پاس اکثریت ہے، آپ اپنی ترمیم منظور کروا سکتے ہیں لیکن یہ مسئلہ قانون اور دستور کا ہے، اسے اتنے مختصر انداز میں نمٹانا صحیح نہیں ہو گا۔ (۲۰۔ فروری ۲۰۱۲ء)

اشاریہ

آ

آبادی,۳۵,۴۰,۴۱,۱۴۵,۱۶۴
آپریشنل صدر,۱۳
آرٹیکل ۶_۵۸,۹۳,۱۰۲,۱۰۷,۱۵۴,۱۵۵,۱۷۳,۱۷۴
آزاد احتساب کمیشن,۱۶۵
آزاد قبائلی علاقے,۱۶۱
آصف علی زرداری,۱۵۱,۱۷۰
آل پاکستان ڈیموکریٹک موومنٹ,۱۴۵
آمریت سے استحکام,۱۲۰
آمریت کا راستہ,۹۳,۹۴
آئی ایس آئی (انٹر سروسز انٹیلی جنس),۱۱۳,۱۶۶
آئی ایم ایف (انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ),۳۶,۴۰,۱۵۸
آئین پاکستان,۲۷,۴۳,۷۳,۷۴
آئینی ترمیم، آٹھویں,۲۷,۲۸,۳۰,۳۲,۵۴,۷۰,۷۵,
۸۱,۹۶,۱۳۴,۱۵۱/ نویں, ۷۰/ ۱۷ویں, VIII,
VII,۴۳,۴۹,۵۰,۵۳,۵۴,۶۱,۶۲,۶۴,۶۷,۷۱,
۹۸,۹۹,۱۰۱,۱۰۸,۱۱۰,۱۱۲,۱۲۱,۱۲۲,۱۲۳,۱۲۸,
۱۳۱,۱۳۳,۱۳۴,۱۵۰,۱۵۲/ ۱۸ویں,VII,VIII,
۱۴۷,۱۵۲,۱۶۲,۱۶۳,۱۶۹,۱۷۰,۱۸۳/ ۱۹ویں,
VIII,۱۶۷,۱۶۹,۱۷۰,۱۷۲/ ۲۰ویں, VIII,
۱۷۵,۱۸۷
آرٹیکل ۲۱۹ میں ترمیم,۱۸۱
آئین کا بنیادی ڈھانچہ,۷۴
آئین کی حکمرانی سے انحراف,VII
آئین کی متفقہ فہرست,۱۵۷/ متفقہ آئین,۱۴۷
آئینی اتھارٹی, ۵۹/ آئینی استثنیٰ کا قانون, ۱۰۳/ آئینی
انحراف, ۴۹, ۵۲, ۵۳, ۵۹/ آئینی بحران, ۵۳/
دوسرا آئینی ترمیمی حکم ۲۰۰۷ء,۱۴۲

ا

اپوزیشن لیڈر,۱۵۶
اٹامک انرجی کمیشن,۷۷
اٹک,۱۰۳
اٹلی (Italy),۱۷۱
احتساب,۹,۳۲,۶۷,۱۳۷,۱۴۶,۱۸۹
اخلاق باختہ تہذیب,۳۵
ارجنٹائن (Argentina),۷۶
ارسکن مے (Erskine May),۳
ارشاد احمد حقانی,۴۰
اسپیکر (قومی اسمبلی),۱۵,۸۳,۸۷,۹۳,۱۷۹,۱۸۲,۱۸۵
استحقاق کا قانون,۳ / استحقاق کمیٹی,۲
استعماری گرفت,VI/ استعماری نظام کے شکنجے,V
اسٹیبلشمنٹ,۶۳
اسٹیٹ بینک,۴۰
اسٹیفن کوہن (Stephen Cohen),۱۲۰
اسلام آباد,۱۹,۸۵,۱۰۰,۱۴۲,۱۶۱,۱۶۲
اسلام آباد ہائی کورٹ,۱۴۲
اسلام آباد میں بلدیاتی نظام,۱۶۱
اسلام کا نظام انصاف,۱۶۲
اسلامی احکامات,۸۸
اسلامی جمہوری اتحاد (آئی جے آئی),۸
اسلامی دفعات,۸۱,۱۴۹,۱۵۹,۱۶۴

اسلامی ریاست,۶۵
اسلامی نظریاتی کونسل,۳۶,۳۸,۴۰,۷۰,۹۱,۹۹,۱۰۰,۱۰۲, ۱۵۹
اسلامی وزراء خارجہ کانفرنس،۲۱ویں,۲۲
اشرافیہ کا نظام,۱۴۵
اشرافیہ کے تعلیمی ادارے,۴۱
اطلاعات تک رسائی کا حق,۱۵۴
اعتزاز احسن,۱۴۴
افراط زر,۳۲,۴۰
اقتصادی اصلاحات,۱۱۶
اقتصادی بحران,۱۳۶
اقلیتوں کی نمائندگی,۱۶۵
اقوام متحدہ,۳۴,۱۶۵ / سلامتی کونسل,۷۴ / سویلینز پر مشتمل سلامتی کونسل,۸۷
اکبر الٰہ آبادی,۳۱
اکنامک کوارڈی نیشن کونسل,۸۴
البرٹ وین ڈائسی (Albert Venn Dicey),۶۰
الطاف گروپ (ایم کیو ایم),۳۳
الطاف گوہر,۳۲
اللہ کی حاکمیت,۶۵
المائدہ,۱۰۴
النحل,۱۰۸,۱۲۶
النساء,۱۰۴
الیکٹورل کالج,۳۷,۱۳۴
الیکشن,۱۴,۱۵,۲۴,۵۳,۵۴,۵۵,۱۱۶,۱۴۴,۱۴۵,۱۵۵, ۱۶۴, ۱۷۵, ۱۷۶, ۱۷۹, ۱۸۰, ۱۸۲, ۱۸۴, ۱۸۵, ۱۸۸,۱۹۰
الیکشن کمیشن,۱۵,۲۰,۱۴۴,۱۵۵,۱۶۴,۱۶۶,۱۷۵,۱۷۶, ۱۷۹, ۱۸۰, ۱۸۲, ۱۸۴, ۱۸۵ / الیکشن کمشنر, ۱۵۶ چیئرمین الیکشن کمیشن,۱۷۵
الہامی ہدایت,VI
امام ابو حنیفہ,۵۷
امریکہ,۱۶,۱۷,۳۷,۴۷,۷۶,۷۷,۸۰,۸۶,۹۱,۹۶,۹۷, ۱۲۳,۱۳۸,۱۴۱,۱۷۱,۱۷۳
امریکہ میں انتخابی مہم,۱۷
امریکی اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ,۹۲ / امریکی سینیٹ,۱۲۳
امریکی دستور (The American Constitution), ۸۲
امریکی کانگریس,۱۷۳
امن و امان,۱۵
انتخابی جمہوریت,۱۴۳ / انتخابی حلقہ,۱۳۹
انتخابات ۱۹۸۵ء,۵
انتظامی اختیار,۸۴
انتہا پسند گروپ,۶۳
انتہا پسندی,۳۳,۶۴,۱۶۶
انتہائی سنگین غداری,۱۰۷
انٹرپول (Interpol),۱۷۴
انڈیا,۲۰,۱۸۴
انڈیا کا دستوری قانون (Constitutional Law of India),۳,۱۶۹
انڈیپینڈنٹ (Indipendent) لندن،اخبار,۳۴
انسانی آزادی کی آفاقی اقدار,۱۰۵
انسانی تاریخ کا مطالعہ,۳۷
انسانی حقوق کی سالانہ رپورٹ,۹۲
انسداد دہشت گردی مہم,۱۱۷
انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز,VI, IX
انگلستان,۱۷۱
ایٹمی پالیسی,۳۸
ایڈورڈ بالاڈر (Edouard Balladur) وزیر اعظم,۱۲
ایڈمرل بخاری,۱۳۹
ایران,۱۱۵
ایشیائی ترقیاتی بینک,۴۰

ایگزٹ کنٹرول لسٹ,۱۷۳
ایل ایف او(لیگل فریم ورک آرڈر),۴۴,۴۵,۴۷,۵۳,
۱۳۴,۱۲۳,۹۸,۹۲,۶۹,۵۷,۵۴
ایم ایم اے(متحدہ مجلس عمل),۴۹,۵۱,۵۲,۵۳,۵۹,
۶۲,۶۳,۶۷,۶۸,۹۹,۱۱۰,۱۲۰,۱۲۲,۱۲۷,۱۳۰,
۱۳۱,۱۳۳,۱۳۴/ایم ایم اے پیکج,۵۲
ایم آئی(ملٹری انٹیلی جنس),۱۶۶
ایم کیو ایم(متحدہ قومی موومنٹ),۳۲
ایمرجنسی,۴۹,۱۳۵,۱۳۶,۱۳۷,۱۳۹,۱۴۴/ایمرجنسی
ختم کرنے کا اختیار,۱۳۵/ایمرجنسی کے اسباب,
۱۳۹/ایمرجنسی کے تحت اقدامات,۱۴۱/
ایمرجنسی کی دستاویز,۱۳۶
ایمنسٹی (Amnesty),۹۵
ایئرمارشل اصغر خان,۱۳۹

ب

بار ایسوسی ایشنز,۴۴/بار کونسلز,۴۴
بالغ رائے دہی,۱۶۴
بجلی کی قیمتیں,۱۵۸
بربریت,۳۵
برازیل (Brazil),۷۶
برطانوی پارلیمنٹ,۲۹/برطانوی ہند,۱۶۱/برطانوی
وزیراعظم,۹/برطانوی پارلیمانی نظام,۳۱
برطانیہ,۱۰,۳۷,۱۴۳,۱۶۹,۱۷۱,۱۷۲/برطانیہ کا ویسٹ
منسٹر ماڈل,۱۰
بلدیاتی انتخاب,۱۶۵
بلوچستان,۱۱,۱۳۲,۱۸۰,۱۸۶
بنگلہ دیش,۳۹,۴۰
بنیاد پرستی,۳۳
بنیادی آفاقی اقدار,۱۰۵
بنیادی حقوق,۱۴۳,۱۴۴,۱۵۴,۱۵۸,۱۵۹
بھارت,۲۸,۳۸,۳۹,۷۶,۸۰,۹۷/بھارت کا پارلیمانی
ماڈل,۱۰,۲۸
بھارتی آئین,۳۱/بھارتی سپریم کورٹ,۱۶۸,۱۶۹
بی بی سی,۳۴,۱۱۶/بی بی سی ریڈیو,۱۴۱
بے نظیر بھٹو(وزیراعظم),۵/بے نظیر حکومت,۱۸,۲۷
بیجنگ (Bejing),۳۴
بیروزگاری,۴۰,۱۵۷,۱۵۸
بیرونیس اُشا پراشر(Baroness Usha Prashar),
۱۷۲
بین الاقوامی قانون,۱۲۳
بینکنگ قوانین,۶

پ

پارلیمانی بالادستی, ۶۲, ۷۴, ۸۸, ۱۵۶, ۱۶۰/پارلیمانی
جمہوریت, ۲۰, ۶۵, ۱۴۵, ۱۶۲/پارلیمانی روایات,
۸,۱۹,۳۱,۳۲,۹۰
پارلیمانی زبان,۶۴
پارلیمانی کمیٹی برائے دستوری اصلاحات,۱۴۸
پارلیمانی کمیٹی کی سفارشات,۱۴۷
پارلیمانی نظام,۱,۸,۱۰,۲۸,۶۰,۶۲,۸۱,۸۲,۹۴,۹۵,۹۶,
۱۰۶, ۱۶۶/پارلیمانی نظام کا ڈھانچہ, ۸۱/پارلیمانی
نظام کی تشکیل,۱۵۵
پارلیمانی نظام میں ادارتی توازن,VIII
پارلیمانی وزارتی نظام,۱۵۵
پارلیمنٹ کا دائرہ کار,۶/پارلیمنٹ کے لیے استثناء,۷/
پارلیمنٹ، خود مختار ادارہ,۵۹/پارلیمنٹ کا احتساب,
۸/پارلیمنٹ کی توہین,۳/پارلیمنٹ کی جوابدہی,۸,
۲۰/پارلیمنٹ کی حاکمیت, ۶۵/پارلیمنٹ کی
سفارش, ۱۱/پارلیمنٹ کی عزت,۲۳, ۳, ۳۷, ۴۷,
۱۸۱,۵۰/پارلیمنٹ کی نگرانی,۱۵۶
پارلیمنٹس آف دی ورلڈ (Parliaments of the

World) ,۱۷۱
پارلیمنٹری پریکٹس (Parliamentary Practice) ,۳
پاک امریکہ تعاون ,VI
پاکستان اسٹڈی سنٹر پنجاب یونیورسٹی (Pakistan Study Centre, Punjab University, Lahore) ,۱۳۴
پاکستان ایکس سروس مین ایسوسی ایشن ,۱۳۸
پاکستان براڈکاسٹنگ کارپوریشن کا ترمیمی آرڈیننس ,۳۸
پاکستان بینکنگ ٹریبونل آرڈیننس ,۳۸
پاکستان میں سیاسی عدم استحکام ,VII
پاکستان پیپلز پارٹی, ۱۵, ۱۸, ۲۷, ۱۶۴, ۱۶۵/ پیپلز پارٹی کے قائد ایوان, ۱۷۳/ پیپلز پارٹی کے وزیر قانون, ۶۰/ چیئرمین پیپلز پارٹی, ۱۴۹
پاکستان کی تاریخ, ۴۰, ۱۳۵, ۱۴۰, ۱۴۱, ۱۷۰/ پاکستان کی ترقی, ۱۱۰/ پاکستان کی سلامتی, ۱۱۰
پاکستان کی معاشی امداد, ۳۶/ پاکستان کی معیشت, ۲۳
پاکستان کی وحدت, ۶۵
پاکستان کی نظریاتی اساس ,VI
پاکستان کے آئین میں ترامیم ,VII
پاکستان کے سیاسی سفر ,VII
پاکستان کے قبائلی علاقے, ۸۵
پاکستانی پارلیمنٹ, ۱۴۷, ۱۶۷/ پاکستانی پریس, ۱۴۱, ۱۴۲
پاکستانی سیاست ,VII, VIII
پاکستانی مقتدرہ, ۵۴
پاکستانی ہوائی اڈے, ۱۷۳
پالیسی ساز ادارہ, ۸۲
پالیسی سازی کا اختیار, ۱۰
پبلک اتھارٹیز, ۱۶۰
پبلک اکاؤنٹس کمیٹی, ۳۹, ۷۰, ۱۶۵
پبلک باڈیز, ۱۶۰
پبلک سروس, ۱۷, ۲۰
پبلک سیکٹر, ۱۷
پتن ڈویلپمنٹ آرگنائزیشن (Pattan Development Organization) ,۱۰۲
پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا, ۱۶۵
پروگریسو اسلام, ۳۳
پریس کی آزادی, ۱۴۵
پریکٹس اینڈ پروسیجر آف پارلیمنٹ (Practice and Procedure of Parliament) ,۳
پسندیدہ ترین قوم, ۳۸, ۳۹
پشاور ہائی کورٹ, ۱۱
پلڈاٹ (پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف لیجسلیٹو ڈویلپمنٹ اینڈ ٹرانسپیرنسی) ,۱۳۸
پنجاب اسمبلی, ۱۹, ۱۷۳
پنجاب ہائی کورٹ, ۱۱
پہلی جنگ عظیم, ۱۲۶
پولیس آرڈر میں ترمیم, ۱۳۴
پیپلز ورکس پروگرام, ۱۸

ت

تحدید و توازن, ۶۱, ۶۲
تحریک استحقاق, ۱, ۲, ۳, ۴, ۵, ۷, ۱۱
تحریک التوا, ۷
تحریک عدم اعتماد, ۱۶۴
ترقی پسند, ۳۳
ترکی (Turkey) ,۷۶, ۷۷, ۹۶, ۹۷/ ترکی کا دستور, ۷۸
تعلیم کا حق, ۱۵۴
تعلیمی بجٹ, ۴۱
تقسیم ہند کے اثاثے, ۱۵۷
تمیز الدین خان کیس, ۵۶
تھائی لینڈ (Thailand) ,۴۰
تھنک ٹینکس, ۱۴۰

تین خواندگیوں کا فلسفہ,۹۱

ٹ

ٹاسک فورس,۷۰
ٹیکنوکریٹس,۲۴
ٹیلی ویژن کی پالیسی,۳۶

ث

ثقافتی استعمار,۳۵

ج

جارجز کلیمینسیو (Georges Eugene Benjamin Clemenceau),۱۲۶
جاوید جبار,۴
جج کی اہلیت,۱۶۹
ججوں کی تقرری,۱۶۷,۱۷۰
ججوں کے حلف نامے کا حکم,۱۴۲
جدید تاریخ,۳۵
جرمنی(Germany),۲۸,۴۰,۱۷۱
جسٹس عبدالرزاق تھہیم,۱۷۰
جسٹس اجمل میاں,۳۷
جسٹس انوار الحق,۵۶
جسٹس رضا حیات ہراج,۹۰
جسٹس سجاد علی شاہ,۳۷,۱۷۰
جسٹس طارق محمود,۱۴۴
جسٹس عبدالشکور سلام,۱۳
جسٹس منیر,۵۶,۱۶۷,۱۷۰
جسٹس یعقوب علی خان,۵۶,۶۹
جغرافیائی و نظریاتی حدود,۱۰۶
جماعت اسلامی,۱۲۴,۱۵۹
جمہوری روایات,۹/ جمہوری ارتقاء,۱۳۰,۱۵۳/ جمہوری ثقافت,۱۶۶
جمہوری ملک میں پارلیمنٹ,۶
جمہوری نظام,۶۶,۶۹,۹۶,۱۰۳,۱۷۱
جمہوری و پارلیمانی عمل,۵۰
جمہوریت کا استحکام,۸۷/ جمہوریت کا بنیادی اصول,۹۷
جمہوریت کو سب سے بڑا خطرہ,۷۹/ جمہوریت کی چار سو سال کی تاریخ,۱۹
جنرل اسد درانی,۱۱۳
جنرل اسلم بیگ,۱۳۹
جنرل آصف نواز جنجوعہ کی اہلیہ,۱۷
جنرل ایوب خان,۴۶,۵۶,۸۱,۸۶,۱۱۵,۱۲۰,۱۷۰
جنرل پرویز مشرف,۴۳,۴۴,۴۹,۵۲,۵۷,۷۵,۹۹,۱۰۱,۱۰۳,۱۱۲,۱۱۶,۱۲۷,۱۲۸,۱۳۱,۱۳۲,۱۳۵,۱۳۶,۱۳۷,۱۴۷,۱۵۲,۱۷۳,۱۷۷
جنرل ضیاء الحق,۱,۵,۱۴,۷۵,۸۶,۹۶,۱۱۴,۱۱۵,۱۲۰,۱۲۴,۱۲۵,۱۴۷,۱۵۰,۱۵۱,۱۵۲
جنرل کرامویل(Oliver Cromwell),۱۴۳
جنرل کے ایم عارف,۱۱۴,۱۲۴
جنرل یحییٰ خان(سابق صدر),۴۶,۵۵,۸۶,۱۱۵,۱۶۴
جنگل کا قانون,۱۳۵
جنگ ۱۹۷۱ء,۷۹
جنوبی وزیرستان,۸۵
جوڈیشری اینڈ ججز(Judiciary and Judges),۱۷۰
جیرالڈ بروک(Gerald Brook),۲۳
جھنگ,۱۰۳
جے یو آئی(جمعیت علمائے اسلام),۱۲۴

چ

چارٹر آف ڈیموکریسی,۱۵۱
چلی(Chile),۵۷,۷۶,۱۱۵,۱۱۸,۱۳۳,۱۸۷

چوہدری شجاعت حسین,۵۴,۱۳۳
چوہدری فضل الٰہی، صدر,۲۹
چیف آف آرمی اسٹاف,۱۴,۴۳,۴۹,۵۳,۵۹,۷۳,۱۰۱,
۱۰۹,۱۱۱,۱۲۸,۱۳۵,۱۳۶
چیف جسٹس، نازی جرمنی,۱۰۵
چیف الیکشن کمشنر,۱۵۶
چیف جسٹس سپریم کورٹ آف پاکستان,۱۶۵,۱۸۴
چیف جسٹس آف ہائی کورٹ,۱۸۴
چیف جسٹس ہدایت اللہ,۳,۲۰,۱۶۹
چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر,۵۵
چیک اینڈ بیلنس,۱۱۶
چیئرمین سینیٹ,۸۳,۸۹
چیئرمین جوائنٹ چیفس آف اسٹاف کمیٹی,۲۰,۷۹,۸۴
چیئرمین سینیٹ کی رولنگ,۵

ح

حاجی سیف اللہ,۱۲
حافظ حسین احمد,۱۳۳
حاکم خان والا مقدمہ ۱۹۹۲ء,۱۶۸
حامد خان,۱۷۰
حدود,۱۳,۳۲,۳۵,۵۵,۶۶,۸۱,۸۳,۸۴,۸۹,۱۰۷,
۱۰۹,۱۲۷,۱۳۷,۱۴۹,۱۵۳,۱۶۰,۱۶۴,۱۶۷,۱۸۰,
۱۸۱
حرام,۵۵,۱۰۵
حزب اختلاف,۱۴,۱۵,۴۷,۴۹,۵۱,۶۱,۶۲,۸۰,۸۸,
۱۲۹,۱۳۰,۱۴۸,۱۷۸,۱۷۹,۱۸۰,۱۸۴,۱۸۵,۱۸۶,
۱۸۷
حزب اقتدار,۴۷
حسین شاہ راشدی,۳۶
حضرتِ آدم علیہ السلام,V
حضرت ابو جندل,۱۰۹
حضرت عمر فاروقؓ,۱۰۰
حضرت محمد ﷺ,V,۱۰۹,۱۵۰
حقیقی وفاق,۱۴۵
حلقہ انتخاب,۷۰
حلال,۵۵,۱۰۵

خ

خاکی شیڈو(Khaki Shadow),۱۱۴
خالد بن ولیدؓ,۱۰۰
خالد رحمٰن,VI,IX
خاندانی منصوبہ بندی,۳۵
خانیوال,۱۰۳
ختم نبوت,۱۵۰
خلافت راشدہ,۱۶۹
خلیفۃ المسلمین,۱۰۰
خواتین کی مخصوص نشستیں,۱۶۵
خواجہ محمد آصف,۱
خود کش بمباری,۱۳۷
خورشید شاہ,۱۷۴
خیبر (آخری بڑا معرکہ),۱۵۳
خیبر پختونخوا,۱۵۳,۱۶۱,۱۶۵ / خیبر درّہ,۱۵۳,۱۵۴

د

دارالامراء (House of Lords),۱۷۱,۱۷۲
دارالامراء کا سپیکر,۱۷۱
دائیں بازو,۶۳
دستور ۱۹۶۲ء,۸۱ / دستور پاکستان,VII / دستور پاکستان
کی اساس,۶۴ / دستور ساز اسمبلی,۴۵ / دستور
سازی کی دستاویزات,۶۰ / دستور سے بغاوت,۹۳,
۱۰۷ / دستور کا ڈھانچہ,۸۱ / دستور کی بالا دستی,

۶۶/ دستور کے بنیادی خدوخال, ۱۶۴/ دستور کے چار بنیادی ستون, ۱۴۹/ دستور کے رہنما اصول, ۷۰/ دستور میں اہم تبدیلیاں, ۱۵۴/ دستور میں ترمیم, ۴۴,۴۵,۴۹,۵۷,۵۹,۹۶,۱۱۲,۱۲۴,۱۴۷, ۱۴۸,۱۵۰,۱۵۴,۱۶۸,۱۶۹,۱۷۵,۱۸۱/ دستور میں صدر کی حیثیت, ۱۰۶

دستوری عہد, ۱۱۰/ دستوری انحراف, ۴۵, ۵۵, ۱۳۱/ دستوری کمیٹی, ۱۶۰/ دستوری نظام, ۹۷,۱۳۷

دفاع وطن, ۱۰۶

دہشت گردی, ۱۱۶,۱۱۷,۱۱۹,۱۲۹,۱۳۷,۱۶۶

دہشت گردی کے خلاف جنگ, VI,۱۱۶,۱۱۹

دور غلامی کے قوانین, ۱۶۱

ڈ

ڈان (Dawn)، روزنامہ, ۱۶۵

ڈائیلاگ آن دی پولیٹکل چیس بورڈ (Dialogue on the Political Chess Board) ۱۰۸,۱۲۱

ڈکٹیٹر, ۴۹,۶۰,۱۵۱

ڈی جی خان, ۱۰۳

ڈیفنس کمیٹی, ۷۷,۹۷,۱۶۵

ڈیلی ٹیلی گراف (Daily Telegraph) لندن, ۲۲

ڈیوس (Davis), ۱۴۲

ذ

ذوالفقار علی بھٹو, ۲۹,۵۴,۱۴۷,۱۴۸,۱۴۹,۱۶۴

ر

راجہ محمد افضل خان, ۱

راولپنڈی, ۱۰۳

رائے عامہ, ۲۲,۱۰۳

رضا بخاری, ۱۷۳

روس (Russia), ۳۷

ریاست کا مذہب, ۱۶۴

ریٹائرمنٹ کی عمر، اعلیٰ عدلیہ کے ججوں کی, ۱۳۴

ریفرنڈم, ۱۱,۴۳,۵۷,۵۸

ز

زر تلافی, ۱۵۸

زر مبادلہ کے ذخائر, ۴۰

زکوٰۃ آرڈیننس, ۱۸

س

سارک ممالک, ۳۸

سپر پاور, ۳۷

سپریم جوڈیشل کونسل, ۱۳۷,۱۶۷

سپریم کورٹ کا فیصلہ, ۳۷

سچائی اور مصالحتی کمیشن, ۱۶۵

سرپلس پول, ۱۶۲

سر چارلس ہوورڈ میکلوین، (Sir Charles Howard Mcllwain), ۸۲

سری لنکا, ۴۰

سرد جنگ, ۲۳

سر ڈھانپنے کا حق, ۳۴

سرگودھا, ۱۰۳

سرمایہ کاروں کا اعتماد, ۲۳

سرمایہ کاری کے لیے ترغیبات, ۵۱

سروسز چیف کی توسیع کا مسئلہ, ۱۶۰

سقوط مشرقی پاکستان, ۵۵,۱۶۴

سماجی انصاف, ۴۰/ سماجی عدل, ۱۶۲/ سماجی معاہدہ, ۱۰۸, ۱۲۱,۱۳۳

سنگین غداری,۵۸,۱۵۵
سود کا مسئلہ,۳۶
سول حکومت, ۶۶, ۱۲۹/ سول سوسائٹی, ۱۴۰, ۱۴۵/
سول نظام, ۶۷, ۷۸, ۷۹, ۸۵, ۱۰۷, ۱۲۹/ سول
مارشل لاء,۱۵۲/ سول ملٹری تعلقات,VIII
سویڈن(Sweden),۴۰
سویلین بالادستی,۶۶/ سویلین صدر,۱۳,۱۴
سی آئی اے,۷۷
سیاسی تنظیم سازی کا حق,۱۵۴
سیاسی عدم استحکام,۱۱۷
سیّد عبداللہ شاہ، وفاقی وزیر,۱
سیّد مظفر حسین شاہ، سندھ کے وزیر اعلیٰ,۱۵
سیکورٹی کا اندرونی خطرہ,۷۹
سیلاب کی تباہ کن صورتحال,۳۰
سینیٹ آف پاکستان,VIII,۴۳,۷۳,۹۹,۱۰۲/ سینیٹ کا
استحقاق,۲
سینٹر فار اسٹریٹجک اینڈ انٹرنیشنل اسٹڈیز (Center for
Strategic and International Studies)
,۸۰
سینیٹر ایس ایم ظفر,۸۷,۱۰۸,۱۰۹,۱۱۰,۱۲۱,۱۲۲,۱۲۳,
۱۲۶,۱۲۸,۱۳۳,۱۶۳
سینیٹر ثناء اللہ بلوچ,۱۰۲
سینیٹر عبدالرحیم مندوخیل,۱
سینیٹر پروفیسر خورشید احمد,VIII,VI,۱,۵,۴۳,۴۹,۶۴,
۷۴, ۹۹, ۱۰۲, ۱۱۹, ۱۳۵, ۱۶۳, ۱۴۷, ۱۶۱, ۱۶۲,
۱۶۵,۱۶۷
سینیٹر حاصل بزنجو,۱۷۳
سینیٹر راجہ ظفر الحق,۱۷۳
سینیٹر رحمٰن ملک,۱۷۳
سینیٹر میاں رضا ربانی,۴۵,۵۵,۷۸,۱۴۸,۱۸۴,۱۸۷
سینیٹر طارق چوہدری,۴
سینیٹر فرحت اللہ بابر,۵۸
سینیٹر مسعود کوثر,۲۷
سینیٹر مشاہد حسین,۱۲۸
سینیٹر مولانا عبدالغفور حیدری,۱۷۳
سینیٹر وسیم سجاد, ۴۵, ۷۴, ۷۵, ۷۶, ۸۱, ۹۰, ۹۳, ۱۲۹,
۱۶۳
سینیٹر یحییٰ بختیار,۲۷

ش

شاہ احمد نورانی، مولانا,۴۵
شخصی آمریت کا قیام,۱۳۷
شریعت اپیلٹ بنچ,۳۶/ شریعت کورٹ,۳۶
شریعت کی بالادستی,۶۵
شری ایم این کول(Shiri M.N. Kaul),۳
شری ایس ایل شکدر(Shiri S.L. Shakdher),۳
شمال مغربی سرحدی علاقے,۱۶۱
شمالی علاقہ جات,۱۶۵
شوکت عزیز، وزیر اعظم,۱۳۷
شہباز شریف,۱۳۰
شیریں مزاری، ڈاکٹر,۳۴

ص

صحافت پر پابندیاں,۱۴۰
صحافت کی آزادی,۱۴۰
صدارتی حکم,۱,۹,۱۰,۱۴,۲۳
صدارتی نظام, ۵۵, ۱۲۰, ۱۵۵, ۱۶۴/ صدارتی نظام کا
ڈھانچہ,۸۱
صدر کی مطلق صوابدید,۱۱,۸۳
صدر، پارلیمانی حکومت کے مشوروں کا پابند,۲۷
صدر، سربراہ مملکت,۱۰/ صدر کا اختیار,۱۰,۸۹/ صدر

کا اختیار مطلق, ۱۱/صدر کا رول, ۱۱۲/صدر کا معافی دینے کا اختیار, ۱۶۰/صدر کا مقام، ۱۹۷۳ء کے دستور میں, ۳۰/صدر کا مواخذہ, ۱۳/صدر کے اختیارات, ۲۷, ۶۰, ۷۳, ۸۱, ۱۵۵/صدر کی حیثیت, ۱۱, ۲۷
صدر کے خطاب پر احتساب, ۳۱/صدر کے خطاب کی دستوری حیثیت, ۲۷, ۲۸/صدر کی خوشنودی, ۱۹, ۲۰, ۲۱/صدر کی ذاتی پسند, ۱۲/صدر مملکت پارلیمنٹ کا حصہ, ۲۷
صوابدیدی اختیار, ۸۱, ۸۲, ۸۳, ۱۰۶, ۱۸۳
صوبائی الیکشن کمیشن, ۱۶۵
صوبائی پبلک سروس کمیشن, ۱۵۷
صوبائی حقوق, ۶۸
صوبائی حکومت, ۱۸, ۱۵۵
صوبائی خود مختاری, ۱۵۶, ۱۵۸, ۱۶۴
صوبہ سرحد کے نام کا مسئلہ, ۱۵۳
صوبوں میں اختیارات کی تقسیم, ۱۶۴

ض

ضیاء الدین (صحافی), ۱۴۱

ط

طارق رحیم والا فیصلہ, ۱۳
طاغوتی طاقتوں, V
طلاق, ۵۸

ظ

ظفر اللہ جمالی, ۵۴, ۱۱۸
ظفر علی شاہ کیس, ۴۴, ۶۷

ع

عارضی آئینی حکم, ۱۳۵, ۱۴۲
عاصمہ جیلانی کیس, ۵۶, ۶۹
عالمی معیشت, ۱۷
عالمی نظریاتی کشمکش, ۳۷
عبوری آئین پر حلف, ۱۷۷/عبوری دستور, ۵۴, ۵۵, ۸۱, ۱۶۴
عدالت عالیہ, ۵۶, ۶۱
عدالت عظمیٰ, ۵۸, ۱۵۵, ۱۷۲
عدالتی کمیشن, ۱۷۱/عدالتی نظائر, ۱۱/عدالتی نظر ثانی, ۶۱
عدلیہ کی آزادی, ۱۶۹/عدلیہ کی تباہی, ۱۴۰
عدم تحفظ کا احساس, ۱۱۸
عدم مساوات, ۴۰
عراق, ۴۷, ۸۶
عصمت دری, ۱۶
علامہ محمد اقبال, ۱۲۲
علماء مشائخ کانفرنس, ۱۰۰
علی احمد کرد, ۱۴۴

غ

غربت, ۴۰, ۱۵۹
غلام محمد, ۵۶
غلام اسحٰق (سابق صدر), ۱, ۱۶, ۲۲, ۲۳

ف

فاروق لغاری، سابق صدر, ۵۹
فاٹا کا مسئلہ, ۱۶۱
فرانس, ۱۰, ۱۲, ۲۸, ۳۴, ۴۰, ۷۶, ۱۲۶, ۱۳۷, ۱۷۱
فرانس کا نظام, ۱۰/فرانس کی مسلمان بچیاں, ۳۴
فرانکوئس متراں (Francois Mitterrand) صدر, ۱۲

فرنٹ لائن اسٹیٹ, ۳۳
فرنٹیئر کرائم ریگولیشنز, ۱۶۱
فسطائیت کا راستہ, ۹۴
فضل الرحمٰن، مولانا, ۱۳۳
فطری انصاف, ۱۰۵
فلاحی معاشرہ, ۱۴۵
فوج کا کردار, ۵۸,۷۴,۷۸,۵۸,۹۲,۱۱۳,۱۲۷,۱۴۴
فوج کی قیادت, ۸۴,۸۶,۱۱۵,۱۲۴
فوجی آپریشن, ۱۳۲,۱۳۷ / فوجی آمریت, ۱۲۰, ۱۶۵ / فوجی انقلاب, ۹۶,۱۶۵ / فوجی ایمپائر, ۸۵
فوجی حکمرانی کے ادوار, VII
فیڈرل بورڈ آف ریونیو, ۱۵۸
فیڈرل کورٹ, ۴۵,۴۶,۵۶
فیصل آباد, ۱۰۳
فیملی پلاننگ, ۳۵

ق

قاضی کا تقرر, ۱۶۹
قانون سازی کا اختیار, ۱۰, ۴۵, ۱۰۴ / قانون سازی کا کراہیت آمیز جزو, ۵۲
قانون کی حکمرانی, ۴۶,۱۳۷,۱۴۳
قانونی برادری, ۱۴۰
قانونی جواز, ۱۰,۴۶,۴۷,۴۹,۵۸,۶۵,۱۰۲,۱۱۳,۱۲۲, ۱۲۹,۱۵۲ / قانونی جواز کے بغیر قابض صدر, ۱۳۱
قانونی مارشل لاء, ۷۸
قاہرہ, ۳۴
قائد حزب اختلاف, ۸۱,۱۶۵,۱۷۵,۱۷۸,۱۸۵,۱۸۷
قبرستان، سپر پاورز کا, ۳۷
قبل از انتخابات دھاندلی, ۱۷۵
قدامت پسند, ۳۳
قرارداد مقاصد, ۶۵
قرآنِ کریم, V
قرآن و سنت, V / قرآن و سنت پر مبنی تعلیمات, ۳۳ / قرآن و سنت کی بالادستی, ۷۱
قریش (مکہ), ۱۰۹
قومی اتفاق رائے, ۱۴۸
قومی اسمبلی کی تحلیل, VIII,۲,۱۲,۱۵۱,۱۷۹
قومی اقتصادی کونسل, ۱۸
قومی جمہوری کمیشن, ۱۶۶
قومی زمینوں کی الاٹمنٹ, ۱۶۶
قومی سلامتی کا مشیر, ۷۷
قومی سلامتی کونسل, VIII,۵۹,۷۳,۷۴,۷۵,۷۶,۷۷, ۸۰,۸۴,۸۶,۸۷,۸۸,۸۹,۹۲,۹۴,۹۵,۹۶,۹۷, ۱۰۹,۱۲۲,۱۳۳,۱۶۵ / قومی سلامتی کونسل کا بل, ۷۳
قومی مالیاتی کمیشن, ۶۱
قومی معاہدہ, ۱۳۱
قیام پاکستان کا مقصد, ۶۴
قیامت, ۱۲۶

ک

کابینہ گورنمنٹ, ۸۳ / کابینہ کی دفاعی کمیٹی, ۷۸
کامران عزیز خان, ۱۳۴
کانگرو کورٹ, ۱۸۴
کراچی, ۳۲,۴۰,۱۳۰
کراچی اسٹاک ایکسچینج, ۴۰
کرپشن کا مسئلہ, ۳۸
کرنسی کی قدر میں کمی, ۳۹
کشمیر کا مسئلہ, ۳۸,۱۶۵
کفر کی نائو, ۱۴۰
بل کلنٹن (Bill Clinton), ۱۷,۱۲۳
کلنک کا ٹیکا, ۶۱

کمان کی یکجائی کی بحث,۱۱۵
کمانڈ اینڈ کنٹرول سسٹم,۱۶۵
کمشنر کے فرائض,۱۸۲
کنٹونمنٹ کے معاملات,۱۶۶
کنگ چارلس(King Charles),۱۴۳
کوڑوں کا استعمال,۳۵

گ

گارجین(Guardian),۲۳
گاڑی چوری,۱۶
گھوسٹ اسکول,۱۳۰
گوجرانوالہ,۱۰۳
گیلپ سروے,۲۲

ل

لارڈ چانسلر(Lord Chancellor),۱۷۱,۱۷۲
لاہور,۱۰۳
لبرل اسلام,۳۳
لبرلز اور فوج کا تعاون,۶۳
لبرل ازم,۳۴
لندن ٹائمز(London Times),۳۴
لنڈسے شیفرڈ(Lindsey Sheppard),۸۰
لوک سبھا,۲۰
لوکل باڈیز آرڈیننس,۱۳۴
لوئیس چہاردہم(Louis XIV)، فرانسیسی بادشاہ,۱۳۷
لیاقت بلوچ,۱۳۳
لیفٹننٹ جنرل حمید گل,۱۳۸,۱۳۹
لیفٹننٹ جنرل علی قلی خان,۱۳۸
لیگل فریم ورک آرڈر,۴۳,۴۴,۵۳

م

مارشل لاء,۴,۱۴,۲۲,۴۳,۴۵,۴۹,۵۰,۵۳,۵۵,۷۹,
۸۵, ۱۲۴, ۱۵۲, ۱۷۳/مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر,
۱۶۴/منی مارشل لاء,۱۳۶
مالیاتی ایوارڈ,۱۶۵
ماورائے آئین احکامات, ۱۴۲/ ماورائے آئین اقدامات,
۱۵۲
متحدہ اپوزیشن,۱۳۸
متفقہ حکومت,۲۴
مجلس شوریٰ,۲,۲۹,۵۸,۱۳۲,۱۵۵
محمد میاں سومرو,۹۰
محمود علی قصوری,۶۰
مخلوق کی اطاعت,۱۰۵
مرکز اور صوبوں کے تعلقات کا تنازعہ,۱۸
مسلح افواج کا کردار,۱۰۶
مسلح افواج کے سربراہان,۴,۷۴,۹۸,۱۳۶,۱۶۵
مسلم لیگ,۱۸,۱۳۳,۱۵۹,۱۶۵
مسلم لیگ(ق),۴۹,۱۳۳
مسلم لیگ(ن),۱۶۵,۱۷۳
مسلمان خواتین,۳۴,۳۶
مسلمان کی تعریف,۱۵۰
مسلمان ممالک,۳۴
مسولینی(Benito Mussolini),۶۰
مشترکہ دفاعی کمیٹی,۷۹
مشترکہ مفادات کونسل,۱۸,۱۶۳,۱۶۴
مشرقی پاکستان,۵۴
مشرقی تہذیب کی علامت,۳۶
مظفر آباد,۱۰۳
معاشی بد حالی, ۱۵۸/معیشت کی ملی جلی حالت, ۳۲/
ملک کی معاشی صورتحال,۳۹
مغرب کا عالمی ایجنڈا,۳۴

مغربی پریس,۱۴۲/ مغربی استعماریت،,۳۴
مغربی پاکستان,۵۵,۱۶۴
مغربی تمدن,۳۴/ مغربی تہذیب کی علامت,۳۶
مقامی حکومتوں کا نظام,۶۶,۶۸
مقننہ,۴۵,۴۶,۸۴,۱۰۴
ملتان,۱۰۳
ملک محمد حیات,۱
منتقلی کمیشن,۱۵۷,۱۵۸
مہنگائی,۱۵۸
مواخذہ,۱۴,۱۲۳/ مواخذے کا خطرہ,۱۴
میاں محمد نواز شریف,۱,۲۲,۲۷,۱۶۵
میثاق جمہوریت,۱۶۵
میڈیا کا اسلامی کردار,۳۲

ن

ناخواندگی کا خاتمہ,۱۵۹
نجکاری,۱۷,۴۰
نجم الدین اربکان، وزیر اعظم,۷۸
نصرت بھٹو کیس,۵۶
نظام عدل,۳۶,۱۶۷
نظریاتی دفاع,۱۲۹
نظریہ ضرورت,۱۲۹,۱۳۰,۱۴۳,۱۶۷,۱۷۷,۱۸۱
نکاح,۵۸
نگراں حکومت, ۱۱, ۲۳, ۲۴, ۱۴۴, ۱۶۶, ۱۷۵, ۱۸۰, ۱۸۳, ۱۸۷, ۱۸۸, ۱۹۰/ نگراں حکومت کا تقرر, ۱۷۸/ نگراں حکومت کا کردار,۲۴
نگران وزیر اعظم,۲۵,۱۷۹
نوائے وقت,۳۲
نور خان,۱۳۹
نیا دستوری ایکٹ,۱۷۱
نیب(NAB),۱۶۵
نیوز لائن,(Newsline)۲۲,۱۱۵
نیویارک,۱۱۷
نیورمبرگ اینڈ ٹوکیو ٹریبونلز (Nuremberg and Tokyo Tribunals),۱۰۵

و

واپڈا,۱۳۰
وانا(وزیرستان),۸۵,۱۳۲
وحی,V
ورلڈ بینک,۳۶
ورلڈ پریس,۱۴۱
ورلڈ واچ,۹۵
وزارت دفاع,۱۶۶
وزارتوں کی صوبوں کو منتقلی,۱۶۲
وزارتی نظام,۶۰
وزیر اعظم پاکستان,۱۱۶
وزیر اعظم کی سفارش,۱۱
وفاق اور صوبوں میں توازن,۱۵۷
وفاقی آئینی عدالت,۱۶۵
وفاقی بجٹ,۱۶۶
وفاقی پبلک سروس کمیشن,۱۵۷
وفاقی فہرست کا حصہ دوم,۱۵۸
ویٹو(Veto),۱۰

ہ

ہارس ٹریڈنگ,۱۶,۱۸
ہالینڈ(Holland),۱۷۱
ہٹلر(Adolf Hitler),۶۰
ہندوستان,۹,۲۱,۹۱,۹۶,۱۶۰
ہندوستانی آئین,۲۰/ ہندوستانی سپریم کورٹ,۳

ہنگامی حالت,۴۴,۱۳۵,۱۳۶,۱۳۸,۱۴۰,۱۴۲,۱۷۷
ہیرالڈ(Herald),۱۱۵

ی

یاک شیراک(Jacques Chirac)،وزیراعظم,۱۲
یکساں تعلیمی نظام,۴۱
یورپ,۳۵,۱۳۸
یورپی یونین,۹۲,۹۵,۹۷,۱۴۱
یورپین کمیونٹی,۹۲
یورپین کونسل,۹۲
یوسف پٹیل کیس,۴۵,۵۶